''چہارسُو''

...... تخلیقی زاویے......

ایک مجاہد، میدانِ کارزار میں معرکہ آراہوکرکامیاب ہوجاتا ہے، تب وہ ''غازی'' کہلاتا ہے، مگر غازی علم الدین، پیدائشی غازی ہیں، بایں ہمہ انہوں نے فقط نام کے ''غازی'' ہونے پر اکتفانہیں کیا بلکہ وہ میدانِ علم وادب میں جہاد کا علم لے کر نکل کھڑے ہوئے اور علم وادب میں منفی روّیوں کے خلاف جہاد جاری رکھے ہوئے ہیں۔اپنے بعض مضامین اور ''الحمرا'' میں وہ اسلام، پاکستان اور اردو زبان کے معترضین کے خلاف، محاذ پر دادِ شجاعت دیتے نظر آتے ہیں۔ان کا دائرہ قلم وقرطاس کہیں زیادہ وسیع ہے۔اس کا اندازہ زیرِ نظر مجموعہ مُضامین سے ہوتا ہے۔

یہ مضامین علم وادب کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہیں، ان میں شعری مجموعوں، تنقیدی کتابوں اور ادبی مجلّوں کا مطالعہ بھی ہے، بعض شخصیات کا تذکرہ ہے۔اسی طرح غازی صاحب نے بعض ادبی مباحث پر بھی قلم اٹھایا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ غازی صاحب ہمہ جہات قسم کے لکھاری ہیں۔وہ شاعری اوراس کی مختلف اصناف کو پرکھ سکتے ہیں۔متن کی صحت اور منسوباتِ شعر کا کھرا کھوٹا الگ کرسکتے ہیں۔لغت اور لسانیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔جو قارئین ان کی سابقہ مطبوعات ''لسانی مطالعے'' اور ''تنقیدی وتجزیاتی زاویے'' دیکھ چکے ہوں، انہیں غازی صاحب کی قابلِ رشک صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

اصلاحِ زبان ان کی کاوشوں کا ایک بڑا موضوع ہے۔زبان کے پست معیار اور الفاظ کے غلط استعمال پر وہ ہمیشہ نقد کرتے ہیں اوراس ضمن میں وہ کسی طرح کا سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں غالباً اس کی وجہ عربی اور فارسی میں ان کی مہارت ہے، اردو کے اُستاد کے لیے یہ ایک اوراضافی خوبی ہے۔عربی زبان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ لفظوں کے استعمال کا جو معیار قائم کرتے ہیں بعض لوگوں کو اس سے اتفاق نہیں ہے، اس کے باوجود ان کی مہارت زبان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔اس مجموعے کا خیر مقدم کرتے ہوئے امید رکھتا ہوں کہ ان کے مضامین کا یہ مجموعہ بھی حسبِ سابق مقبولیت حاصل کرے گا۔

......پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

قیمت:۵۰۰، دستیابی: مثال پبلشرز، فیصل آباد۔

...... ایک بحرسوغزلیں ......

سیفی سرونجی کے نام اور کام سے پوری ادبی دنیا واقف ہے، ان کی لگن اور ان کا جنون بھی مشہور ہے، جب وہ کسی کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان پر جنون کی کیفیت طاری ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جس کام میں لگتے ہیں اُسے مکمل کرکے ہی دم لیتے ہیں۔ایک بحر سو غزلیں، سیفی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال میرے ناقص علم میں تو بحرحال نہیں ہے۔صرف یہی اس مجموعے کی اشاعت کا جواز نہیں بلکہ اس میں بہت اچھی غزلیں بھی موجود ہیں جنہیں منفرد بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان میں خیال بھی ہے اور جدید شاعری کی تمام خوبیاں بھی۔تمام غزلیں (حمد بھی) نہایت آسان الفاظ میں کہی گئی ہیں۔اشعار میں پیچیدگی تو نام کو نہیں ہے، نا خیالات میں اور نہ ہی الفاظ میں۔ان میں ایسے اشعار بھی کافی مقدار میں ہیں، جو جدید شاعری کی صفِ اول میں پورے اعتماد کے ساتھ رکھے جاسکتے ہیں۔ ......محمد متین ندوی

قیمت:۲۰۰ روپے، دستیابی: انتساب پبلی کیشنز، سرونج۔

...... استعارہ ......

موجودہ عہد میں نئے ادبی رسالے کا اجراء کارِ محبت کے سوا کچھ نہیں۔اور جب بہت سے دوستوں اور بزرگ لکھنے والوں کی محبت اور قلمی تعاون بھی میسر ہوتو اسے کرگزرنا چاہیے۔سو''استعارہ'' سہ ماہی ادبی سلسلے کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے ''استعارہ'' کے نام سے اس سے پیشتر صلاح الدین پرویز بھارت سے ایک رسالہ شائع کرتے تھے جو اُن کی وفات کے بعد اشاعت پذیر نہیں ہوا۔''استعارہ'' میں شائع ہونے والی تحریریں صرف اُن کے ادبی وتخلیقی معیار کے پیشِ نظر شامل کیا گیا ہے۔یہ رسالہ تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی تحریریں ارسال کریں۔معیاری تحریروں کو ''استعارہ'' شامل کرکے ہمیں دلی خوشی ہوگی۔ ......ڈاکٹر فردوس انور قاضی

قیمت:۴۰۰ روپے، دستیابی: رانا چیمبرز، پرانی انارکلی، لیک روڈ، لاہور۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۷،شمارہ:جنوری،فروری۲۰۱۸ء

رابطہ:537/D-1 ،گلی نمبر18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:8730633-8730433-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز
مسرور جہاں
کے نام

علم وہنر کا شباب

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام : مسرور جہاں

والد : نصیر حسین خیال (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۸۔جولائی ۱۹۳۸ء (فتح پور)

مصروفیات : افسانہ، ناول نویس

تخلیقات:

افسانوی مجموعہ

۱۔ خواب درخواب سفر (ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) ۲۰۱۶ء

۲۔ ہمیں جینے دو (ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) ۲۰۱۵ء

۳۔ کہاں ہوتم (ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) ۲۰۰۹ء

۴۔ اللہ تیری قدرت (ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) ۲۰۰۶ء

۵۔ کل کی سیتا، آج کی سیتا (ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) ۲۰۰۶ء

۶۔ پل صراط (ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) ۲۰۰۶ء

۷۔ دھوپ دھوپ سایہ (صبوحی پبلی کیشنز، لکھنؤ) ۱۹۷۹ء

۸۔ بڑھاپو کلپٹس (صبوحی پبلی کیشنز، لکھنؤ) ۱۹۸۲ء

۹۔ پرندے کا سفر (صبوحی پبلی کیشنز، لکھنؤ) ۱۹۸۴ء

۱۰۔ تیرے میرے دکھ (صبوحی پبلی کیشنز، لکھنؤ) ۱۹۸۷ء

۱۱۔ چراغ پھولوں کے (کریسنٹ پبلشنگ، علی گڑھ) ۱۹۸۵ء

چنیدہ ناول:

۱۔ نئی بستی (صبوحی پبلی کیشنز، لکھنؤ) ۱۹۸۲ء

۲۔ درد کے الاؤ (صبوحی پبلی کیشنز، لکھنؤ) ۱۹۹۰ء

۳۔ گردشیں (نسیم بک، لکھنؤ) ۱۹۷۰ء

۴۔ دھوپ چھاؤں (ناولستان، مکتبہ جامعہ) ۱۹۷۴ء

۵۔ آواز نہ دو (اہلو والیا بک، دہلی)

۶۔ آشیانہ (اردو پبلشرز، لکھنؤ) ۱۹۸۵ء

۷۔ نئی اُمنگیں (پاکیزہ آنچل، دہلی) ۸۹۔۱۹۸۸ء

۸۔ جینے کے لیے (پاکیزہ آنچل، دہلی) ۹۳۔۱۹۹۲ء

۹۔ سمندر، سیپ اور ساحل۔ ہندی (مہکتا آنچل، دہلی) ۱۹۹۵ء

۱۰۔ راستے اور منزل (بیسویں صدی، دہلی) ۱۹۹۴ء

۱۱۔ میں ساحلوں کی صدا (حنا، لاہور) ۱۹۹۴ء

۱۲۔ روما............۱۹۶۲ء

ادبی اثاثہ:

۱۔ ''ایس زویا حسین عابدی'' اعزازی سند برائے اردو ادب (۲۰۱۶ء)

۲۔ ''وقار اودھ'' ایوارڈ از ''اودھ نامہ'' (۲۰۱۶ء)

۳۔ ایوارڈ از ''ہم فاؤنڈیشن'' برائے اردو ادب

۴۔ اُتر پردیش اکادمی نے ''پرندے کا سفر، تیرے میرے دکھ، نئی بستی، کل کی سیتا آج کی سیتا'' پر ''لائف ٹائم اچیومنٹ'' ایوارڈ اور ایک لاکھ روپے کا نقد انعام پیش کیا۔

۵۔ بہار اردو اکادمی نے مسرور جہاں کے ناول ''نئی بستی'' کو اعزاز سے سرفراز کیا (۱۹۸۹ء)

۶۔ آل انڈیا میرا کادمی نے ''بڑھاپو کلپٹس'' کو اعزاز سے نوازا (۱۹۸۲ء)

۷۔ ''قمر کہکشاں'' ایوارڈ از قمر فاؤنڈیشن، بھارت (۲۰۰۷ء)

۸۔ بھارتیہ فخر سوسائٹی ایوارڈ (۱۹۹۹ء)

۹۔ ''شکاری کی توبہ'' کو بچوں کے لیے لکھے گئے ادبی انتخاب میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے شامل کیا (۲۰۰۲ء)

۱۰۔ افسانہ ''شال فروش'' مہاشٹر کے نصاب میں شامل کیا گیا۔

۱۱۔ ڈاکٹر عبیداللہ چودھری نے ''مسرور جہاں معروف خاتون ناول نگار و کہانی کار'' کے نام سے ''تنقیدی تحریریں'' میں مقالہ تحریر کیا۔ (۲۰۰۶ء)

۱۲۔ ڈاکٹر ایس نگہت سلطانہ عابدی نے ''مسرور جہاں شخصیت اور فن'' پر ڈی لٹ کی ڈگری مقالہ داخل دفتر کیا ہے۔

۱۳۔ یونیورسٹی آف تاجکستان کے وائس چانسلر جناب جاوید خولوف نے ''مسرور جہاں'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ (۲۰۱۲ء)

۱۴۔ مسرور جہاں کے ادب پاروں کو مختلف زبانوں مثلاً کنڑا، تیلگو، تامل، ہندی، پنجابی اور انگلش میں بذریعہ تراجم منتقل کیا گیا ہے۔

۱۵۔ مسرور جہاں کی کہانی ''صلیب پہ ٹنگی زندگی'' کو دوردرشن ٹیلی ویژن نے ڈرامائی شکل میں پیش کیا۔

۱۶۔ وویمن آف دی ائیر (۲۰۱۷ء) از ہندوستان ٹائمز۔

تجربات:

- مظفر علی سید پر بنی ڈاکومنٹری ''اودھ کے وثیقہ دار'' کی تیاری میں حصہ دار رہیں۔
- راجستھان اردو اکادمی (جے پور) کے سیمینار میں شرکت (۱۹۹۰ء)

پتہ:

۹۵/۱۹۵، کراؤن گیٹ، جگت نارائن روڈ، لکھنؤ (یوپی) بھارت۔

ای میل: saira.mujtaba27@gmail.com

افسانہ

خواب درخواب سفر

مسرور جہاں

آگ اورخون کا بحر بیکراں پار کر کے اس کے قدموں نے نرم نرم دھرتی کو چھوا تو ااسے اپنے دل میں ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی اور وہ دیر تک منہ اوندھائے وہیں بے حس وحرکت پڑا رہا۔اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اس کی گدلائی ہوئی آنکھوں کو نم کر دیا۔ پھولوں جیسی معطّر اور شبنم جیسی ٹھنڈی یہ مہک پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ یہ اس کا نیا وطن ہے۔ یہاں کی زمین اور آسمان، چاند اور ستارے، ہرے بھرے کھیت اور سبک خدام ندیاں۔سر بہ فلک پہاڑ اور پھولوں سے بھری وادیاں ، سب اپنی ہیں یہاں کی ہواؤں میں ماں کی لوریوں جیسی شفقت ہے۔اور جھرنوں کے ترنم میں ۔۔۔بہن کی چوڑیوں کی کھنک ہے۔ وہ پیاری پیاری ہستیاں، جنہیں وہ اپنے وطن کی خاطر کھو چکا تھا۔۔۔ یہ خسارہ ایسا نہیں تھا جسے بھلایا جاسکتا اور نہ اس نقصان کی تلافی کی کوئی صورت تھی۔۔۔تاہم وہ زندگی سے ناامید بھی نہیں تھا۔۔۔لیکن وہ اُس گھر جیسا ایک گھر بنا سکتا تھا۔اور اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے خوابوں میں بسنے والے ایک گھر کی تعمیر کرے گا۔۔۔اسے بسائے گا،سجائے گا،سنوارے گا۔

بس بسائے گھر اُجڑ جائیں تو ان کا دوبارہ بسنا آسان نہیں ہوتا۔۔ لیکن جذبے ایمان بن جائیں تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔۔۔اور اس نے بھی ایک گھر بنالیا۔۔۔اسے سجا سنوار کر ایک مکمل گھر کی شکل دے دی۔۔۔ برسوں کی محنت سے پھر کھیتیاں لہلہانے لگیں اور کھلیان اناج سے پَٹ گئے۔گاؤں، چوپال اور چوبارے ، کوٹھے اور بروٹھے آباد ہو گئے۔پنگھٹ پر رنگ برنگے آنچل لہرانے لگے۔گداز کلائیوں میں چوڑیاں کھنکنے لگیں اور اس کی آنکھوں میں نئے خواب ایک بار پھر سج گئے۔

وہ کام سے فرصت پا کر اپنے کھیت کی مینڈھ پر بیٹھا رہتا۔۔۔اور جھومتے لہراتے پودوں کو دیکھ کر خوشی سے اس کا روم روم مسکرا اٹھتا۔۔۔ جب گاؤں کی مسجد سے اذان اور مندر سے گھنٹیوں کی آواز بلند ہوتی تو وہ مضبوط اور پُر اعتماد قدموں سے چل دیتا اور شام اترتے گھر میں داخل ہوتا۔۔۔جس کا کچّا آنگن اور پکّا کوٹھا اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ملتا۔ننّھے منّے ہاتھوں کا لمس اسے دن بھر کی تھکن بھلا دیتا۔۔۔اور میٹھی میٹھی سرسراہٹ اس کی مضبوط چھاتی میں پیار بھری گدگدی بھر دیتی۔۔۔ دھانی کریلیاں اور سنہری بانکیں کھنک کر ساون کی آمد کا پتہ دیتیں۔۔۔اور اس کی آنکھوں میں سلونے مدھر سپنے سج جاتے۔۔۔ یہ خواب ہی تو اس کی عمر بھر کی ریاضت کا ثمر تھے۔۔۔منّی کی ڈولی اٹھنے کا خواب۔۔۔ بیٹے کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کا خواب اور سنہرے روپہلے خوابوں اور خوش رنگ سپنوں کا سلسلہ رات ختم ہونے تک چلتا رہتا۔وہ پہلو بہ پہلو لیٹے آسمان کے جگمگ کرتے تاروں کو نہارتے رہتے۔ان کے دکھ سکھ کی طرح ان کے خواب بھی سانجھے تھے۔۔۔ان کی سانسوں کی ڈور کچھ اس طرح بندھی تھی کہ ان کے بیچ کے سارے فاصلے خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ہر فصل پر منّی کے لیے زیور گڑھواتے ہوئے وہ بڑے پیار سے منّی کو دیکھتا۔۔۔ جو پور پور کر کے اونچی ہوتی جا رہی تھی۔۔۔اور انہیں شہنائی کی مدُھر آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔وہ دن بھی دور نہیں تھا جب ان کی منّی شہانہ جوڑا پہنے۔۔۔ پھولوں کی سجی۔۔۔خوشبوؤں میں بسی ان کی دہلیز پار کر کے اپنے ساجن کے گھر سدھار جائے گی۔۔۔’’ہم تو بابُل تورے آنگن کی چڑیا۔‘‘

’’کاہے کو بیاہی بدیس‘‘۔۔۔اور یہ ’’بدیس‘‘ ایک دن اس کا اپنا گھر بن جائے گا۔۔۔سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔سو وہ بھی منّی کو بیاہ دیں گے۔ان کا بیٹا بھی پرائمری سے جست لگا کر مڈل اسکول میں پہنچ گیا تھا۔۔۔ پھر ہائی اسکول۔ اور وہاں سے شہر کے کالج جاتے ، جاتے وہ پورا جوان ہو جائے گا۔ان کے خوابوں کی تعبیر ملنے میں بس تھوڑا سا وقت باقی تھا۔جب اچانک ایک رات ان کے گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہر طرف آگ تھی،خون تھا۔۔۔اور آہ وبکا تھی۔سورج نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔۔۔کھیت میں تیار کھڑی فصلیں خاک ہو گئی تھیں۔۔۔کھلیانوں میں خاک کے ڈھیر لگے تھے۔۔۔ چوپال ویران تھی۔۔۔کوٹھے اور بروٹھے ویران پڑے تھے۔

اس کے کچّے آنگن میں دھانی کریلیاں اور سنہری بانکیں کرچی۔۔ کرچی ہو کر بکھری پڑی تھیں۔۔۔ وہ سانولی گداز کلائیاں ننگی ہو چکی تھیں۔اور سارے خواب بند پلکوں تلے دم توڑ چکے تھے۔منّی کی تار تار اوڑھنی اس کی گردن میں جھول رہی تھی۔بس وحشت زدہ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔۔۔ بربریت کا ننگا ناچ اس کی آنکھوں کے پیا کے دیس جانے کا سپنا نوچ کر لے گیا تھا۔۔۔اور اس کا بیٹا اپنے ہی خون میں ڈوبا پڑا تھا۔اس کی چڑھتی جوانی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی ڈوب گیا تھا اور اس کے سارے خواب کچّے رنگوں کی مانند ڈُھل کر یہاں وہاں پھیل گئے تھے۔

وہ اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ سارے منظر دیکھ رہا تھا۔اس کے ارمانوں کا نگر اجڑنے میں کتنا کم وقت لگا تھا۔۔۔بستے بساتے تو اس کی عمر کا بڑا حصّہ صرف ہوا تھا۔۔۔لیکن بربادی کا ایک پل۔۔۔ صدیوں پر حاوی ہو گیا تھا۔۔۔ وہ اپنے بے جان قدموں کو گھسیٹتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ چلتے چلتے کئی یگ بیت گئے۔۔۔سورج کتنی بار نکلا۔۔۔اور ڈوبا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔۔۔یاد تھی تو بس اماوس کی وہ کالی رات۔ جب اس کے خواب اس سے چھن گئے تھے۔۔۔اور ایک دن اس کے قدموں نے ایک اجنبی زمین کو چھوا تو وہ چونک پڑا۔ نہ وہ کھیت کھلیان تھے نہ وہ کچّا آنگن تھا۔اس کی زمین اور اس کا آسمان بھی نہیں

تھا۔نہ ہواؤں کی لوریاں تھیں نہ جھرنوں کا ترنم تھا۔۔۔اوپر اجنبی آسمان تھا۔۔۔ اور قدموں تلے نامانوس زمین تھی۔۔۔ہر چہرہ پرایا تھا۔۔۔ہر بولی پرائی تھی۔۔۔ یہ بے حس پتھر چہرے۔۔۔ یہ بے رحم آنکھیں۔۔۔اس کے اپنوں کی تو نہیں تھیں۔زندگی کی تہمت بھی۔۔۔ناقابلِ برداشت تھی۔پھر بھی وہ زندہ تھا۔۔۔ اس کی آتی جاتی سانسیں اسے زندہ رکھے تھیں۔۔۔اور دل دھڑک دھڑک کر جینے کا اعلان کر رہا تھا۔موت اسے چھوئے بغیر ہی آگے بڑھ گئی تھی۔شاید وہ بھی اجنبی بن گئی تھی۔اگر وہی مہربان ہوتی تو وہ صدیوں کی مسافت طے کرنے سے بچ جاتا۔لیکن جب آبلہ پائی مقدر بن جائے تو راستے زنجیر بن کر پاؤں سے لپٹ جاتے ہیں۔ایک زنجیر اسے بھی کشاں کشاں یہاں لے آئی تھی۔

اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں مٹی اٹھالی کہ شاید اس کی سوندھی مہک اسے اپنائیت کا احساس دلا سکے۔کیونکہ مٹی کا رنگ تو ہر جگہ کا ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی اس کے ہاتھوں سے بھربھرا کر پھسل گئی۔وہ خالی ہاتھ رہ گیا اور جب ایک ماں نے بیٹے کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو وہ ''مہاجر'' کہا گیا۔۔۔اس کا دل چاہا کہ چلّا چلّا کر سب کو بتا دے کہ اس نے کیا کچھ نہیں گنوایا ہے اور اس کے صلے میں اسے اتنی گندی اور گھناؤنی گالی سے نوازا گیا ہے۔اس گالی کے تیر اس کے زخمی کلیجے کو چھو گئے۔اس کی روح کو زخمی کر گئے۔لیکن اس کے پاس اب فرصت کے لمحات کم تھے۔۔۔اور کام زیادہ تھا۔۔۔اسے تو نئے سرے سے زندگی شروع کرنا تھی۔۔۔ سانسوں کی ٹوٹی ہوئی ڈور کو جوڑنا تھا اور نئے رشتے استوار کرنا تھے۔۔۔زندگی کی ارزانی اس کی قدر و قیمت گھٹا دیتی ہے۔لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔۔۔ایک بار پھر اس آنکھوں میں کچھ خواب در آئے تھے۔۔۔اور خواہشیں من میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی تھیں۔''وہ'' بھی اس کی طرح مہاجر تھی۔اور اپنے پیچھے سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی۔ شوہر اور بچے۔۔۔ایک بھراپُرا گھر۔۔۔ہنستا کھیلتا خاندان تھا۔۔۔جو خاک وخون میں ہمیشہ کے لیے گم ہو چکا تھا۔۔۔اس نے چاہا کہ اس کا دکھ بانٹ لے۔لیکن جب انہوں نے اپنے اپنے دکھوں کا حساب کیا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔اس کے مقابلے میں تو وہ ایک کمزور ہستی تھی۔۔۔اور دُکھ بے حساب تھے۔۔۔اس کی ننگی کلائی تھام کر وہ اسے بہت پیچھے لے گیا۔۔۔جہاں کچّے آنگن میں دھانی کریلیاں اور سنہری بانکیں کرچی کرچی ہو کر بکھری پڑی تھیں۔منّی کی تار تار اوڑھنی۔انسانی درندوں کی بربریت کی کہانی سنا رہی تھی۔اور اس کا بیٹا بھیگتی مسوں پر موت کا پسینہ اوڑھے سو رہا تھا۔قدم قدم پر انسانی خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور کھیتیاں جھلس کر راکھ ہو گئی تھیں۔ایک قدر مشترک تھی جس نے انہیں ایک ڈور میں باندھ دیا تھا۔۔۔ہر چند سونی کلائیاں چوڑیوں کی کھنک سے بے نیاز تھیں لیکن ان میں ابھی سہارا دینے کا بانکپن زندہ تھا۔وہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک نئے سفر پر نکل پڑا۔۔۔راستے ناہموار تھے۔۔۔جا بجا زبان کی کھائیاں تھیں۔۔۔تہذیب اور اقدار کی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔۔۔اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق آڑے آ رہا تھا۔۔۔پھر بھی اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ایک پڑاؤ کو منزل کا نام دیا۔اور بھُر بھُری۔ریتیلی زمین پر چار دیواریں کھڑی کر کے ان پر چھت ڈال دی۔کمزور بنیادوں پر بنا ہوا یہ مکان ان کے وجود سے آباد ہو گیا۔۔۔اجڑ کر بسنا انسانی فطرت ہے۔وہ ایک تناور درخت تھا۔جس کا اجنبی زمین پر نامانوس آب وہوا میں جڑیں پکڑنا آسان نہیں تھا۔لیکن زمین و آسماں کے بیچ معلّق رہنے سے یہ بہتر تھا کہ وہ ازسرِ نو پنپنے کی کوشش کرے سو اب یہ تناور درخت آہستہ آہستہ جڑیں پکڑتا جا رہا تھا۔اس میں آرزوؤں اور خواہشوں کی نئی نئی کونپلیں آ رہی تھیں اور یقین و اعتماد کے پھول کِھل رہے تھے۔سونی کلائیوں میں دھانی کریلیاں اور سنہری بانکیں کھنکنے لگی تھیں۔۔۔اور دھنک رنگ خوابوں سے شبستان سج گئے تھے۔۔۔منّی اور منّا دوبارہ جنم لے چکے تھے۔اور ان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ خوابوں کے رنگ بھی پکّے ہوتے جا رہے تھے۔اب وہ کچّے رنگوں سے دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے۔تجربے کی آنچ میں پک کر اور حالات کی بھٹّی میں تپ کر ان کا کمزور وجود فولاد کی مانند مضبوط ہو گیا تھا۔اور سرد و گرم جھیلنے کی طاقت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی تھی۔جس دن منّی دلہن بن کر بابُل کے آنگن سے رخصت ہو کر ''پیا'' کے گھر سدھاری اس دن انہیں اپنے خوابوں کی پہلی تعبیر مل گئی۔

منّا بھی اب کالج کا طالب علم تھا۔اس کے مضبوط اور توانا بازو تیز و تند ہواؤں کا رخ موڑنے کی قوّت رکھتے تھے اور اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ شکست کھانے کے لیے نہیں شکست دینے کے لیے پیدا ہوا ہے۔اس کی چوڑی چھاتی میں نہ جانے کتنے آتش فشاں پوشیدہ تھے۔۔۔جو کسی وقت بھی لاوا اگل سکتے تھے۔۔۔وہ اسے نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔۔۔کہ کہیں ان کے خوبرو اور جوان بیٹے کو ان کی نظر نہ لگ جائے۔وہ ان کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر تھا۔اور وہ اسے کسی قیمتی اثاثے کی طرح سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے۔۔۔اور ایک دن اچانک انہیں اس کے ہاتھوں میں کلاشنکوف نظر آ گیا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔اور انہیں اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک کے بجائے موت کے سائے رقصاں نظر آ رہے تھے۔ان کے جوان اور خوبرو بیٹے کے ہاتھ میں کلاشنکوف کس نے تھما دیا تھا۔کیا اس کے ذمے دار وہ لوگ تھے جنہوں نے نئی نسل کو للکارا تھا اور انہیں ''مہاجر'' کہہ کر ذلیل کیا تھا؟۔۔۔یا پھر وہ لوگ جنہوں نے پرانی نسل کو غدّار کہہ کر سرحد کے اس پار دھکیل دیا تھا۔ان کا قصور تو بس اتنا تھا کہ وہ بار بار ہجرت کا عذاب سہنے پر مجبور کیے گئے تھے۔لیکن یہ کلاشنکوف تو ان کے مسائل کا حل نہیں ہو سکتا؟ وہ اپنے بیٹے کو بھی بار بار یہی بات سمجھاتے تھے۔۔۔ لیکن اس کی رگوں میں تو خون کے بجائے گرم گرم لاوا بہہ رہا تھا۔۔۔وہ ان کی کوئی تاویل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔۔۔اسے اپنے شناخت پر اصرار تھا۔وہ اس مٹّی کو اپنی پہچان ماننے پر مُصر تھا۔۔۔باپ کے کھیتوں اور کھلیانوں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔۔۔وہ اس مٹّی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے بھی ناواقف تھا۔ ان ہواؤں، پہاڑوں اور جھرنوں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔کوئی تعلق نہیں تھا۔۔۔اس کا خمیر تو اسی مٹی سے اٹھا تھا۔۔۔اور اسی میں مل کر فنا ہونا تھا۔۔۔سو وہ سچ مچ فنا ہو کر اپنی بات کو صحیح ثابت کر گیا۔

باقی صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

لکھنؤ کی سرزمین گذشتہ کئی صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ خدائے سخن میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ سے لے کر میر تقی میرؔ کے علاوہ ایک طویل کہکشاں اردو ادب کے آسمان پر جگمگا رہی ہے اور تا ابد جگمگاتی رہے گی۔

محترمہ مسرور جہاں اسی کہکشاں کی ایک تابدار کرن ہیں جنہوں نے اپنے زرخیز قلم سے اردو ادب کو ساٹھ سے اوپر ناول اور ایک درجن کے قریب افسانوی مجموعے تخلیق کر کے اردو کے ذخیرۂ ادب کو وقار بھی بخشا ہے اور اعتبار بھی۔

آج کی انجمن محترمہ مسرور جہاں کے اعزاز میں آراستہ کی گئی ہے۔ آپ کی شمولیت اس کی رونق بلکہ زینت میں اضافہ بن کر ایک اور اعزاز کو ہمارے نام منسوب کر رہی ہے۔

ہمیں فخر ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اردو زبان وادب کی جو روایت کچھ عرصہ ایک دوسرے سے پیوست رہنے کے بعد اجنبیت کے دور میں داخل ہونے سے پیشتر یہ سلسلہ بذریعہ چہارسو وہیں سے جڑ گیا ہے جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ یقیناً یہ ہمارے اور اردو زبان وادب کے لیے نیک فال ہے جسے آپ کے تعاون سے جاری رکھنا ہماری اور ہمارے احباب کی خواہش بھی ہے اور کوشش بھی۔

گلزار جاوید

☆ یہ امر تو طے ہے کہ آپ کو علمی ادبی ذوق وراثت میں ملا اس کے باوجود شاعری سے آپ کا نباہ نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ میں اپنے خاندان کی پہلی اور شاید آخری افسانہ وناول نگار خاتون ہوں۔ میرا رجحان شاعری کی طرف کبھی نہیں رہا۔ جبکہ میرے والد اور بالخصوص دادا نامی گرامی شاعر تھے۔ میرا بھائی وقارؔ ناصری سلمہٗ بھی کامیاب شاعر ہے۔

☆ خوشحال گھرانے کی قلمکار درمیانہ درجہ کی کہانیاں کیوں کر لکھتی ہے اور لکھتی ہے تو اس کا ماخذ کیا ہے؟

☆☆ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت سے گھروں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ میرے گھر کا حال بھی کم وبیش یہی رہا ہے۔ میرے دادا پروفیسر شیخ مہدی حسین ناصریؔ الہ آباد یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر (عربی وفارسی) تھے۔ اور سات زبانوں کے عالم تھے۔ وہ ایک دولت مند انسان تھے۔ کئی باغات، زمینیں اور مکانات ان کی ملکیت تھے۔ لیکن بہت جلد ان کا انتقال ہو گیا اور ہمارے گھر کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ رہی سہی کسر خاتمہ زمینداری نے پوری کر دی۔ مجبوراً میرے والد جناب نصیر حسین خیالؔ مرحوم کو مدرس کی معمولی ملازمت کرنا پڑی ہم دس بہن بھائی تھے۔ سب کی پرورش اور تعلیم کے اخراجات نے ہمارے حالات ویسے نہ رہنے دئے جو دادا مرحوم کے زمانے میں تھے۔ ہمارے اطراف و اکناف میں بھی ہمارے جیسے لوگ ہی بستے تھے۔ درمیانہ درجے کی زندگی گزارنے والے ہی اپنوں کا دکھ درد محسوس کر سکتے ہیں۔

☆ آپ نے جب قلم اٹھایا اُس وقت اردو ادب کے اُفق پر بہت بڑے نام جگمگا رہے تھے آپ کو کن سے تحریک ملی اور کون آپ کے رول ماڈل بنے؟

☆☆ اس وقت ہماری رسائی منشی فیاض علی، اے۔ آر۔ خاتون وغیرہ تک ہی تھی۔ اس لیے کسی سے تحریک ملنے کا یا کسی کو رول ماڈل بنانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

☆ آپ کے ہاں جس شدت سے روایت پسندی کا ذکر کیا جاتا ہے اُس کی روشنی میں آپ کا فن ایک طرح سے جامد نہیں ہو جاتا؟

☆☆ روایت پسندی تو ہمارے خمیر میں شامل ہے کیونکہ روایت ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ انہیں روایتوں نے ہمیں قلم پکڑنا سکھایا۔ نئی راہوں کی نشان دہی کی۔ اور انہیں روایتوں کی روشنی میں ہمارا قلمی سفر جاری رہا۔ روایتوں سے انحراف دراصل سچائی سے انحراف کرنے کے مترادف ہے۔

☆ جو لوگ آپ کے مرکزی کرداروں کو صنف نازک تک محدود کرتے ہیں وہ آپ کے امکانات کو بھی محدود کر رہے ہیں؟

☆☆ مرد ادیب خواتین کے مسائل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی نظر میں عورت تفریحِ طبع کا ذریعہ ہے۔ یا پھر کہانی کا کوئی گوشہ پر کرنے کے لیے ایک ضمنی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم اپنی صنف کے مسائل سے چشم پوشی کریں گے تو کیا یہ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ عورت ہی عورت کے مسائل سمجھ سکتی ہے۔ اکثر مرد حضرات عورت کو گھر میں رکھ کر بھول جاتے ہیں کہ اس کے بھی کچھ جذبات اور احساسات ہیں۔

☆ اور جو یہ کہتے ہیں کہ کہانی کی ابتدا عورت ذات سے ہوئی تو کیا دنیا کی نصف آبادی کے کوئی مسائل نہ تھے؟

☆☆ خدا جانے یہ بات کس نے کہی؟ پریم چند سے لے کر انتظار حسین تک، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور اور بانو قدسیہ تک سب نے مرد حضرات کے مسائل کو اپنی تحریروں میں نمایاں جگہ دی ہے۔ ادباء کی ایک طویل فہرست ہے جن کی تحریروں کی اساس مرد پر ہے۔

☆ واجدہ تبسم کی بولڈ کہانیوں میں اُن کے تجربات بولتے ہیں آپ کس برتتے پرمحلوں، حویلیوں، نوابوں، بیگمات، خدمت گاروں کے علاوہ بٹیر بازی، رنڈی بازی، بالے خانے، محل سرائیں، غلام گردشیں، فیل خانے اور رؤسا کے عشرت کدوں کا احوال تحریر کرتی ہیں؟

☆☆ لکھنؤ نوابوں کا شہر ہے اس حقیقت سے ایک زمانہ واقف ہے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو نوابین اور رؤسا کے دھندلے ہوتے ہوئے نقوش تھے۔ پرانے محلات اور کہنہ حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ اپنی میراث کے امین تھے۔ میرے شوہر نواب سید محمد مرتضیٰ علی خاں مرحوم نواب آغا میر بہادر کے پڑپوتے تھے جو کہ شاہانِ اودھ کے وزیر خاص تھے۔ جن کے نام سے موسوم ڈیوڑھیاں۔ محلات، محلے اور حد ہے کہ اسٹیشن تک موجود ہے۔ جس محلے میں میرا گھر ہے اس کا نام ہی شیش محل ہے۔ جہاں نوابین کے محلات آج بھی موجود ہیں۔ وہ پہلے جیسا کروفر نہ سہی لیکن آثار باقی ہیں۔ نوابین اور رؤسا کے پس منظر میں جو کہانیاں میں نے لکھیں وہ میرے تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہیں۔ واجدہ تبسم کا اپنا تجربہ و مشاہدہ چاہے جو رہا ہو میں اس کے متعلق نہیں جانتی تو اس کے بارے میں کیا کہوں۔ میرے افسانوں میں جو محل سراؤں کی زندگی ہے وہ میری دیکھی ہوئی ہے اس لیے میں نے اسے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆ غریبوں، مزدوروں، کسانوں کا مشاہدہ بھی آپ کی کہانیوں میں بلا کا ہے۔ اس کے پیچھے کی کہانی سے پردہ اُٹھانا بھی ضروری ہے؟

☆☆ امیر و غریب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کی پہچان دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ دو مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے کے باوجود انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ عمارت امیر بنواتا ہے، بنانے والے مزدور ہوتے ہیں۔ فارم ہاؤس، کھیت اور باغات میں پسینہ بہانے والا بھی مزدور ہی ہوتا ہے۔ میرا تعلق بھی چونکہ زمیندارانہ خاندان سے ہے اس لیے کسانوں اور مزدوروں کے مسائل سے میں بھی واقف ہوں۔

☆ کوڑھ کا مرض اور مریض آپ کی توجہ کا مرکز کب بنے۔ آپ نے اُن کی نسبت کہانیاں لکھنے کے علاوہ عملی طور پر کیا خدمات انجام دیں؟

☆☆ جہاں تک کوڑھ کے مرض اور مریضوں کا تعلق ہے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہر عورت ''مدر ٹریسا'' نہیں بن سکتی۔ جہاں تک کہانی کا تعلق ہے تو ہر حساس ادیب ایسے قابلِ رحم مریضوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ میں بھی نہیں کرسکتی۔ میں کہانی کار ہوں ان کی کہانی ہی لکھ سکتی ہوں۔

☆ نسلی تصادم اور فسادات بھی آپ کی تحریروں کا عنوان رہے ہیں۔ کون سے تصادم اور فسادات آپ کے مشاہدے میں آئے؟

☆☆ نسلی تصادم اور فسادات کے بارے میں یہ ہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ ہمارا موضوع ضرور بنتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان کے مشاہدے میں ہر چیز آئے۔ یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے اور تخلیق کار کا ان سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔

☆ آپ کے ہاں پدری سماج کے خلاف دبی زبان میں احتجاج نظر آتا ہے۔ آپ سے قبل جن لوگوں نے اونچی آواز میں اس حوالے سے احتجاج کیا اُس کا نتیجہ کیا نکلا؟

☆☆ پدری سماج کل تک ایک آہنی قلعہ تھا جس کے عقب سے اٹھنے والی آوازیں کمزور ہوتی تھیں اور انہیں سختی سے دبا دیا جاتا تھا۔ بلا کا حبس تھا، غضب کی گھٹن تھی لیکن اب ان آہنی دیواروں میں شگاف، کھڑکیاں، روزن اور جھروکے نظر آنے لگے ہیں۔ حبس معدوم ہو چکا ہے۔ گھٹن دم توڑ چکی ہے۔ احتجاج کی پرزور آوازوں نے ایک صحت مند سماج کی تشکیل میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

☆ عمر رسیدہ لوگوں نے آپ کی توجہ کب اور کیونکر حاصل کی۔ قلمی کاوشات کے علاوہ عملی طور پر اس حوالے سے آپ کی کوئی خدمت؟

☆☆ عمر رسیدہ لوگوں کا مسئلہ بین الاقوامی ہے جس کے نتیجے میں ''اولڈ ایج ہوم'' وجود میں آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں ابھی نوبت تو نہیں آئی ہے۔ کیونکہ قانون عمر رسیدہ لوگوں کو ان کے حقوق دلوانے میں فعال ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں حالات ان کے خلاف بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں اور زیادتی کرنے والوں کو سماج لعنت ملامت کرتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر مسئلہ کا حل ادیب کے پاس نہیں ہوتا۔ ادیب کا کام ہے دکھتی رگ پر انگلی رکھنا اور لوگوں کو اس خرابی بلکہ ظلم کی طرف متوجہ کرنا۔ میں نے بھی یہی کیا ہے۔

☆ کنکریٹ کے جنگل میں حویلی کی تلاش کا مقصد و منشا کیا ہے۔ چلیئے آپ کی تلاش کامگار ٹھہر بھی جائے تو تن تنہا حویلی گھنے جنگل کا مقابلہ کیونکر کر پائے گی؟

☆☆ مقابلے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا مقصد حویلی کے وجود کی نشان دہی کرنا ہے۔ یہ کنکریٹ کا جنگل ابھی اتنا گھنا نہیں ہوا ہے لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ پرانی، موروثی اور یادگار عمارتیں اپنا وجود کھو دیں گی۔

☆ عہدِ زوال سے مراد کونسا وقت، حالات اور اقوام ہیں؟

☆☆ کیا ہمارا زوال پذیر معاشرہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ ہماری پرانی تہذیب، رسم و رواج، زبان، رہن سہن، اقدار، حد ہے کہ امکانات تک معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم مڑ کر پچاس ساٹھ سال پہلے کے دور پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ فرق نمایاں طور پر نظر آئے گا۔

☆ ترقی یافتہ معاشرت واضح خدوخال رکھتی ہے جبکہ ہمارے یہاں زندگی کے بارے کوئی واضح نظریہ یا تصور وجود نہ پاسکا ہے آپ کے افسانوں میں کس زندگی کی تلاش ہے؟

☆☆ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کس ترقی یافتہ معاشرت کی بات کر رہے ہیں جبکہ آپ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ یا تصور وجود نہیں پاسکا ہے۔ اور یہی تلخ سچائی ہے۔ میرے افسانوں کو ایک ایسی زندگی کی تلاش ہے جہاں مرد و زن کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ ایک دوسرے کے لیے

عزت واحترام کا جذبہ زندگیوں میں رواج پائے۔حق تلفی، نابرابری، صنفی تفریق عام نہ ہو۔جیو اور جینے دو کا مقولہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا کہ صحت مند معاشرہ وجود میں آئے اور باعزت زندگی ہر انسان کا مقسوم ہو۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ کی تحریروں میں مقصد کی کارفرمائی بہت نمایاں ہوا کرتی ہے۔اپنے مقصد سے آپ ہی باخبر کر سکتی ہیں اور اُس میں کامیابی کا تناسب بھی آپ ہی بتلا سکتی ہیں؟

☆☆ اگر ہماری تحریریں بامقصد نہ ہوں تو ہمارا قلم اٹھانا ہی بیکار ہے۔بے مقصد تحریریں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے بغیر روح کا جسم اور بے روح کا جسم کسی کام کا نہیں ہوتا۔

☆ ہندوستان جیسے کثیر المعاشرتی ماحول میں آپ کے کردار مسلم اور خاص فرقے سے ہی کیوں ہوا کرتے ہیں؟

☆☆ جن لوگوں سے ہماری زیادہ قربت ہوتی ہے ہم ان کے متعلق زیادہ ایمانداری سے لکھ سکتے ہیں۔

☆ جو لوگ آپ کی تخلیقات پر عینیت پسندی کا لیبل لگاتے ہیں اُن کے لیے آپ کے پاس یقیناً ٹھوس جواب ہونا چاہیے؟

☆☆ دراصل ہر کہانی کسی نہ کسی کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔اگر اس میں کسی قاری کو اپنا چہرہ نظر آتا ہے تو میرے اوپر عینیت پسندی کا لیبل لگانا حقیقت سے منہ چھپانے کے مترادف ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کو زود نویس بھی گردانتے ہیں۔ثبوت کے طور پر پینسٹھ ناول اور پانچ صد افسانے پیش کرتے ہیں؟

☆☆ لوگوں نے تو کرشن چندر پر بھی زود نویسی کا الزام لگایا ہے۔ابن صفی مرحوم کو آپ کیا کہیں گے۔ایک مزے کی بات اور بتاؤں پاکستان میں مجھے ہندوستانی ناول نگار کہہ کر میرے نام سے درجنوں ناول شائع کر ڈالے۔ہمارا ملک بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہا۔یہاں مجھے پاکستانی رائٹر کہہ کر میرے نام سے جعلی ناول شائع کیے گئے اور افسوس میں تردید کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

☆ آپ کا فرمان ہے کہ آپ عام آدمی کے لیے لکھتی ہیں۔عام آدمی میں کتاب کا چلن نہ ہے اگر ہے تو سمجھ بوجھ اور وقت کا مسئلہ بھی ہے اب تو پڑھے لکھے لوگ بھی کتاب کلچر سے دور ہو گئے ہیں؟

☆☆ اگر کتاب کلچر ختم ہو گیا ہوتا تو ہمارے دانشوروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور شاعروں کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔ان صاحبان قلم کی نگارشات اس بات کا ثبوت ہیں کہ کتاب کلچر نہ ختم ہوا ہے نہ کبھی ختم ہوگا۔اس کا ایک ثبوت رسائل وجرائد بھی ہیں۔جو دونوں ممالک سے بڑے طمطراق سے شائع ہو رہے ہیں۔اس کی ادنیٰ مثال تو ''چہارسُو'' ہی ہے۔

☆ یہ ٹریڈ مارک نہ بننے کا اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ میرے افسانے مختلف موضوعات پر ہیں۔افسانوں کا تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے اوپر ''ٹریڈ مارک'' کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔

☆ اگر ہم اس تاثر سے اتفاق کر لیں کہ آپ کے ہاں تنقیدی بصیرت کا استعمال ہوا ہے تو اُس کی نشان دہی اور ماخذ بتلانا تو آپ کی ذمہ داری ہے؟

☆☆ تنقیدی بصیرت کے لیے کسی ماخذ کی ضرورت نہیں یہ تو زندگی کے ساتھ ہے۔انسان اور اس کی زندگی سے بڑھ کر تنقیدی بصیرت کا ماخذ اور کون ہو سکتا ہے۔

☆ اس کے بعد یہ سوال لازم ہے کہ آپ کے ہاں کون سی تنقید اور تنقیدی رویے پسندیدہ رہے ہیں؟

☆☆ میرے لیے ہر وہ رویہ پسندیدہ ہے جو مثبت ہو۔ادب کے تنقیدی رویّوں سے میں واقف نہیں لیکن زندگی اور اس کے رویّوں سے ضرور واقف ہوں۔

☆ اگلا سوال بھی اسی سے جڑا ہوا ہے کہ آپ کی شخصیت اور فن کی نسبت ناقدین کا رویہ آپ کی توقع کی نسبت کس نوعیت کا رہا ہے؟

☆☆ میں نے کبھی ناقدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش نہیں کی۔میرا شوق لکھنا تھا سو میں لکھتی رہی۔ستائش اور صلے کی تمنا کے بغیر میرا قلم رواں دواں رہا۔

☆ آپ کی کہانیوں میں عشقیہ کرداروں پر، بہت سے لوگوں کو حقیقت کا گمان کیوں ہوتا ہے؟

☆☆ یہ میری تعریف ہے یا شکایت۔

☆ آپ کی نگارشات میں کرشن چندر کی رومانی اور حقیقی واردات تلاشنے والے آپ کو رعایتی نمبر نہیں دے رہے؟

☆☆ اچھا کر رہے ہیں۔میں خود بھی رعایتی نمبروں سے پاس نہیں ہونا چاہتی۔

☆ آپ کے افسانے ''کُنجی'' کو عصمت چغتائی کے افسانے ''لحاف'' کی نقالی گردانے والے بھی کم نہیں؟

☆☆ عصمت چغتائی کے لحاف میں پہلا نمایاں فرق تو یہ ہے کہ پوری کہانی سنے سنائے قصے کہانیوں پر مبنی ہے حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کہانی نے خوب خوب تہلکہ مچایا۔عدالت میں بھی گھسیٹی گئی۔جبکہ ''کنجی'' ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔کنجی کو ذاتی طور سے جاننے والے ابھی زندہ ہیں لیکن اس کہانی کا روپ دیتے وقت میرے ذہن میں دور دور تک لحاف کی ''بیگم جان'' نہیں تھیں۔

☆ اس رائے کی نسبت بھی روشنی ڈالئے چند ایک کو چھوڑ کر اکثر خواتین قلمکار سنی سنائی باتوں سے کہانی بنتی ہیں؟

☆☆ کیا آپ اس بات کی تعریف نہیں کریں گے کہ حجاب امتیاز علی کی کہانیاں تخیل کے ایک نئے جہان سے ہمیں متعارف کراتی ہیں اور ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔اگر خواتین قلمکار جنہیں آپ نے ''کچھ'' کی رعایت دی

ہے اگر سنی سنائی باتوں پر اپنی کہانی کی بنیاد رکھتی ہیں تو یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ہمیں تو بس یہ دیکھنا ہے کہ کہانیاں کتنی کامیاب ہیں۔ویسے بہت سی کہانیاں ایسی بھی ہیں جو حقیقت رکھتی ہیں۔

☆ ''دھوپ دھوپ سایہ'' اس کی مثال ہے جس میں بہت سے لوگوں نے زبان و بیان میں اغلاط کی نشان دہی کی ہے؟

☆☆ کہانی کے مرکزی کردار غلام محمد بٹ کا دو سال قبل کشمیر میں انتقال ہوا ہے۔''دھوپ دھوپ سایہ'' غلام محمد بٹ مرحوم کے خاندان میں ایک قیمتی دستاویز کی طرح محفوظ ہے۔دھوپ دھوپ سایہ مہاراشٹر گورنمنٹ کے اسکول کے نصاب میں ''شال فروش'' کے عنوان سے آٹھویں کلاس کی کتاب (بال بھارتی) اردو میں شامل ہے۔کسی اسکول کی نصابی کتابیں مرتب کرنے کے لیے دانشوروں کا ایک بورڈ مضامین کا انتخاب کرتا ہے۔اب اگر میری کہانی میں زبان و بیان کی اغلاط ہوتیں تو بورڈ ہرگز یہ کہانی منتخب نہیں کرتا۔نصابی کتابیں بڑے غور و خوض کے بعد مرتب کی جاتی ہیں۔کہانی کے آخر میں ایک جملہ بطور خاص چھپا ہے۔

☆ جب آپ نے لکھنا شروع کیا اُس وقت برصغیر کی تقسیم کے باوجود دونوں ملکوں میں تعلقات معمول کے تھے۔وقت گزرنے کے ساتھ جنگ و جدل، نفرت اور تعصب نے اہل قلم بلخصوص اردو والوں کی نفسیات پر کس طرح کے تازیانے برسائے؟

☆☆ برائے مہربانی ادب کو سیاست سے الگ رکھیے۔

☆ اکثر لکھنے والے اپنے نام کے ساتھ لفظ دانشور لگوانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے جبکہ آپ دانشوری کو عذاب گردانتی ہیں؟

☆☆ لفظ دانشور اپنے آپ میں اتنا معتبر اور بھاری بھرکم ہے کہ میں اس لفظ کے آس پاس بھی نظر نہیں آتی۔جتن کرنا تو دور رہا۔

☆ آپ کے بارے Mother Writer کا تصور کب اور کس بنیاد پر قائم ہوا اور اعزاز کے بعد آپ کے تخلیقی کام میں کس طرح کی تبدیلی آئی؟

☆☆ اس سوال کا جواب تو وہی صاحبان دے سکتے ہیں جنہوں نے مجھے اس اعزاز سے نوازا ہے۔مجھ میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی میں سماج کے بدلتے ہوئے تناظر سے کہانیاں بنتی ہوں۔

☆ روس کے علاوہ اندرون اور بیرون ملک آپ کی شخصیت و فن پر تحقیقی کام کی تفصیل میں ہمارے قارئین کو شریک کیجیے؟

☆☆ تاجکستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب جاوید خولوف نے تاجک زبان میں میرے افسانوں پر پی۔ایچ۔ڈی کی ہے بعد ازاں ان کا یہ مقالہ روسی زبان میں بھی شائع ہوا۔اس کے علاوہ ''اردو زبان کی تاریخ'' اور افسانوں پر بھی جاوید خولوف کی دو کتابیں تاجک زبان میں شائع ہو چکی ہیں جس میں کئی افسانہ نگاروں کے ساتھ میری کہانیوں پر بھی ان کے مضامین شامل ہیں۔اندرون ملک کانپور کی نگہت سلطانہ عابدی صاحبہ نے ڈی۔لٹ کے لیے اپنا مقالہ بہ عنوان ''مسرور جہاں شخصیت اور فن'' سپرد قلم کیا ہے۔اور انہیں ڈی۔لٹ کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں کے اسکالرز نے افسانے اور ناول پر جو مقالے تحریر کیے ہیں ان میں بھی میرے فن پر مضامین شامل ہیں۔اس کے علاوہ انگریزی، ہندی، پنجابی، تامل، تیلگو، کنٹر اور بریل میں میری متعدد کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔انگریزی میں افسانوں کا مجموعہ جلد آنے والا ہے۔

☆ ادبی تقاریب میں شرکت سے گریز بھی ایک معمہ ہے جسے آپ ہی حل کر سکتی ہیں؟

☆☆ ابتدائی دور میں تقاریب میں شرکت نہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت میں پردہ کرتی تھی۔اس کے بعد تو اپنے شہر کے علاوہ بیرون شہر بھی میں نے ادبی تقاریب میں شرکت کی۔آج بھی کرتی ہوں۔

☆ آپ کے دور میں ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق طرز کی کئی تحاریک بڑے ناموں کے ساتھ فعال بھی تھیں اور اپنا نظریہ شد و مد سے عام کرنے میں مصروف بھی۔آپ نے کبھی کسی تحریک کو لائق توجہ کیوں نہیں گردانا؟

☆☆ کسی تحریک میں حصہ لینا میری افتاد طبع کے خلاف تھا۔ایسا بھی نہیں تھا کہ میں ان تحاریک کے خلاف تھی۔ہر تحریک کسی نہ کسی نیک مقصد کے لیے کام کرتی ہے۔میری بدقسمتی ہے کہ میں ان کا حصہ نہ بن سکی۔

☆ اپنی ذات اور فن کی نسبت سیکولر مزاج کی وضاحت فرما دیجیے؟

☆☆ میں انتہا پسند نہیں ہوں۔شاید سیکولر مزاج اسی کو کہتے ہیں۔

☆ بھارت کے موجودہ سیاسی، سماجی اور مذہبی منظر نامے کو دیکھتے ہوئے اردو زبان، ادب اور ادیب کا مستقبل کیسا دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ روشن۔

☆ مودی حکومت کے کچھ متنازعہ اقدامات نے مسلمانوں میں بے چینی کی جو کیفیت پیدا کر دی ہے اُس کے ردعمل میں بھارت ورش کے مستقبل کو کیسا دیکھ رہی ہیں؟

☆☆ میں ادب کو سیاست سے الگ رکھنے میں یقین رکھتی ہوں اس لیے یہ سوال میرے لیے بے معنی ہے۔

☆ ایک الزام اکثریت کی جانب سے مسلم قوم پر یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ مسلمان قوم بھارت کی وفادار ہونے کے بجائے سعودی عرب، ترکی، ایران، پاکستان کے بارے زیادہ نرم گوشہ رکھتے ہیں؟

☆☆ میں یہ بات پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ہندوستانی مسلمان صرف اور صرف سچا ہندوستانی ہے اور اپنے ملک کا وفادار ہے۔

☆ بات اتنی سادہ ہوتی تو جناب راحت اندوری کو یہ نہ کہنا پڑتا:

؎ یہ پانچ وقت کے لاکھوں کروڑوں مسلمان دہشت گرد بن جائیں تو؟

☆☆ راحت اندوری نے جو کچھ کہا ہے وہ راحت اندوری جانیں۔

مسرور جہاں کی کہانی

رتن سنگھ
(نوئیڈا، بھارت)

یہ تو پڑھا تھا کہ خوبصورتی کا دوسرا نام خدا ہے اور خدا کی کائنات اس لیے خوبصورت ہے کیونکہ بقول سنت کبیر ''ایک نور تے سب جگ اُجیارا'' یعنی خدا کے نور سے ساری دنیا پیدا ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اسے خوبصورت ہونا ہی تھا۔

یہ بھی پڑھا تھا کہ خوبصورتی، خوبصورتی کو جنم دیتی ہے۔ سُقراط نے اپنی بیوی سے کہا تھا ''بھلی لوگ۔۔۔ ساری دنیا خوبصورت ہو جائے گی تو اس میں میرا گھر بھی خوبصورت ہو جائے گا۔ ''خود بخود''۔۔۔

اسی اٹل سچائی کی عملی صورت ''مسرور جہاں کی ایک کہانی میں دیکھنے کو ملی۔ یہ کہانی لکھنؤ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس میں قاری اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کس طرح مثالی حسن، کسی کے اندر سوئے ہوئے جذبوں کو جگا تا ہے۔ تو اس کے اندر زندگی کی نئی امنگیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں اور اس کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ لیکن کہانی سے پہلے کہانی کار کو جان لیجیے۔ کیونکہ جب تک خالق کے بارے میں قاری کو کچھ پتہ نہ ہو۔ تب تک اس کی تخلیق تک پوری رسائی ہونا ناممکن ہے۔

پچھلی صدی کی پانچویں یا چھٹی دہائی میں مسرور جہاں کی کہانیاں چھپنی شروع ہوئیں تو لکھنؤ کے ادیبوں کی ٹولی میں یہ باتیں ہونے لگیں۔

''یار یہ لڑکی کون ہے؟''

بھگوتی چرن ورما کی زبان میں کہوں تو ان کی خوبصورت لکھنوی زبان اور کہانی کے فن پر عبور کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا کہ ''یہ سکّہ تو ٹکسالی ہے''

''وہ تو ہے۔ مگر یہ ادبی جلسوں میں شرکت کیوں نہیں کرتیں۔ آخر سب آتے ہیں۔''

رضیہ سجاد ظہیر آتی ہیں۔ شمیم نکہت آتی ہیں سروپ کماری بخشی آتی ہیں۔ یہ کیوں نہیں آتیں کسی نے اندازہ لگایا ''کوئی مرد ہے جو لڑکی کے نام سے لکھتا ہے۔''

''نہیں۔۔۔ کوئی لڑکی ہے''

''نہیں کوئی کہانی ہے۔ کہانی ہی کہانی کو لکھتی ہے۔''

آخر پتہ چلا کہ پردہ دار لڑکی ہے۔

یہ تو سب قیاس کی باتیں تھیں۔

آخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ قیاس لگانے والی ٹولی بکھر گئی۔ بقول اقبال مجید:

''یوں اجڑی احباب کی محفل۔۔۔
کس سے پوچھیں کون کہاں ہے۔

اقبال مجید خود سیتا پور چلے گئے۔ قیصر تمکین نے انگلینڈ کی راہ لی۔ محمد حسن، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، نجم الحسن، رضوان احمد، احمد جمال پاشا، حسن عابد، سبط اختر۔۔۔ ان میں سے کوئی دہلی چلا گیا۔۔۔ تو کوئی علی گڑھ کوئی پاکستان جا کر بس گیا۔ اس دوران مسرور جہاں کی کہانیاں چھپتی رہیں پھر یہ ہوا کہ پندرہ بیس سال پہلے ان کی کہانی ''شال فروش'' مہاراشٹر کے آٹھویں درجے کے نصاب میں لگی تو مسرور جہاں اردو دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ یعنی انہوں نے ثابت کر دیا کہ ''سکّہ واقعی ٹکسالی ہے۔ سچّا سچّا موتی۔۔۔''

پھر یہ ہوا کہ قزاقستان کے ایک اسکالر نے ان پر مقالہ لکھ کر ''پی ایچ ڈی'' کی ڈگری حاصل کی یہیں تک بس نہیں۔ اُن کا مسرور جہاں پر لکھا مقالہ روسی زبان میں ترجمہ ہوا تو مسرور جہاں کی ادبی حیثیت ایک طرح سے بین الاقوامی ہو گئی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اردو ادب میں یہ اعزاز صرف دو کہانی کاروں کو حاصل ہے۔ ایک جیلانی بانو اور دوسری ہیں مسرور جہاں۔

گھر کی چہار دیواری میں رہ کر اپنی محنت اپنی لگن، اپنی ریاضت سے مسرور جہاں نے اس منزل کو پا لیا۔۔۔ جسے پانے کے لیے سب ادیبوں کے دل مچلتے رہتے ہیں۔

اب آیئے اس کہانی کی طرف مڑتے ہیں جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا۔ مسرور جہاں کی اس کہانی کا نام ہے ''نُجّی''۔ یہ لکھنؤ کے اس دور کی کہانی ہے جب مسرور جہاں کے الفاظ میں ''نوٹنکی جیسا عام اور سستا تماشہ دیکھنا عزت دار لوگوں کے لیے بڑی سبکی کی بات تھی۔''

انہیں عزت دار لوگوں نے اس نوٹنکی کی سرپرستی کی تا کہ ''خاص امراء اور روٗسا'' کو تفریح کا موقع ملے۔ تو ماحول بدل گیا۔۔۔ ''خاکروب جھاڑو لگاتے۔ سقّے کمر پر مشکیں لادے چھڑکاؤ کرتے۔ ملازمین فرش اور روشنیوں کا انتظام کرتے۔ ساری رات ہنڈے سنسناتے، ہارمونیم، طبلہ، ڈھول اور نگاڑے بجتے اور گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ فضا میں سُریلی تانیں گونجتیں۔''

مسرور جہاں کے ان چند جملوں کو پڑھتے پڑھتے قاری کو لگے گا جیسے وہ اس دور کے سامعین کے ساتھ کھڑا ہو کر نوٹنکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

یہ وہ دور تھا لکھنؤ کا جب لڑکیوں کا اسٹیج پر آ کر ناچنا گانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے نوٹنکی میں لڑکی کا کردار لڑکے ہی نبھایا کرتے تھے۔ اس نوٹنکی میں ''نُجّی'' ہی وہ لڑکا ہے جس کے گرد نوٹنکی کی کہانی گھومتی ہے۔ مسرور جہاں کے الفاظ میں اس کی تصویر دیکھئے۔ آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ یہ لڑکے کا حُسن بیان ہو رہا ہے یا کسی حسینہ کا۔

''چھریرا جسم، پتلی کمر، گورا گلابی مائل رنگ، کتابی چہرے پر روشن روشن آنکھیں، پتلے پتلے متبسم لب، ستواں ناک میں لشکارا مارتی ہیرے کی لونگ، کمر تک لہراتے ہوئے چمکیلے سیاہ گیسو۔ سچ مچ کے گیسو۔۔۔ خدا نے گویا اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔۔۔''

ایسے حُسن کو دیکھ کر کس کافر کا من نہیں ڈول جائے گا اور نواب ذیشان تو تھے ہی اسی قماش کے آدمی۔ وہ اس نقلی حُسن پر بہکے تو یہ بھی بھول گئے کہ ان کی نئی بیاہی دُلہن انجمن آرا کے شانوں پر اس کی سنہری زُلفیں لہراتی ہیں تو اس کے حُسن کی ایک جھلک دیکھ کر فرشتوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

نواب صاحب نے اس ''گنجی'' کے سامنے تحائف کے ڈھیر لگا دیئے جب کہیں جا کر وہ رام ہوا۔۔۔اب نواب صاحب نے گنجی کو مردانے میں ٹھہرالیا۔۔۔تو اس کی نقلی چکا چوند میں ایسے کھوئے کہ اپنے گھر کے اس حصے کا راستہ بھول گئے جہاں زندگی کا اصل حُسن ان کا منتظر تھا۔۔۔انجمن آراء کی یہ مشکل کہ اس کی اَنا آڑے آئے۔۔۔وہ سوچتی ہے کہ اس کا مثالی حسن کیسے مات کھا گیا۔۔۔نواب صاحب ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ انجمن آرا ہیں کہ مردانے میں جا نہیں سکتیں ایسے میں انجمن آرا کو موقع مل ہی گیا۔ نواب صاحب کسی ضروری کام سے گاؤں گئے تو وہ ''گنجی'' کے کمرے میں جا دھمکیں۔ مسرور جہاں لکھتی ہیں:

''اپنے سامنے ایک نہایت حسین وجمیل نسائیت کے پیکر کو دیکھ کر وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا'' اور ایسا ہوتا کیوں نہ۔۔۔مسرور جہاں لکھتی ہیں ''اصلی حسن تو ساری حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔ یہ پلکیں اُٹھانے اور جھکانے کی فطری ادا۔۔۔شرگیں آنکھوں میں پھیلا ہوا گلابی ڈوروں کا جال، سرخ لبوں پر رقص کرتا ہوا ملکوتی تبسّم۔''

بس اسی حسن نے گنجی کے برسوں سوئے ہوئے جذبات کو جگایا تو وہ اسی پل پورا مرد بن گیا۔

نواب صاحب گاؤں سے لوٹے تو ان کے سامنے نقلی نازنین نہیں۔۔۔بلکہ ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا۔ پورے مردانہ جاہ وجلال کے ساتھ۔

اسی نقطے پر لا کر مسرور جہاں کہانی ختم کرتی ہیں تو انجمن آرا اور گنجی کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کیسے ایک خوبصورت نئی خوبصورتی کو جنم دیتی ہے۔

ایسی خوبصورت کہانی لکھنے کے لیے مسرور جہاں مبارکباد کی مستحق ہیں۔

مسرور جہاں کی افسانہ نگاری

شارب ردولوی
(لکھنؤ، بھارت)

ازل میں جب پہلی کہانی کی تخلیق ہوئی تو اس کا سبب عورت تھی اور پھر آج تک ہر کہانی عورت ہی کے گرد گھومتی رہی، کبھی وہ اس کی خالق ہوتی ہے کبھی اس کا کردار۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں جن خواتین نے افسانہ نگاری کے فن میں اپنی اہمیت کا احساس دلایا ان میں مسرور جہاں کی انفرادی حیثیت ہے۔ انہوں نے اس وقت قلم اٹھایا جب اردو افسانہ اپنے عروج پر تھا۔ اور افسانے کے درخت میں اظہار و بیان اور فن وتکنیک کی نئی شاخیں پھوٹنے لگی تھیں۔ منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، عصمت چغتائی، رام لعل، رتن سنگھ، عابد سہیل، قاضی عبدالستار، سب افسانہ نگار تھے لیکن سب کا اسلوب واظہار الگ الگ تھا، بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کا زمانہ رہا ہوگا کہ اسی زمانے میں مسرور جہاں کی کہانیاں سامنے آئیں اور رفتہ رفتہ توجہ کا مرکز بن گئیں۔ ان کہانیوں میں ایک گھریلو ماحول اور روز کے مسائل تھے اور ان کی پیش کش بہت سادہ تھی نہ کوئی شور نہ غوغا، نہ انقلاب، نہ احتجاج جیسا اس زمانے میں چلن تھا لیکن دل پر اپنا اثر چھوڑ جاتیں۔

مسرور جہاں نے اپنے افسانوں کے لیے توانائی حاصل کی اپنے گھر کے ادبی ماحول اور نفیس زبان سے۔ آج وہ کئی افسانوی مجموعوں کی خالق اور ناولوں کی مصنفہ ہیں جن کے افسانوں پر اردو اسکالرز کو پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد مل چکی ہیں اور ان کی کہانیاں ملک وبیرون ملک کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

افسانہ/ کہانی ادب کی وہ صنف ہے جس کے تانے بانے براہ راست زندگی سے جڑے ہوئے ہیں یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک بار اسے توڑ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی اور کہانی ضدی بچے کی طرح وہیں زمیں پر بیٹھ گئی لاکھ اسے چیخ چلا کر اٹھانے کی کوشش ہوتی رہی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی مجبوراً پھر ان ڈوروں کو جوڑ کر اسے اٹھایا گیا۔

مسرور جہاں کے افسانے اسی طرح قصہ گوئی کے فن سے مضبوطی اور خوبصورتی سے جڑے ہوئے ہیں انہوں نے بہت افسانے لکھے ہیں ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو ایک مخصوص تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جب زندگی زیادہ مطمئن تھی۔ گھروں میں بڑے بڑے پھاٹک ہوتے تھے، مکان حویلی کہلاتے تھے، دروازوں میں بڑی بڑی زنجیریں ہوتی تھیں، فضلو بابا اور رمضانی جہاں پھاٹک کھولنے کے لیے ہوتے تھے رحیمن بوا جاں نثار خدمت گار تھیں جن کی پشتیں ایک گھر کی خدمت میں گزر جاتی تھیں۔ حالانکہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ان تہذیبی اقدار پر حالات کی تندی سے بال آنے لگے تھے۔

مسرور جہاں کا تعلق لکھنؤ سے ہے اور یہ قدریں سب جگہ سے مٹ جائیں لیکن لکھنؤ میں اس کے آج بھی اثرات باقی ہیں یعنی یہ شہر ان شیشوں کو آج بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ مسرور جہاں کے قلم نے ایسی کہانیوں میں اسی وراثت کی بڑی باریک بینی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔

مسرور جہاں نے چیزوں کو ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا ہے اور وہ نسل جو تہذیبی طور پر اس طرح کے کسی عمل سے گزرتی ہے وہ زیادہ حساس اور نازک ہو جاتی ہے۔ وہ نئی اقدار کو قبول تو کر لیتی ہے اور بظاہر خوش بھی رہتی ہے لیکن وہ ان کو بھول نہیں پاتی۔ مسرور جہاں کے افسانے پڑھتے وقت جس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے وہ متضاد تہذیبی عمل Contrast Cullare ہے۔ وہ کہانی شروع تو کرتی ہیں آج کے عہد میں جب انسان ''کنکریٹ کے جنگل'' میں رہنے پر مجبور ہے لیکن وہ اس میں بھی ایک حویلی تلاش کر لیتی ہیں۔

''پچھلا دروازہ'' ان کا ایک اسی طرح کا افسانہ ہے جو قاری کو اودھ کے کسی نہ کسی ایسے شہر میں ایسے مکان کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے جہاں کبھی تہذیب فروغ پاتی تھی آج وہاں اداسی میں ڈوبا ہوا ایک پھاٹک ہے جو ایک مضمحل اور کمزور انسان کی طرح کھڑا ہوا ہے جس کے کھولنے والے پشتنی خدمت گار رمضان میاں میں بھی اتنی طاقت نہیں رہ گئی ہے کہ پورا پھاٹک کھول سکیں اس لیے پھاٹک میں لگے چھوٹے دروازے کو ہی آنے جانے والوں کے استقبال کے لیے کھولتے ہیں۔ خانصاحب، بیوہ بیٹی حسنہ اور ایک چھوٹا لڑکا اس حویلی کی کل ذی روح کائنات ہیں اور یہ شہر کا وہ علاقہ ہے جہاں رفتہ رفتہ پرانے مکان ملٹی اسٹوری فلیٹ میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں اس طرح دو متضاد تہذیبیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔

''پچھلا دروازہ'' اس معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کی بہت پر اثر تصویر ہے اس طرح کی ویران ہوتی حویلیوں اور اس کے آخری نواسیوں کو ہمیشہ کسی کی مدد کی ضرورت رہتی ہے جو ان کی بچی ہوئی انا کو ان کی زندگی میں ٹوٹنے سے بچا لے۔ پچھلے دروازے کے خانصاحب کی یہی کیفیت ہے سرمد کا معمولی سہارا ملتے ہی وہ اپنے چُنی ہوئی آستینوں کے ملبوس کو ایک ایسے سفید لباس سے بدل لیتے ہیں جسے کبھی تبدیل نہ کرنا پڑے۔

جاگیردارانہ نظام تو دور کی بات ابھی وہ آنکھیں باقی ہیں جنہوں نے بڑے بڑے گھروں میں ان ''پچھلے دروازوں'' کو کھلتے دیکھا ہے۔ سرمد کو خانصاحب کے انتقال کے بعد یہ احساس ہوا کہ حویلی کا سامان اب اس طرح سے سجا ہوا نظر نہیں آتا جس طرح پہلے ہوا کرتا تھا۔

''۔۔۔ انہوں نے غور کیا کہ رفتہ رفتہ بیٹھک کا قیمتی سامان کم ہوتا جا رہا ہے آخر ایک دن انہوں نے رمضان میاں سے پوچھ ہی لیا۔ اور رمضان میاں کے جواب دینے سے پہلے ہی حسنہ نے پردے کے پیچھے سے کہا:

سرمد صاحب آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ حویلی میں ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔'' (پچھلا دروازہ، ہمیں جینے دو، ص:۱۲۴)

مسرور جہاں نے کچھ کہے بغیر ایک چھوٹے سے جملے سے خانصاحب اوران کی بیوی بیٹی حسنہ کے بارے ہی میں نہیں اس پورے عہد اور ہر ان بڑے گھروں کی تاریخ رقم کر دی جو حالات کی تبدیلی یا خاتمہ زمینداری کے بعد پچھلے دروازے پر زندہ رہے۔

جہاں کے افسانوں کا حسن ان کی سادگی میں پوشیدہ ہے۔ان کی زبان مثالی طور پر سادہ اور پرکشش ہے وہ بڑی معصومیت کے ساتھ کہانی کہتے کہتے ایک ایسا جملہ لکھ جاتی ہیں جو کہانی کو ایک نیا موڑ دے دیتا ہے اور افسانے کو واقعہ نگاری بننے سے بچالیتا ہے۔

''ایک شجر ایسا'' اُسی عہد کی کہانی ہے لیکن اس کا کینوس زیادہ بڑا ہے۔اس کہانی کا موضوع بہت مشکل اور نازک تھا اس لیے کہانی کے ''لذت آمیز'' موڑ لے لینے کی بڑی گنجائش تھی لیکن مسرور جہاں نے بڑی خوبصورتی سے اسے سنبھال لیا اور محسوس بھی نہیں ہونے دیا۔ایک امیر گھرانے کی ڈیوڑھی ، ملازموں کی ریل پیل اور بڑی سرکار کے انتقال کے بعد ڈیوڑھی کا تقسیم ہو جانا کوئی نئی بات نہیں، مسرور جہاں ڈیوڑھی کے کلچر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''منجھلی بیگم اپنے نواڑی پلنگڑی پر بیٹھی گلوریاں نوش کرتیں یا دن میں چار بار اپنا لباس تبدیل کر کے سج سنور کر آئینہ دیکھتیں اور اپنے حسن کو سراہتیں۔ گلبیا نے ایک تندرست اور توانا لڑکے کو جنم دیا تو ڈیوڑھی کی بیگمات نے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اللہ بخش مراثی کو مرے ہوئے برسوں ہو گئے تو یہ لڑکا کہاں سے آ گیا۔۔۔برسوں کسی کو اس کے نام کا پتہ نہیں چلا وہ تو ایک دن منجھلے صاحب نے گلبیا کو ڈانٹا ''کیا بہری ہوگئی ہے گلبیا سنائی نہیں دیتا، شجاعت کب سے رو رہا ہے تب آس پاس والوں نے پہلی بار نام سنا اور فوراً شجاعت کا قافیہ وجاہت سے ملا دیا۔جو منجھلے صاحب کا نام تھا۔۔۔'' (ایک شجر ایسا،ہمیں جینے دو،ص:۱۲۵)

کس خوبصورتی سے مسرور جہاں نے حویلیوں کی صورت حال کا نقشہ چند جملوں میں پیش کر دیا ہے اور کوئی طویل کہانی سنائے بغیر ایک جملے بلکہ ایک لفظ ''قافیہ ملانے'' میں ہی سب کچھ کہہ دیا۔یہ بیانیہ،تہذیب اور زبان پر ان کی گرفت کی مثال ہے۔

گلبیا نکال دی گئی لیکن فوراً چھوٹی بیگم نے اسے رکھ لیا۔شجاعت شجن ہو گیا اور چھوٹی بیگم کی بیٹی پھول بیگم کے ساتھ اس کے محافظ کی طرح وہیں پرورش پانے لگا،لڑکیاں کب بڑی ہو جاتی ہیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا اور پھر ایسی حویلیوں میں جہاں کسی کو کسی کی فکر نہیں رہتی۔پھول بیگم اور شجن اپنی عمر کی اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھاتے گئے لیکن مسرور جہاں کے مطابق کہ ''شاید اس جیسے نوکر کبھی جوان نہیں ہوتے۔''

یہاں شجن یا پھول بیگم کی کہانی نہیں دہرانی ہے بلکہ اس زبان اور ان تہذیبی اقدار کی طرف اشارہ کرنا ہے جو مسرور جہاں کے بیانیہ اور بین سطور میں پوشیدہ ہوتا ہے۔جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ کہانی لکھتی نہیں سناتی ہیں اور اس طرح کہ درمیان میں ''ہوں'' کی گنجائش بھی نہیں رہتی۔ان کی خوبصورت بامحاورہ زبان بہت کچھ کہہ دیتی ہے اسی افسانے ''شجر ایک ایسا'' میں حویلیوں میں پرورش پانے والی لڑکیوں اور ان کی شادی میں دشواریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔حالانکہ یہ پریشانی پھول بیگم کو اپنی لڑکی کے لیے نہیں ہوئی لیکن یہ ایک بڑا مسئلہ حویلیوں اور حویلیوں سے باہر دونوں جگہ رہا ہے،جس کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہیں:

''خاندان کی لڑکیاں بیری کی مانند پھل کر چھتنار ہوتی جا رہی تھیں اور کوئی تو بھٹ کٹیّا کی جھاڑی کی طرح خطرناک حد تک جوان ہوگئی تھیں لیکن ابھی تک کسی کے آنگن میں ڈھیلا تو کیا کنکری تک نہیں آئی تھی۔پھول بیگم کے آنگن میں رشتے ٹپکے کے آم کی طرح پٹاپٹ گر رہے تھے۔''

(ایک شجر ایسا،ہمیں جینے دو،ص:۲۶)

ایسی روزمرہ اور بامحاورہ زبان میں مسرور جہاں نے اس چھوٹے سے اقتباس کے ذریعہ جس خوبصورتی سے لڑکیوں کے کس طرح جوان ہو جانے اور ان کے رشتے کی زحمتوں کی تصویر کشی بیری، بھٹ کٹیّا، ڈھیلا اور آم کے ٹپکے کے عوامی محاوروں سے کی ہے وہ زبان تہذیب پر رہتی ہے۔ان کے افسانے سماجی مسائل کی بنیاد پر ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ سماجی مسائل پر کہانیاں نہیں لکھتیں جو مسائل ان کے افسانوں میں ملتے ہیں وہ ایک عام زندگی اور ان کے کرداروں سے وابستہ مسائل ہیں اس لیے وہ کسی شعوری کوشش کے بغیر خود اس میں آ جاتے ہیں وہ بعض جگہ بڑی فلسفیانہ باتوں کو اپنے مخصوص لہجے اور انداز میں بڑی آسانی سے بیان کر دیتی ہیں ''وقت'' کے بارے میں لکھتی ہیں:

''وقت کتنا تیز گام ہے کہ ایک پل نہیں ٹھہرتا اور ظالم ایسا کہ کسی کے دکھ سکھ کا بھی خیال نہیں رکھتا۔بس آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے،خوشیوں کو روندتا، دکھوں کو سمیٹتا، نہ پیچھے چھوٹنے والوں کی فکر، نہ ساتھ چلنے والوں کا لحاظ،ایک دن پھول بیگم نے حساب کتاب کیا تو پتہ چلا آغا صاحب کو جدا ہوئے برسوں بیت گئے۔''

(ایک شجر ایسا،ہمیں جینے دو،ص:۲۷)

''وقت'' کیا ہے، کیسا ہے، یہ پل پل میں تقسیم ہے، یا صبح و شام میں یا برسوں میں یا صدیوں میں اس پر نہ جانے فلسفیوں اور ریاضی دانوں نے کتنا کچھ لکھا ہے لیکن جس طرح مسرور جہاں نے اس کی تشریح ایک ایسی مثال سے کر دی کہ جس کے بغیر ایک لمحہ نہیں گزرتا تھا اس سے ''جدا ہوئے برسوں بیت گئے'' یہ وقت کا تماشا تھا کہ احساس بھی نہ ہوا۔جس میں اس کی رفتار بھی آ گئی اور اس کی قیامت خیزیاں بھی۔

مسرور جہاں، بہت اچھی ''کہانی ساز'' ہیں ماجرہ میں کسی جگہ ایک شکن نہیں آتے دیتیں کہ آپ کہانی کے درمیان کہانی کو پا جائیں یہ Suspence نہیں ان کی کہانی سازی کی مہارت ہے اسی افسانے کو دیکھئے ''ایک شجر ایسا'' ایک نارمل قصہ کی طرح شروع ہوتا ہے ایک حویلی ہے ایک نواب صاحب ہیں ان کی ایک بیٹی پھول بیگم ہے،اسی کا ایک ہم عمر حویلی میں پرورش پانے والا میراثن کا لڑکا شجن ہے دونوں ساتھ پرورش پاتے ہیں، ہر وقت ساتھ رہتے ہیں یہاں تک کہ اپنی

شادی کے بعد وہ مُجن کو ماں سے مانگ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ پھول بیگم کے شوہر کا ہوائی جہاز کے حادثے میں انتقال ہو جاتا ہے تو وہ ان کے کاروبار کو بھی دیکھنے لگتا ہے اور پھر اچانک کہانی بالکل غیر متوقع موڑ لیتی ہے۔ قاری کہانی پڑھتے وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پھول بیگم کی بیٹی (مہک) کو ٹیوشن پڑھانے والا شخص خود ان سے اظہار عشق کر بیٹھے گا۔ یہ سانحہ ان کے لیے بڑا سخت تھا۔ ان کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں نے ایک عجیب اَن کہی بات کہہ نہیں دی بلکہ کہانی میں وہ دراڑ پیدا کر دی جس سے اندر کچھ نظر آ سکتا تھا۔ کہانی میں کہیں پر اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا حالانکہ فطری طور پر ایسا ہوتا تو غلط نہ ہوتا لیکن شاید مسرور جہاں خود بھی نہیں چاہتی تھیں پھر بھی ان کی کہانی نے اچانک یہ موڑ لے لیا۔

''مُجن حسب معمول دو پہر میں دوکان بند کر کے گھر آیا تھا۔ پھول بیگم کو اسی طرح تڑپ تڑپ کر روتا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔

''بی بی آپ کو خدا کا واسطہ کیا بات ہے مجھے بتایئے میں ہوں نا؟

مُجن نے ایک بار پھر اپنے ہونے کا احساس دلایا اور اس کے لہجے کا اعتماد انہیں خوشگوار حیرت سے دوچار کر گیا۔

انہوں نے بڑی آس سے اسے دیکھا۔
''میں ہوں نا؟'' جیسے سایہ دار چھتنار درخت
''میں ہوں نا؟'' جیسے مر مٹنے کا خاموش وعدہ
''مُجن'' انہوں نے جیسے دور سے آواز دی

(ایک شجر ایسا، ہمیں جینے دو، ص:۳۱)

مسرور جہاں نے یہاں پر کچھ نہیں کہا لیکن ان کے جملے نے ساری کہانی سنا دی۔

مسرور جہاں کے افسانے صرف حویلیوں کے گرد نہیں گھومتے انہوں نے اس طرز زندگی کو رفتہ رفتہ ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ عورتوں کے مسائل ان کی کہانیوں کا بنیادی موضوع ہیں۔ وہ ایک ہمدرد دل والی خاتون ہیں جنہیں **Mother Writer** کہنا چاہیے جو کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتیں ان کے کردار بھی ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج نہیں کرتے بلکہ اپنی شرافت سچائی اور بے لوث محبت سے حالات پر قابو حاصل کر لیتے ہیں ان کا افسانہ ''ٹکڑوں میں بٹی عورت'' ہو یا ''دھنک کے ساتھ رنگ'' ایک بے ثمر ٹہنی کے نیلو اور رویش ہوں یا درد سے دوستی کی اوشا، ہر جگہ ایک دردمند دل ہے، ہر جگہ ایک قربانی دینے والی خدمت گزار عورت، یہ کہانیاں روز مرہ کی کہانیاں ہیں ہر گھر کی جدوجہد کی کہانیاں۔ مسرور جہاں کی زبان اور انداز تحریر نے انہیں تمام تر سادگی کے باوجود ایسا پر اثر بنا دیا ہے کہ یہ کہانیاں دل و دماغ میں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں، ان کی ایک قدرے طویل کہانی ''پچھتر برس کی عورت'' ہے جو اپنے عنوان سے بھی عجیب معلوم ہوتی ہے یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو مشہور افسانہ نگار ہے اور جو ساری زندگی قربانیاں دیتی رہی لیکن اس کا قلم نہیں رُکا اور اسے اپنے فرض کے علاوہ کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ عمر کی اس منزل پر جب وہ پلٹ کر دیکھتی ہے تو وہ کچھ بھی نہیں سوائے ''ایک مشت خاک کے''

''زندگی کی پُر خار راہیں طے کرتے کرتے وہ بہت دور نکل گئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کا سارا خون نچوڑ کر اس کی روشنائی بنائی اور اپنی انگلیوں کو اس روشنائی میں ڈبو کر صفحۂ قرطاس پر کچھ نشان ثبت کر دیئے۔۔۔ انعام و اعزازات اس کی جھولی میں جمع ہوتے رہے۔۔۔ وہ لکھتی رہی، حالات اور دکھوں کی چکی میں پستے پستے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔۔۔ ماضی کی گلیاروں میں پچھتر برس کی ایک لڑکی نے جب اپنے وجود کے بچے کھچے ریزوں کو جمع کیا تو ایک مشت خاک کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا'' (پچھتر برس کی لڑکی، ہمیں جینے دو، ص:۱۷۲-۱۷۳)

یہ کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ احساس فرض میں دبی ہر اس لڑکی کی کہانی ہے جو فرض کی ادائیگی میں اپنی جان قربان کرتی رہی اس نے اپنے قلم اور تحریر کے ذریعہ شہرت ضرور پائی ہی لیکن تنہائی کا وہ احساس جسے وہ بھیڑ میں رہنے کے باوجود دور نہیں کر سکی سب کے ساتھ ہونے کے باوجود بانٹ نہیں سکی۔ وہ آج اپنے احساس کی دنیا میں بالکل اکیلی ہے۔ یہ افسانہ بظاہر احساس فرض اور قربانیوں کا افسانہ ہے لیکن بین السطور میں ایک تخلیق کار کی کہانی ہے جو پچھتر برس بعد جب اپنی طرف دیکھتی ہے تو اسے صرف ایک مشت خاک نظر آتی ہے یہ ایسا جذباتی کرب ہے جسے الفاظ بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتے۔

مسرور جہاں کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ خیال میں پرورش نہیں پاتے ان کے افسانے ہمارے گرد پھیلی ہوئی زندگی ہیں یہ اگر خوبصورت ہے تو ان افسانوں میں وہ خوبصورتی بھی ہے اور اگر بدصورت ہے تو وہ بدصورتی بھی۔ خود مسرور جہاں نے نہ اسے بنانے کی کوشش کی اور نہ بگاڑنے کی انہیں بیانیہ پر بڑی قدرت ہے ان کی شیریں، شستہ اور نفیس زبان ان کے کہانی کہنے کے فن کی طاقت ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے آج اردو کے مقبول افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

''سچائی''

انسان کو چاہیے کہ اپنے لیے ''سچائی'' خود تلاش کرے، اپنی سچائی خود ڈھونڈے جس سے اس کا دل مطمئن ہو۔
عزیزم، تم چیزوں کو ویسی دیکھو جیسی کہ وہ ہیں ''لوگ بُرے ہیں'' یہ تو ہوئی سچائی، اور اچھے لوگ کہاں ہیں؟ بات یہ ہے کہ اچھے لوگوں کو ایجاد کرنا پڑتا ہے، ان کو گھڑنا پڑتا ہے۔ سمجھے؟''

میکسم گورکی

خوبصورت افسانوں کا آسمان

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بہار، بھارت)

مسرور جہاں کے افسانوں کو پڑھتے وقت اور ان کے اظہار کے پیرایوں کے مطالعے پر غور کرتے وقت حال کی تیئں ان کے ردعمل سے واقفیت ہوتی ہے۔ جن میں نیا پن اور انوکھا پن ہے اور طرزِ احساس اور طرز بیان کے نئے پن سے نئی شناخت قائم ہوتی ہے۔

مسرور جہاں نے زندگی کی فنی چابک دستی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ عوامی مسائل، آس پاس کی زندگی، قدروں کی معنویت، اقتصادی نابرابری، مکاریاں اور جعل سازیاں، مذہب کے نام اور اولاد نہ ہونے کے نام پر استحصال جیسے موضوعات پر ان کی نظر گئی ہے جسے خلوص کے ساتھ افسانوں کا لباس پہنایا ہے۔ ان کے پیشتر افسانوں میں درد و غم کی آمیزش ملتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سماج کی دکھتی رگوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی سچی عکاسی کی نئی تبدیلیوں کا احساس عام کیا اور ایسے خوابوں کے تانے باتے بنے جو بہتر ماحول اور خوش حالی کی تمناؤں سے معمور تھے۔ وہ ۱۹۵۰ء۔۱۹۵۵ء کا دور تھا جب مسرور جہاں نے افسانوں کو اپنے ذہن اور قلم کا حصہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں سماجی معنویت کی سطح پر نئی تبدیلیوں کا احساس اور جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ پسماندہ طبقے کے افلاس اور عام انسانی ذہن کی سیاسی بیداری کے احساس کی عکاسی اور ملک میں پیدا شدہ صورت حالات پر ان کی فنکارانہ تنقید و بصیرت کا بھی احساس ملتا ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں ہے کہ اس کی بھی تاریخی اہمیت ہے۔

مسرور جہاں ساری زندگی خوابوں کے ٹوٹنے بکھرنے اور ان کی نئے سرے سے تشکیل کرنے کے ارادوں کو ساتھ لے کر لکھتی رہیں۔ آج بھی تخلیقی اظہار کی ایسی ہی جرأت ان میں ہے۔ لمحے صدی بن کر گزرتے ہیں لیکن جس کو کھڑا رہنا ہے وہ وہیں رہتا ہے۔

''خدا جانے انہیں ان سے کیا بیر تھا، انہیں یہ بھی خلش تھی کہ دادا کی جائیداد اس کے ابّا کے بعد اسی کو ملے گی۔ بھلا بیٹے کے ہوتے، بھانجا کیسے وارث ہوسکتا تھا۔ ان کے خاندان میں بیٹیوں کو زمین جائیداد میں حصہ دینے کا چلن نہیں تھا۔ شادی کے وقت اتنا کچھ دیا جاتا تھا کہ اس کے بعد لڑکیوں کو وراثت میں حصہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بڑی پھوپھی کو بھی منوں تانبا، کئی سیر چاندی اور پچاس تولے کے سونے کے زیورات دیے گئے تھے۔ جو ان کے شوہر نے ریس میں اڑا دیے تھے۔ اس لیے جب وہ مرنے والے کا گھر چھوڑ کر باپ ماں کی دہلیز پر واپس آئیں تو خالی ہاتھ تھیں۔''
(انتظار کی صدی)

روایت سے مسرور جہاں کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ وہ واقعات اور حادثات کا تجزیہ اس انداز سے کرتی ہیں کہ صورت واقعہ کھو کھلے لفظوں کی شاعری بن جاتی ہے۔ جبکہ زندگی کی وسیع جولاں گاہ حقیقی خد و خال تراشنے کی دسترس میں ہے۔ خیر و شر کے ایک قاش کا نقش وہ اس طرح بھی بیان کرتی ہیں:

''تو ایسی تھی میں جو نہ کسی نئے سانچے میں ڈھل سکتی تھی نہ کسی اور شکل و ہیئت میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ ایسی ہر کوشش میرے وجود کو صرف توڑ سکتی تھی اور میری توڑ پھوڑ کا اہتمام جس کرّ و فر سے کیا گیا وہ میرے لیے سخت ذہنی کرب کا سبب بنا۔

میرے شریک سفر۔۔۔ عادل ایک عام سے انسان اور عام سے شوہر تھے۔ لیکن ان کی ساری خامیوں پر، خالص ہڈی بے میل خون کا غازہ مل کر میرے سامنے پیش کیا گیا اور میرے خوابوں میں بسنے والا گھر مع اپنے بام و در کے ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ جن دالانوں اور صحنوں میں انسان، بکریاں، کبوتر اور بٹیریں ایک ساتھ رہتے بستے تھے انہیں میرے ہنر مند ہاتھوں کے لمس کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں تو میری خاموشی اور بے حسی کی زیادہ ضرورت تھی۔ سو میں نے اسی کو اپنا شعار بنا لیا۔ وہاں بھی کب کسی کو اتنی فرصت تھی جو میری پل پل بدلتی ہوئی کیفیتوں کو سمجھتا۔ عادل کی محبت کا ثبوت میرے بچے تھے جو حویلی کے دوسرے بچوں اور جانوروں کے ساتھ رلتے رلتے بڑے ہو رہے تھے۔''

(بشارت)

مسرور جہاں افسانے میں حقیقت بیان کرتی ہیں جس کا اثر پڑھنے والوں پر براہِ راست ہوتا ہے۔ وحدت اور شدت سے بھرپور ایک افسانے کا اختتام ملاحظہ کیجیے۔ مقصد اور آرٹ کی کشاکش میں اپنے عہد کا فطری داغدار چہرہ حسّاس ذہن کو تپش عطا کرتا ہے جہاں اندر کی چیخ دوسروں تک نہیں پہنچتی ہے:

''پچھلے کچھ دنوں سے اس اجنبی ملک پر بھی جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں، لڑائی اقتدار کی ہو یا حصولِ زر کی یا اصولوں کی۔ مرنے والے ہمیشہ بے قصور ہی ہوتے ہیں اور ہم جیسے بے در اور بے گھر لوگوں کو نہ اقتدار سے کوئی واسطہ ہوتا ہے نہ اصولوں سے کچھ لینا دینا ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد تو پیسہ کمانا ہے۔ میری طرح سینکڑوں اور ہزاروں لوگ اپنا گھر اور اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی زمینوں پر محض پیسہ کمانے جاتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس جنگ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جنگ کے خطرے کے پیش نظر بہتوں نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہیں رہوں گا۔۔۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ میری بے خواب آنکھوں میں صحراؤں کی ریت کی چبھن ہے اور سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے نادان ہوتے ہیں جو وطن کی سرزمین پر مرنا چاہتے ہیں میرے لیے تو جلاوطنی کی موت ہزاروں زندگیوں پر بھاری ہے۔ دل کے کسی گوشے میں

ہوک اُٹھتی ہے۔۔۔کاش یہ شب تنہائی کچھ اور مختصر ہوتی۔۔۔اے کاش
(جلاوطن)

ذاتی اور جذباتی زندگی کی وابستگی کی سوچ مسرور جہاں کے یہاں الگ انداز سے سامنے آتی ہے۔ روپیش ایک ایکسیڈنٹ میں اپاہج ہو جاتا ہے۔ نیلو کو وہ خوشیاں دینے کا خواہش مند ہے لیکن مردانہ محرومی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پاتا۔ نیلو ماں بننا چاہتی ہے آخر نریندر اس کی زندگی میں آتا ہے جبکہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے ماں بننے کا سجھاؤ سامنے ہے۔ یہ ڈاکٹر کا مشورہ تھا اس دن شادی کی تیسری سالگرہ تھی اور نیلو شام سے ہی غائب تھی۔ دس بجے وہ تھکی تھکی سی گھر لوٹی تو روپیش اس کا منتظر تھا۔ آگے کہانی کا اختتامیہ مسرور جہاں سے سنیے:

''اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔۔۔اور پرس سے ایک لفافہ نکال کر روپیش کی طرف بڑھا دیا، اس کے سفید ہاتھ کی گلابی گلابی انگلیوں کی لرزش بالکل نمایاں تھی۔

''یہ کیا ہے نیلو؟'' روپیش نے پوچھا۔

''خود دیکھ لو'' نیلو کی آواز کانپ رہی تھی۔

شاید میری طرح تم کو بھی یاد ہے کہ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔۔۔لیکن یہ کیسے تحفے ہیں جو سب ایک ننھے سے لفافے میں سما گئے ہیں۔ میرا بھی تحفہ اس لفافے میں ہے۔ لو کھول کر دیکھ لو۔ روپیش نے وہ آسمانی لفافہ نیلو کی طرف بڑھا دیا۔۔۔اور ان پرزوں پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں ایک پرزے پر چند سطریں لکھی تھیں۔

''روپیش میں نریندر سے ایک صحت مند بچہ لینا چاہتی ہوں۔ لیکن بالکل فطری طریقے سے تاکہ نریندر اس کا باپ کہلائے۔۔۔نیلو۔''

دوسرے پرزے کی تحریر اس طرح تھی ''نیلو! تم نریندر کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرو یہ میری دلی خواہش ہے کہ تم ماں بنو۔ لیکن ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی ماں نہیں بلکہ نریندر کے بچے کی ماں۔ طلاق نامہ اور جائیداد کے کاغذات میرے وکیل ہربنس رائے سے لے لینا۔ میری کل املاک اب تمہارے نام ہے۔ یہ تمہارے بچے کے لیے ایک معمولی تحفہ ہے۔ جو میرا نہ ہو کر بھی میرا ہی ہوگا۔ اور وہ جب اس سنسار میں آئے تو میرا پیار دینا۔۔۔روپیش''

نیلو نے روپیش کا خط پڑھا۔۔۔اس کی نظریں روپیش کی نظروں سے مل کر جھک گئیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن ان آنسوؤں میں ایک نمایاں فرق تھا ایک کی آنکھوں میں خلوص اور طمانیت کے آنسو تھے اور دوسرے کی آنکھوں میں شرم و ندامت کے۔۔۔اور تب اچانک نیلو روتی ہوئی روپیش کے پیروں سے لپٹ گئی۔''

(ایک بے ثمر ٹہنی)

فرقہ وارانہ فساد اپنے ملک کی قسمت میں ہے۔ فساد کی وجہ سے پیار محبت کے کیسے کیسے رشتے ٹوٹ بکھر جاتے ہیں اس پر تقریباً سبھی افسانہ نگاروں نے لکھا ہے۔ مسرور جہاں نے بھی اس عمل اور ردعمل کی قوت کو شدت سے ابھارا ہے جس میں خارجی ماحول کے ساتھ کردار کا ذہن خود اپنی سولی بن گیا۔ کرب زدگی کے سمٹاؤ کی ایک مثال دیکھئے:

''اس کے آفس چھوڑتے چھوڑتے شہر کی حالت ابتر ہو گئی گولیوں کی آوازیں، بموں کے دھماکے اور آگ لگنے کے واقعات دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ کرفیو کا اعلان اتنی تاخیر سے ہوا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔۔۔۔ وہ چھپتا چھپاتا اپنے محلے میں پہنچا تو تباہی اور قتل و خون کے منظر دیکھ کر اسے جھرجھری آ گئی۔ اماں، بابا، رشمی اور انو کا خیال آیا تو بے تحاشا گھر کی طرف دوڑا۔۔۔اور گھر کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹھک گیا، کوئی آہٹ نہیں، کوئی آواز نہیں۔ زندگی یوں خاموش نہیں ہوتی۔ یہ سناٹا، یہ خاموشی؟ وہ چیخ مار اندر گھسا اور سب کو نام بہ نام آواز دینے لگا۔۔۔جواب کون دیتا۔ صحن کے بیچوں بیچ بابا کی لاش پڑی تھی۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر اماں کی لاش تھی، ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دہشت کے رنگ جم گئے تھے۔

''رشمی! اس نے بیوی کو آواز دی۔ اور کمرے میں قدم رکھتے اس کے سارے جسم کی جان نکل گئی سامنے بیڈ پر رشمی پڑی تھی خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا اور اس کی چھاتی سے انو چمٹی ہوئی تھی۔ آج رشمی اس کے جلدی آنے پر خفا بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن روز کی طرح اٹھ کر اس کا استقبال بھی نہیں کیا تھا نہ ہی انو کو اس کی گود میں دیا تھا۔ وہ بے آواز رو دیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روئے، بین کرے اور دیواروں سے سر پٹخ پٹخ پر اپنی جان دے دے۔''

(گڑیا)

''مسرور جہاں کے افسانوں کے محرکات الگ الگ ہیں۔ کرب، ہمدردی، برہمی، محرومی اور ذاتی وابستگی کو پیش کرتے وقت وہ پناہ پر توجہ دیتی ہیں۔ یہ انسانی نفسیات کی گرہ جس میں نفرت، خوف، دکھ، احساس کی سرحد اور ٹوٹے ہوئے اعتماد کی لہو رنگ گہرافشانیاں خود بخود جھلکتی ہیں۔ شانتی کو ایک ڈاکو بس سے اتار کر لے جاتا ہے۔ وہ اپنے مائکے سے شوہر کے گھر لوٹ رہی تھی لیکن راستے میں یہ حادثہ سامنے آ گیا۔ ڈاکو اسے جنسی لذت کا شکار بنانا چاہتا ہے تبھی شانتی اسے بتاتی ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ تب ڈاکو نے اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اپنی گاڑی سے اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ آگے کی کہانی مسرور جہاں بتاتی ہیں:

''شانتی نے دروازے پر نظر ڈالی۔ تالا نہیں لگا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ پرکاش آ گیا ہے۔ اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ سامنے پرکاش کھڑا تھا۔ وہ شاید گہری نیند سے اٹھ کر آیا تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

''ماں کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اچھی ہے۔'' وہ کپڑے بدلنے پردے کے پیچھے چلی گئی۔

باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ کیجیے

افسانوں کی طلسمی دنیا

دیپک بُدکی
(غازی آباد، بھارت)

۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ لکھنؤ میں ڈاک محکمے میں تربیت پا رہا تھا کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی سے، جو اسی محکمے میں افسر تھے، تعارف ہوا اور بعد میں ان کے ہمراہ چند اردو کی محفلوں میں شرکت کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ لکھنؤ کے بارے میں جو کچھ سنا تھا یا کتابوں میں پڑھا تھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ وہ تہذیب اور نہ ہی وہ لوگ۔ اس لیے فاروقی صاحب سے پوچھ بیٹھا: ''سر، وہ لکھنؤ جس کے بارے میں سنتا اور پڑھتا آیا ہوں، وہ کہاں ہے؟'' فاروقی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: ''دیپک، تم ستّر سال بعد لکھنؤ آئے ہو۔'' مایوس ہو کر میں خاموش ہو گیا۔ بہر حال اسے میری خوش قسمتی سمجھیے کہ حال ہی میں لکھنؤ کی معروف ادیبہ، مسرور جہاں نے اپنی چھ تازہ ترین کتابیں عنایت فرمائیں اور میری ساری تلخی و ترشی دور کر دی۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کی وساطت سے مجھے نہ صرف لکھنؤ کی سیر کرائی بلکہ تاریخ کے اوراق پلٹ کر ماضی کی طلسماتی اور پر اسرار دنیا کے درشن کرائے جہاں لکھنؤی تہذیب و ثقافت کا غلغلہ تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں خود وہ زندگی جی رہا ہوں۔ اس بارے میں مسرور جہاں نے 'اللہ تیری قدرت' میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''میں نے جس زمانے میں آنکھ کھولی یہ معاشرہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک جلوس جہاں نئے راستوں پر گامزن تھا وہیں گذرے ہوئے وقت کے مرثیہ خواں ابھی بھی اس ماضی کے مجاور تھے جو کبھی کا ناپید ہو چکا تھا۔ پرانے وقتوں کی یادگار تاریخی عمارتیں، مسجدیں اور امام باڑے تھے اور یہ لوگ۔ یا پھر اپنے اسلاف کی شان و شوکت پر نوحہ کناں شکستہ محلّات اور ڈیوڑھیاں، جن کے دالانوں، محرابوں، جھروکوں اور جالیوں سے جھانکتی ہوئی مایوس اور افسردہ آنکھیں تھیں۔۔۔ میرے سامنے لکھنؤ کی اس تہذیب کے مِٹے مِٹے سے نقوش تھے جن کے اثر و آثار اب تاریخی حوالوں تک محدود رہ گئے ہیں۔'' ('اپنی بات' مشمولہ 'اللہ تیری قدرت')

مسرور جہاں کی ولادت فتح پور، ضلع بارہ بنکی (یو پی) میں ۸/جولائی ۱۹۳۸ء کو ایک باذوق اور علمی گھرانے میں ہوئی لیکن پرورش نزدیک ہی لکھنؤ شہر میں ہوئی۔ ادب وراثت میں ملا۔ دادا پروفیسر شیخ مہدی حسین ناصری لکھنؤی شاعر اور نثر نگار تھے اور سات زبانوں میں مہارت رکھتے تھے جبکہ والد نصیر حسین خیالؔ شاعر اور معلم تھے۔ حالانکہ مسرور جہاں میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکیں پھر بھی ان کے دل میں علم کی جوت بدستور جلتی رہی۔ ان کا پہلا ناول 'روما' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے، ناول، بچوں کی کہانیاں اور شخصی خاکے ہندستان، پاکستان اور کینیڈا میں مسلسل چھپتے رہے۔ ان کے افسانوں کے ترجمے انگریزی، ہندی، پنجابی، تامل، تیلگو اور کنّڑ میں شائع ہو چکے ہیں۔ بریل خط (Braille) میں بھی چند کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ ان کی ایک کہانی 'صلیب پہ ٹنگی زندگی' کو دوردرشن نے ۲۰۱۳ء میں ٹیلی وائز کیا تھا۔ مسرور جہاں کی ایک کہانی 'شال فروش' مہاراشٹر کے اردو بال بھارتی نصاب (برائے آٹھویں جماعت) اور ایک اور بچوں کی کہانی ساہتیہ اکادمی کی کتاب 'اردو میں بچوں کے ادب کی اینتھولوجی' [مرتّب مناظر عاشق ہرگانوی] میں شامل کی جا چکی ہیں۔ تاجکستان میں جاوید خلوف نے 'مسرور جہاں' کے عنوان سے ۲۰۱۲ء میں مقالہ لکھ کر ریسرچ کی ڈگری حاصل کی جبکہ ڈاکٹر نگہت سلطانہ عابدی نے ۲۰۰۸ء میں 'مسرور جہاں–شخصیت اور فن' پر مقالہ رقم کر کے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اور دہلی کے ساتھ بھی موصوفہ وابستہ رہی ہیں۔

مسرور جہاں کے افسانوں میں جہاں موضوعاتی اور کرداری تنوع ملتا ہے، وہیں اندر ہی اندر ایک زیریں لہر سی دوڑتی ہے جو انھیں ایک ہی مالا میں پروتی ہے۔ بیشتر افسانوں کا منظر نامہ درمیانہ درجے کے گھریلو ماحول سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کا غالب موضوع مسلمان سماج کا وہ کرب ہے جو تقسیم وطن کا زائیدہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی اکثریت وطن چھوڑ کر پاکستان چلی گئی جب کہ کچھ اپنی دھرتی کے ساتھ جڑے رہے، جو جڑے رہے وہ فرقہ وارانہ ماحول میں محبوس نظر آئے اور جو چلے گئے وہ پرائی دھرتی کو اپنا نہ سکے اور وہاں کے عدم استحکام اور مقامی لوگوں کے تازیانے جھیلتے رہے۔ جن سے ہو سکا انھوں نے مغربی ممالک کی راہ لی۔ اس بارے میں مسرور جہاں فرماتی ہیں:

''اگر آزادی کا پرچم خون کے چھینٹوں سے داغدار نہ ہوتا تو ہم دل کھول کر آزادی کا جشن مناتے۔ لیکن یہاں تو آزادی کے ساتھ ملک کی تقسیم کا المیہ کچھ اس طرح جُڑا ہوا ہے کہ ہم صحیح معنوں میں خوش بھی نہ ہو سکے۔ یہ تقسیم صرف ایک ملک کی تقسیم نہیں تھی۔ یہ تو خاندانوں، گھروں اور دلوں کی تقسیم تھی۔ جو لوگ سرحد کے اس پار چلے گئے .....انھوں نے ہجرت کا کرب سہا۔ جو لوگ یہاں رہ گئے۔ وہ اپنوں کی جدائی میں روتے رہے۔''

اُدھر کچھ لوگ پاکستان میں پیدا شدہ حالات سے گھبرا کر یا پھر بالراست مغربی ممالک کی جانب کوچ کر گئے کیونکہ وہاں معاشی استحکام بھی میسر تھا اور تحفظ بھی۔ تقسیم وطن کے سبب مسلمانوں پر آئی افتاد، اپنوں سے بچھڑنے کا غم، خاندانوں کا بکھراؤ، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، پرانی شان و شوکت کا خاتمہ، یو پی کے جاگیردارانہ نظام کا زوال اور قدروں کا تنزل اور زمین و جائیداد پر جبراً قبضہ مسرور جہاں کے افسانوں کا خام مواد بن گئے۔ بنّو خالہ بٹوارے کے اس درد کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے۔ ان کے علاوہ مسرور جہاں نے کئی ایسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمویا جن سے پسِ آزادی سارا معاشرہ خصوصاً مسلم سماج جوجھ رہا تھا جیسے مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی طبقاتی تفریق (گالی، کم اصل)، ذات پات اور جہیز کی بدعت (کہاں کا

عشق !!، بڑے بھیّا)، آپسی ریس اور دیکھا دیکھی (درد سے دوستی)، پرانی اور روایتی تعلیم کا فضول ہونا، یتیم، غیر ازدواجی اور لاوارث بچوں کے مصائب (کفّارہ ،آواگوَن)، شراب نوشی (وراثت)، سود خوری، کرپشن (من کی آنکھیں، سکھ سنسار) وغیرہ۔ کچھ مثبت موضوعات کو بھی انھوں نے اجاگر کیا ہے جیسے اصول پرستی، ضمیر کا ہوس پر غالب آنا اور خدمت خلق (وراثت) وغیرہ۔

لکھنؤ کی عظمت پارینہ، وہاں کے محلوں اور حویلیوں کی تصویر کشی اور نوابوں ، بیگمات اور ان کے خدمتگاروں کا ذکر کرنے میں مسرور جہاں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ آزادی کے بعد لکھنؤ کے طبقۂ اشرافیہ کی نہ پرانی شان و شوکت رہی نہ ٹھاٹ باٹ ، نہ محل رہے نہ حویلیاں، نہ شکرے نہ بٹیر بازی، نہ طوائفوں کے بالا خانے اور نہ ہی دہلیز پر منتظر نوچیاں۔ تاہم مسرور جہاں اپنے افسانوں میں وہ جہاں آباد کرنے میں کامیاب ہوئیں جو اب خواب بن چکا ہے۔ ان کے یہاں لکھنؤ کی روزمرہ زندگی کی تصویریں، شہر و قصبے کی رعنائیاں، محلات، محل سرائیں، حویلیاں، غلام گردشیں ، دالان، بارہ دریاں ، شہ نشینیں، صحنچیاں، توشہ خانے ، جھاڑ فانوس، محرابیں، شاگرد پیشے، فیل خانے، اصطبل، محلوں کے قصے کہانیاں، نواب و روٴسا کی عشرت سامانیاں، بیگمات کی غیر محفوظیت ، داشتاؤں کی عشوہ سازیاں، لونڈیوں اور باندیوں کے غمزے، گھر آنگن کی تفصیلیں، گھروں کی آرائش، کھان پان کی لطافتیں، کانٹا گلی مچھلی، نیل گائے کے کباب، ورقی پراٹھے اور شاہی ٹکڑے، عورتوں کی سج دھج، مشاطاؤں کی کارکردگی، آرائش و سولہ سنگھار، لباس و ساڑیاں ،گلو بند، ہار، پازیب، کریلیاں، چوڑیاں، بانکیاں، کنگن، انگوٹھی اور مانک موتی جیسے زیورات کی تفصیل ملتی ہے۔ افسانہ 'میاں کی حویلی' ایک ایسی علامتی کہانی ہے جس میں عہدِ ماضی کی شان و شوکت کے مٹ جانے کا نوحہ درج ہے۔ اسلاف کی جائیدادیں بک جاتی ہیں، سونا اگلتی زمینیں بک جاتی ہیں، آم کے باغات بک جاتے ہیں اور ان کے بدلے ملٹی سٹوری عمارتیں کھڑی ہو جاتی ہیں، مال بن جاتے ہیں مگر ناپائیدار ہونے کی وجہ سے زلزلے کے باعث چند لمحوں میں ڈھ جاتی ہیں۔ بقول افسانہ نگار، ''حویلی کے پچھواڑے زیرِ تعمیر بلڈنگ ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ اور میاں کی حویلی اس شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔'' غرض یہ کہ نئی چیزوں ، عمارتوں، قدروں اور تہذیب میں وہ پائیداری نہیں ہے جو پرانی چیزوں میں تھی۔ نوابی کلچر کی جھانکیاں اور ان کے شوق افسانہ 'لیلیٰ مجنوں' میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ طوائفوں کی تہذیبی وراثت کو مسرور جہاں نے اپنے افسانے 'ہم سفر' میں بہت ہی ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔ انھی بالا خانوں پر اشرافیہ تہذیب و تمدن سیکھتے تھے۔ افسانہ 'سہاگن' میں ایک ماں اپنے بیٹے پر لگی نامردی کی تہمت کا ازالہ ایک طوائف سے اس کی دوسری شادی کر کے کرتی ہے کیونکہ طوائف زادی اس کی جنسیت کو بھڑکانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کی عظمت رفتہ کا بیان مسرور جہاں کے افسانوی مجموعہ 'اللہ تیری قدرت' میں اپنے نقطہ عروج تک پہنچتا ہے۔ یہ مجموعہ اس عہد زریں کا آئینہ بن کر سامنے آتا ہے جو ایک زمانے میں لکھنؤ کی تخصیص تھا۔ افسانہ 'اللہ تیری قدرت' میں ایک کاہل مولوی اپنی بیوی اور بچوں کو فراموش کر کے آخر کار بیوی کو اس لیے طلاق دیتا ہے کیونکہ بھوک کی تاب نہ لا کر وہ کسی اور سے مدد لیتی ہے۔ نتیجتاً مددگار خود کو گناہ گار تصور کرتا ہے اور اسے عقد کرتا ہے جس کے بعد کاہل مولوی اسی عورت سے کھانا لینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ 'شب خون' میں ایک ماں بچوں کی خوشی کی خاطر خاموشی اختیار کرتی ہے اور یہ نہیں بتلاتی کہ اس کے سمدھی ہی نے اس کی آبرو ریزی کی تھی۔ اسی طرح اپنی بے جوڑ شادی کا انجام دیکھ کر کہ اس کا خاوند حبشی کنیز کے دام کا گرہ گیر ہوا ہے، افسانہ 'مات' میں ایک بیگم اپنے بیٹے کی شادی ایک کنیز ہی سے کرتی ہے کیونکہ وہ اسے پیار کرتا ہے۔ 'گھٹتے بڑھتے سائے' ایک بہت ہی پر اثر کہانی ہے جس میں ایک لاولد رئیس غریبوں سے ہمدردی کرتا ہے اور اپنی محبت سے ایک سر پھرے لڑکے کو غنڈگی ترک کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ پرانی تہذیب اور قدروں کے بدلے نئے کلچر کے تسلط کی کہانی 'پچھلا دروازہ' میں ملتی ہے۔ مذکورہ مجموعے میں کئی اور اہم موضوعات ملتے ہیں جیسے 'کنجی' میں ہم جنسیت؛ 'نور بے نور' میں عفت کی نگہبانی؛ 'آبرو' میں عصمت باختہ عورت کا انتقام؛ 'اپنا خون' میں مرد کی بے وفائی مگر اس کی بیٹی پر رحم؛ 'یوم حساب'، 'وقت وقت کی بات' اور 'درِ توبہ' میں ایک عورت کی زندگی کے مد و جزر؛ 'مانگے کا اجالا' میں بانجھ پن کا مسئلہ؛ 'دیوار' میں حقیقت سے روبرو ہونا، 'کتنے حج' میں حج کے لیے پائی پائی جمع کی ہوئی رقم سے غریب لڑکی کی شادی کرنا، 'آواگوَن' میں ایک غریب لاولد بچی کی قسمت جاگنا وغیرہ۔

مسرور جہاں کے افسانوں میں غریب مظلوم کسانوں اور مزدوروں کی جدو جہد کی مختلف تصویریں ملتی ہیں کہ کیسے دو وقت کی روٹی کی خاطر انھیں بارہا ذلتیں اور مصیبتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔ غریبوں اور پسماندہ طبقوں پر لکھے گئے ان کے افسانوں کا پس منظر دیہی بھی ہے اور مدنی بھی۔ ان میں کسان بھی نظر آتے ہیں اور مزدور بھی۔ چھوٹے موٹے گھروندوں کی تباہی، قرض کا بوجھ، اپنے کھیت اور مکان تباہ ہوتے دیکھنا، اس کے باوجود سرکاری استحصال اور لام کے لیے بھرتی کرنا، شہروں کی جانب انخلا، مزدوری کرنا، تحت الانسانی ماحول میں گزارا کرنا کئی افسانوں جیسے 'کچّی دیوار' اور 'نئے موسم کی نئی فصل' میں برتے گئے ہیں۔ اس سلسلے کے چند اور موضوعات یوں ہیں: غریب کوڑھیوں کی دل گداز زندگی کی تصویر (وہ ایک بوند)، عبقری اور اصول پسند لوگوں کی سماج میں عدم مطابقت (کہاں ہو تُم !) وغیرہ۔ اجتماعی طور پر مسرور جہاں نے نسلی تصادم اور فرقہ وارانہ فسادات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ملاحظہ کیجیے افسانے 'تجزیہ' اور 'دعا'۔ فرقہ وارنہ تشدد کی زد میں آکر 'گڑیا' کا مرکزی کردار اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور گڑیا کو اپنی بیٹی سمجھ کر اسے گلے لگائے پھرتا ہے۔ اسی فرقہ واریت اور بے گھری کی تصویر 'خواب درخواب سفر' میں بھی ملتی ہے۔ چند ایک افسانوں میں انسانی قدروں کو فرقہ وارانہ ذہنیت پر ترجیح دینے والے کردار سامنے آتے ہیں جیسے 'امام ضامن'، 'نیا سورج' اور 'دعا'۔ مسرور جہاں نے ایک حیرت انگیز کہانی 'قد آور بونے' کے عنوان سے رقم کی ہے جس میں وہی

لوگ جو جھگی جھونپڑی میں رہتے ہیں اور امیروں کی آنکھ کا کانٹا بنے ہوئے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات میں اپنی جان پر کھیل کر انھی پڑوسیوں کی جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں۔انھوں نے کچھ افسانوں میں طبقۂ نسواں کی ناخواندگی، تعلیمی نظام اور اساتذہ کی مالی بدحالی پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً 'چارہ گری' ۔افسانہ 'گیا وقت نہیں' میں وہ بڑھتی آبادی کی جانب بھی اشارہ کرتی ہیں۔

مسرور جہاں کے افسانوں میں عشقیہ موضوعات بھی ملتے ہیں جیسے 'کہاں کا عشق !!'، 'پناہ'، 'روح زخمی زخمی' اور 'درد کا رشتہ' اور دوسری جانب انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں بھی نظر آتی ہیں جیسے 'بڑے بھیا'، 'کچّے پکّے بندھن'، 'انتظار کی صدی' اور 'قفس'۔ ان افسانوں میں کچھ لڑکیوں کے عاشق بچپن میں وعدہ کر کے یا تو پاکستان نقل مکانی کرتے ہیں یا پھر دور مغربی مما لک میں روزی روٹی کمانے چلے جاتے ہیں جب کہ یہاں برہ کی اگنی میں جلتی محبوباؤں کے سر میں چاندی کے تار نمودار ہوتے ہیں۔ 'جلاوطن' کا مرکزی کردار مال و دولت کی چاہ میں زندگی ہی سے بیزار ہو جاتا ہے اور وطن کو بھول جاتا ہے۔مسرور جہاں اپنے کرداروں کا انفرادی و اجتماعی نفسیاتی تجزیہ بھی کرتی ہیں جیسے 'صلیب پر ٹنگی زندگی'، 'گالی'، 'تماشا نہ ہوا' اور 'فرشتہ'۔کہیں کہیں حرص و ہوس میں گرفتار کردار ضمیر کی آواز سن کر بدل جاتے ہیں جیسے 'پرانے چراغ'، 'ڈھیتی بنیادیں'، 'ہم سفر'، 'صلیب پر ٹنگی زندگی'، 'جذبوں کی رہ گزر'، 'حق بہ حق دار'، 'بُرا آدمی' اور 'لُٹیرا' کے مرکزی کردار۔افسانہ 'دریچہ' کی پولیو زدہ اپاہج رانو کی نفسیاتی کشمکش کو بہت ہی دلسوزی سے پیش کیا گیا ہے۔افسانہ نگار کے کئی افسانوں میں روشن ضمیر کردار ملتے ہیں جو ان کی رجائیت پسندی پر لبیک کہتے ہیں جیسے 'نیا سورج' اور 'چراغ پھولوں کے' وغیرہ ۔جنسی کجرویوں خاص کر امرد پرستی کی جانب بھی کچھ افسانوں میں اشارے ملتے ہیں کیونکہ ایسی صفات لکھنوی تہذیب کا حصہ رہی ہیں ۔بہ ایں ہمہ افسانہ نگار ضبط کا دامن نہیں چھوڑتیں اور اپنے لیے ایک حد فاصل کھینچ لیتی ہیں ۔ اس کی ایک خوبصورت مثال افسانہ 'رقیب' میں ملتی ہے جس میں منجھلے نواب ایک لونڈے کو اپنی نفس کی آگ بجھانے کے لیے لاتا ہے مگر اس کی بیگم اسی بچے کو اپنا بیٹا مان کر اس نرک سے بچاتی ہے۔'نامحرم' کہانی ہے اس بے میل شادی کی جس میں فریقین ایک دوسرے سے نفرت کر کے کسی اور کی آغوش گرم کرتے رہتے ہیں۔'ناگ پھنی' میں ایک پروفیسر کی بیوی کو اس کا دوست شہوانی طور انگیز کرتا ہے اور وہ اسی حربے سے اپنے شوہر کی شہوت کو مہمیز کرتی ہے۔افسانہ 'لیلیٰ مجنوں' میں transversitism کو موضوع بنایا گیا ہے۔

افسانہ نگار چنانچہ خود عورت ہیں، اس لیے ان کے یہاں نسوانی مسائل کو فوقیت حاصل ہے۔ وہ خواتین کے دکھ درد کو سمجھتی ہیں اور ان پر بے تحاشا قلم اٹھاتی ہیں۔نرینہ جبری سماج میں وہ عورتوں کی حالتِ زار کو بار بار اجاگر کرتی ہیں۔کہیں کہیں ان کی تحریروں سے اس نرینہ عصبیت کے خلاف بغاوت کی بُو آتی ہے پھر بھی ان کا لب و لہجہ تہذیب و اخلاق کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتا اور معاصر تانیثی رجحان کا آئینہ نہیں بن پاتا (کل کی سیتا، آج کی سیتا)۔دبی دبی زبان میں وہ پدر سری سماج کے خلاف شکایت بھی کرتی ہیں کہ یہ سماج عورت کو دیوی تو مانتا ہے مگر اصل میں اسے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔'ایک آگ کا دریا ہے' میں افسانہ نگار نے خواتین کے مسائل اور زندگی کی حقیقتوں پر روشنی ڈالی ہے۔چنانچہ افسانے کے آخر میں رقم طراز ہیں:

''عورت مرد کی کھیتی ہے، تو اس کھیتی کو زمانے کی گرم ہواؤں سے بچانا اس کا فرض ہے کہ ہر عورت میں آگ کا دریا پار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔'' (ایک آگ کا دریا ہے)

افسانہ 'سچ کے سوا' میں ایک عورت شوہر کے ہاتھوں اپنا استحصال تو برداشت کرتی ہے مگر اپنی بیٹی کا استحصال باپ کے ہاتھوں برداشت نہیں کر پاتی، اس لیے شوہر کو قتل کر دیتی ہے۔'تلاش بہاراں' کا طرزِ انداز قدرے مختلف ہے۔اس میں عورت کے بدلتے روپ اور مرد کی بہیمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اسی طرح افسانہ 'پہچان کا سفر' میں عصمت باختہ عورت فاجر مرد (Rapist) سے انتقام لیتی ہے۔افسانہ 'واپسی' عورت کی خودداری کی کہانی ہے جس میں ریاض بڑی بہن سے محبت کرتا ہے مگر شادی اس کی چھوٹی بہن سے کرتا ہے جو دو بچے چھوڑ کر مر جاتی ہے ۔ریاض واپس آ کر بڑی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ انکار کرتی ہے البتہ اس کے بچوں کو اپنا کر انھیں پالتی ہے۔ افسانہ 'زمین' میں سیٹھ داؤد بچوں کی خاطر ایک غریب سگھڑ لڑکی سے دوسری شادی تو کرتے ہیں مگر وہ ان کے گھر میں مخمل پر ٹاٹ کا پیوند بن کر رہ جاتی ہے اور کوئی اس کو ماں کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس کے مرنے پر بھی کسی غم واندوہ کا اظہار نہیں کیا جاتا۔کثیر الازدواجی کے حوالے سے ایک اور درد انگیز کہانی 'رشتہ' لکھی گئی ہے جس میں پہلی عورت عیاشی کی خاطر اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور وہ ایک غریب لڑکی سے شادی کرتا ہے جو اس کی لڑکی کی عمر کی ہوتی ہے۔منکوحہ اس رشتے کو بیان نہیں کر پاتی اور عمر بھر ذلت کی زندگی جیتی ہے۔کہانی 'بشارت' میں افسانے کا مرکزی نسوانی کردار روحانی طور پر بصیرت و بصارت دونوں سے سرفراز ہوتا ہے۔مسرور جہاں کے افسانوں میں خواتین سے جڑے اور بھی کئی مسائل ہیں جنھیں وہ بڑی ہنروری سے پیش کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں جیسے سوسائٹی میں بڑھتی ہوئی جہیز کی لعنت اور لڑکیوں کی نمائش کا چلن (چارہ گری)، مرد اور عورت کی عمروں میں تفاوت ('کل کی سیتا، آج کی سیتا'، 'روح زخمی زخمی' اور 'میں نے کچھ نہیں دیکھا')، عہد طفلی میں شادی کرنے کا رواج اور دھوکہ دھڑی ('عورت'، 'پتھر کی لاش'، 'مات'، 'دستک') ، ناخواندگی ، بانجھ پن، لڑکوں کو لڑکیوں پر تعلیم اور جائیداد میں ترجیح (کھوٹا سکّہ)، گھریلو تشدد (وقت وقت کی بات، وراثت)، بہوؤں کو جلانا، کثیر الازدواجی (سہاگن)، خواتین کی حاشیہ سازی (یہ میرے خواب)، بیوگی (پچھلا دروازہ)، مغرب زدگی کا کھوکھلا پن (تلاش) اور ملازمہ کی نمک حلالی (صلہ)۔ دوسری جانب افسانہ نگار ان بد قماش عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتی جو شہوت کا شکار ہو کر

اپنی زندگی تباہ کرتی ہیں (مول انمول)۔افسانہ 'ہمیں جینے دو' میں منفرد اسلوب میں افسانہ نگار نے باضابطہ اسقاطِ حمل کرانے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔نسوانی مسائل کے حوالے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ کیسی عجیب سی بات ہے کہ عورت اپنے شریکِ سفر سے محبت تو کرتی ہے، اس کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتی ہے، لیکن اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا نہیں سمجھتی، اور جس ننھی سی جان کو اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر بڑا کرتی ہے اس کو مضبوط سہارا بھی سمجھتی ہے۔(کہاں ہو تم!)

☆ دراصل زندگی وہ ہوتی ہے جو لڑکی اپنے ماں اور باپ کے گھر میں ہنسی خوشی گزارتی ہے-اور موت.........؟ موت دراصل نام ہے، شادی کے بعد والی زندگی کا- جہاں لڑکی ہر لمحہ- ہر پل مرتی رہتی ہے۔ اس موت کا خاتمہ کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ اور لوگ زندگی کے پردے میں موت کا سودا کر بیٹھتے ہیں- کہ وہ زندگی کے نہیں بلکہ موت کے سوداگر ہیں۔'' (چارہ گری)

عمر رسیدہ لوگوں کے عدم تحفظ پر بھی مسرور جہاں نے قلم اٹھایا ہے۔ان کے کئی افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کی نسل کس قدر زر پرست بن چکی ہے، وہ اپنے والدین کو زندگی کے آخری ایام میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے۔ بڑھاپے میں چڑچڑاپن اور غیر محفوظیت کا احساس عود کر آجاتا ہے مگر ان کے بچے یہ سب سہنے کو تیار نہیں ہوتے۔اس حوالے سے کئی افسانے جیسے 'بیساکھیاں'، کرن پھول، تم بھی، آوازیں، گوشۂ عافیت وغیرہ قلم بند کیے گئے ہیں۔افسانہ 'سویٹ ہوم' بہت ہی دل گداز افسانہ ہے جس میں سابقہ یتیم اولڈ ہوم سے ایک مرد اور عورت کا انتخاب کر کے انھیں گھر میں آسودگی سے رکھتا ہے مگر جونہی انھیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ ان کی وجہ سے اپنی گرہستی نہیں بسانا چاہتا تو وہ چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔آخری عمر میں رفیقِ حیات سے بچھڑنے کا غم' تنہائی کا درد' میں بڑی ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔'فرصت کے رات دن' ظریفانہ انداز میں لکھا گیا افسانہ ہے جس میں ریٹائرڈ آدمی پر سبھی طرح کے فالتو کام لاد دیے جاتے ہیں کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے پاس اب کوئی کام نہیں ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

☆ ''رحمٰن بھائی! اتنے بڑے گھر میں ایک گوشۂ عافیت اپنے لیے ضرور رکھیے۔تاکہ جب لڑکوں کو اپنی فیملی کے لیے یہ گھر تنگ معلوم ہو تو آپ یہاں رہ سکیں۔کیونکہ ایک وقت زندگی میں ایسا بھی آتا ہے جب والدین خود کو سمٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اور گھر میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔'' (گوشۂ عافیت، ص ۱۵۳)

مسرور جہاں کی بیشتر کہانیاں بقائے باہمی، انسانیت اور ہمدردی کا آئینہ ہیں۔ان کا سیکولر مزاج اور امن پروری انھیں کسی بھی طرح کے تشدد پر لبیک کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔'دھوپ دھوپ سایہ' ایک ایسی کہانی ہے جو ہمیں رابندر ناتھ ٹیگور کے 'کابلی والا' کی یاد دلاتی ہے۔ایک کشمیری پھیری والا علی محمد بٹ گھر گھر شال بیچتا ہے کہ اس کی ملاقات ایک عورت سے ہوتی ہے جس کو وہ اپنی بہن بناتا ہے اور اس کی بچیوں سے گھل مل جاتا ہے۔وہ اس کے لیے طرح طرح کے کڑھائی دار شال لے کر آتا ہے مگر اچانک بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ قیمتی جامہ وار شال نہیں خرید پاتی۔اس کی بڑی بیٹی کی شادی طے ہوتی ہے اور بیٹی علی محمد کو بحیثیت ماموں اطلاع دینا نہیں بھولتی۔اپنی واماندگی، غربت اور بیوی کی موت کے باوجود علی محمد بٹ شادی سے دو روز پہلے حاضر ہوتا ہے اور ماما کے فرائض انجام دیتا ہے۔ساتھ ہی وہ شادی پر بیٹی کو جامہ وار شال بطور تحفہ پیش کرتا ہے۔افسانہ نگار نے شال فروش کے کشمیری لہجے کو نقل کر کے مکالمہ میں جان بھر دی ہے۔

افسانہ 'جڑیں' میں ایک والد اپنے بیٹے کو ہی گھر سے نکال باہر کرتا ہے مگر صحن میں کھڑے نیم کے پیڑ کو کاٹنے کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ اس کی پوروجوں کی اساس ہے جس کی رکھوالی کرنا اس کا فرض ہے۔'دو ہاتھ' ایک اہم سبق آموز کرداری افسانہ ہے جس میں خداداد قابلیت کی مالک ایک دائی کو اپنے ہنر پر غرور ہو جاتا ہے اور وہ رات کے وقت ایک زچہ کی تیمارداری کرنے سے انکار کرتی ہے مگر کچھ ثانیوں بعد اس کا ضمیر اسے کچوکتا ہے اور وہ آدھی رات گھر سے نکل کر اس عورت کو زچگی سے آزاد کراتی ہے۔کہانی 'حسب نسب' بھی ایک خوبصورت کہانی ہے جس میں ایک پادری اپنے بیٹے کو حاملہ محبوبہ کو منجھدار میں نہ چھوڑنے کی تلقین کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ وہ خود ایسی ہی ایک کنواری لڑکی کی اولاد ہے جس کو اس نے اپنے لڑکے کی طرح پالا۔افسانہ 'تُم!' تزویج محرمات پر لکھا گیا بہت ہی بولڈ افسانہ ہے کہ ایک عیاش باپ کو اس کے فارم ہاؤس میں اس کی اپنی بیٹی سپلائی کی جاتی ہے۔جہاں تک مجھے یاد ہے یہ ایک سچے واقعے پر مبنی کہانی ہے۔'پتھر کی لاش' ایک ایسی بے نفس اور ایثاریت پسند عورت کی کہانی ہے جو دوسروں کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرتی ہے مگر وقتِ ضرورت اس کا بوجھ کوئی اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔افسانہ 'شناسائی' معاصر زندگی کو آئینہ دکھاتا ہے کہ موڈرن سوسائٹی میں کیسے انسان کو اجنبیت اور مغائرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اپنے افسانوں کے بارے میں مسرور جہاں فرماتی ہیں:

'میں یہ دعویٰ نہیں کر رہی ہوں کہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے میرے افسانے منفرد ہیں۔لیکن میں نے اپنے موضوعات سے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔'' (پیش گفتگو، پُل صراط)

بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''اسلوب کی اساس دراصل زبان پر ہے، نہ مصنف پر نہ موضوع پر''۔مسرور جہاں کی کہانیوں میں لکھنوی زبان کی شیرینی اور نزاکت شروع سے آخر تک ملتی ہے۔بیگماتی اور بامحاورہ زبان کا لطف لینا ہو تو مسرور جہاں کو پڑھیے۔بیانیہ اندازِ تحریر، موئے قلم سے پیکر تراشی، مکالموں کی ادائیگی میں الھڑپن- قاری کو ایسا لگتا ہے کہ وہ خود اس واقعے کو جی رہا ہے۔ان کی کہانیوں میں وحدت تاثر برقرار رہتا ہے۔مسرور جہاں کی تحریروں پر عینیت پسندی غالب نظر آتی ہے۔ملاحظہ کیجیے افسانے 'مانگے کا اجالا'، 'من کی آنکھیں'،

دیوار، 'قفس'، 'گیا وقت نہیں' اور 'موری کی اینٹ'۔ ان کے یہاں جذباتیت نہیں ملتی بلکہ وہ آہستہ روی سے گھر گرہستی کی تصویریں کھینچتی چلی جاتی ہیں۔ چند ایک افسانوں میں انھوں نے جدید اسلوب اور خود کلامی کو اپنایا ہے جیسے 'چوتھی سمت'، 'تاریکیوں کے بعد'، 'جائے اماں' اور 'درد سے دوستی'۔ کہیں کہیں علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے مثلاً 'کرن پھول' میں چابی، 'جڑیں' میں نیم کا پیڑ، 'بوڑھا یوکلپٹس' میں یوکلپٹس، 'ناگ پھنی' میں ناگ پھنی وغیرہ۔ افسانہ 'ان دیکھا ہاتھ' میں تجریدی انداز اپنا کر جہاں اصلی مجرم ڈھونڈنے کی کوشش ہوتی ہے وہیں باطن کی نقاب کشائی بھی ہوتی ہے۔ 'چراغوں کا سفر' کا بیانیہ (Narrative) بھی کچھ مختلف سا ہے جس میں راوی اس عقل وادراک کا متمنی ہے جس سے دنیا میں امن وآشتی پھیل سکے۔ افسانہ نگار نے خود کو کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں کیا البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں مقصد کی کارفرمائی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ نگار کے یہاں ہندی اور مقامی بولی کی آمیزش بھی ملتی ہے جو اردو لغت کو مزید وسعت دینے کا کام کرتی ہے۔ وہ بعضے طنز وظرافت کا بھی استعمال کرتی ہیں جو حساس ذہنوں کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ کہیں کہیں کچھ غلطیاں بھی در آئیں ہیں مثلاً ریگ زار میں چنار نہیں اُگتے ('کل کی سیتا، آج کی سیتا' ص ۱۳۴)۔ اسی طرح یوکلپٹس کی عمر اتنی لمبی نہیں ہوتی جتنی ظاہر کی گئی ہے، شاید یہ افسانہ کرشن چندر کے افسانے یوکلپٹس کی ڈالی سے متاثر نظر آتا ہے۔ کتابوں میں پروف ریڈنگ کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔

مسرور جہاں افسانے کی ابتدا عموماً کسی منظر یا واقعے کے بیان سے کرتی ہیں۔ یہ بیان اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ قاری پوری کہانی پڑھنے کے لیے بے چین ہوجاتا ہے۔ کہیں کہیں افسانہ نگار مکالمے سے بھی اپنے افسانے کی شروعات کرتی ہیں۔ چند افسانوں کے ابتدائیے:

☆ میرا نام سیتا ہے۔ 'ستی ساوتری' والی نہیں، صرف سیتا۔ میں ایک آزاد ملک کی عورت ہوں (کل کی سیتا، آج کی سیتا)

☆ پہلی بار اماں کی شربتی آنکھوں میں سفید بادل کے پرے اس دن اترے جب ان کی گود کے پالے سرحد پار کر کے اجنبی ملک سدھارے تھے۔ (کرن پھول)

☆ خبر تھی یا نیزہ کی انی..... جس نے کلیجے کو چھید کر رکھ دیا.......اور وہ تڑپ اٹھیں۔ (مات)

☆ ''ممی.... پاپا اسکول آئے تھے۔'' بنّی نے سیب کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اور کرن کا ہاتھ کانپ گیا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟ لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں...بس پیار کیا اور چلے گئے۔'' (ساتھ ساتھ)

افسانے کے انجام میں بھی افسانہ نگار مختلف طریقے استعمال کرتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں افسانوں میں 'دُم کے ڈنک' (sting in the tail) کا عام چلن تھا، اس لیے مسرور جہاں نے بھی اس روش کو اپنے بیشتر افسانوں میں اپنایا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ 'بھرم' میں بستر مرگ پر لیٹی عورت اپنے شوہر کو یہ کہہ کر چونکاتی ہے کہ جو کنگن اس نے چوری کیے تھے وہ دراصل پہلے ہی بدل دیے گئے تھے اور ان کی جگہ نقلی رکھ دیے گئے تھے اور اب جو کنگن وہ اسے پہنانے کے لیے کہتی ہے وہ اصلی سونے کے ہیں۔ چند اور افسانوں کے خاتمے ذیل میں درج ہیں:

☆ شہزادو میاں کی تدفین کے بعد جب سب لوگ رخصت ہو کر چلے گئے، تو چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت قبر کے نزدیک آئی۔ اور اپنی کلائیوں میں پڑی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کو قبر کے سرہانے توڑنے لگی۔....اس کے سہاگ کی واحد نشانی۔ بس یہی چوڑیاں تھیں۔ جنھیں توڑ کر اس نے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی آخری کوشش کی تھی۔.....یہ ماہ رخ تھی.....شہزادو کی بیاہتا......ایک کنواری سہاگن۔ (سہاگن)

☆ ہاں! رحمان چچا ابّا کے سگے بھائی تھے۔ لیکن دادا ابّا کی ناجائز اولاد اور اسی لیے ساری زندگی دادی اماں کے عتاب کا شکار رہے۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری لمحات میں دادی امّاں نے اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ رحمان چچا کو بیٹا کہہ کر، بیٹا مان کر.....اور ان کا حق تسلیم کر کے.....رحمان چچا اب بھی رو رہے تھے۔ شاید دادی اماں کا یہ کرم ان سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔

مسرور جہاں کے کردار مختلف مذہبوں اور طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ اکثریت مسلم فرقے خصوصاً شیعہ مسلک سے وابستہ لوگوں کی ہے۔ افسانہ نگار ان کی نفسیات کا دقیقہ شناسی سے مشاہدہ کرتی ہیں اور کردار کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتی ہیں۔ 'دو ہاتھ' ایک کرداری افسانہ ہے جس میں دائی عزیزن بوا کا مدوّر کردار فطری ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ 'پچھتر برس کی ایک لڑکی' بھی ایک کرداری افسانہ ہے جو نوابی فیملی کی ایک لڑکی کی زندگی کو درشاتا ہے۔ اس افسانے میں امّی کی سراپا نگاری بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ 'دھوپ دھوپ سایہ' میں ایک کشمیری پھیری والے علی محمد بٹ کا کردار بہت ہی متاثر کن ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی مشاقی سے اس کردار کا مشاہدہ کیا ہے اور ہنرمندی سے ایسے نیک سیرت کردار کو افسانے کی زینت بنایا ہے۔ اسی طرح کرداری افسانے 'بند گلی کا آخری مکان' میں شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والی لکھنؤ کی ایک طوائف کی زندگی کے نشیب و فراز اور فلموں میں اس کے استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔ 'من کی آنکھیں' کا کانتا سنگھ، 'یوم حساب' کی پراسرار نسیمہ، 'نامحرم' کی مہتاب دلہن اور 'مات' کی حشمت زمرد، 'پھاٹک والی اتا' کی اتا بھی متاثر کرتے ہیں۔

منظر نگاری میں بھی مسرور جہاں اپنے قلم کا کمال دکھاتی ہیں۔ منظر نگاری کرتی ہیں تو لگتا ہے کوئی ڈوکیومنٹری شوٹ کر رہی ہیں وہ چاہے ماضی کے کوٹھے ہوں یا پھر حال کا پڑوس۔ ان کی نگارشات پر کرشن چندر کی رومانی حقیقت نگاری کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے۔ 'نئے موسم کی نئی فصل' میں بدلتے موسموں کے مناظر، 'یہ میرے خواب' میں ایک متوسط عورت کے تصوراتی گھر کی کلپنا، 'پہچان کا سفر' میں

ریپ کا منظر؛ 'جڑیں' میں نیم جیسے کڑوے پیڑ کا شیریں بیان، 'نشانی' میں کھنڈر ہوئے گھر کی عکس ریزی، 'پتھر کی لاش' میں پلاسٹر میں جکڑی ہوئی عمر رسیدہ عورت کی حالت زار، 'یوم حساب' میں فلم جانے کی تیاریوں کا خاکہ، 'کم اصل'، 'پھول کی پتّی، ہیرے کا جگر' اور 'موری کی اینٹ' میں کبوتر پالنے، ان کی قسمیں اور کبوتر بازی کا بیان، 'دستک' اور 'دریتوبہ' میں محل کا شروعاتی منظر، 'گھٹتے بڑھتے سائے' میں محل سرا کی عظمت رفتہ کی عکاسی، 'بنجر زمین کا درد' میں لکھنؤی آموں کا بیان، 'لیلیٰ مجنوں' میں نواب صاحب کی بیٹھک کی تصویر کشی اور 'بہتر برس کی ایک لڑکی' میں گھر گرہستی کا بیان قاری کے دل کو موہ لیتا ہے۔

مکالمے کی بات کریں تو اس کی ایک ہی مثال مسرور جہاں کی افسانوی کائنات کو جاننے کے لیے کافی ہوگی۔ افسانہ 'دھوپ دھوپ سایہ' میں ایک کشمیری شال فروش کی گفتگو یہاں پر بطور نقل کرتا ہوں جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں کرداروں کی صحیح بولی کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے، انجام کاران کے افسانوں کی اثر انگیزی دوبالا ہو چکی ہے۔

''ارے اتنا فس کلاس شال ہے اور آپ بولتا کہ بس ٹھیک ہے۔ کمال ہے آپا جان.....اچھا.....آپ اس کے دوسو پچہاتر (۲۷۵)...روپیہ دے دو...اب کچھ نہ کہنا آں...اپنا کشمیری بھیّا کی بات مان لو...تم کو بہوت ستا دے دیا..ام تو لٹ گیا سمجھو آپا جان''

آخر میں چند افسانوں کے اقتباسات درج کرتا ہوں جو مسرور جہاں کے فکر وخیال کی آئینہ داری کرتے ہیں:

☆اخبار کا انتظار۔ کلّو جمعدار کا انتظار۔ خادمہ للّی کا انتظار۔ انتظار کا دکھ چھوٹے چھوٹے سکھ بھی دیتا ہے۔ ہے نا عجیب بات لیکن یہی سچ ہے۔ (آوازیں ۱۱۵)

☆جو کام عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے اس کا صلہ بھی انسان کو اس کی امید سے زیادہ ہی عطا ہوتا ہے۔ (دو ہاتھ ص ۱۸۷)

☆جب روح زخمی ہو تو جسم کے گھاؤ زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ (تلاش بہاراں)

☆عورت کو زندگی کا سارا سکھ مل جاتا ہے تو پھر بھگوان کی یاد ستاتی ہے۔ (تُم!)

☆وہ کبھی ماں بن کر اسے لوریاں سناتی ہے۔ اور کبھی امر بیل کی مانند اس سے لپٹ کر اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے کہ عورت مرد کی تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی تکمیل بھی۔ (تلاش بہاراں)

☆ہاں۔ یہ جو جھلسی ہوئی دیواریں۔ اور شکستہ ستون نظر آرہے ہیں۔ کل تک یہ ہماری درسگاہ تھی۔ مادر علمی۔ جہاں ہمارے مہربان استاد برسوں کی ریاضت سے حاصل کیا ہوا علم قطرہ قطرہ کر کے ہمیں پلاتے تھے۔ یہاں ملک کے بہترین دماغ بڑی کد و کاوش سے شاعر و ادیب۔ دانشور اور سائنسدان۔ اور بہترین انسان تخلیق کرتے تھے۔ لیکن جب ہم علم کی گٹھری سنبھالے یہاں سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ وہ سارے سبق جو اس درگاہ میں پڑھائے گئے تھے۔ عملی زندگی میں ان کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ سرے سے ان کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ وہ عالم وفاضل استاد کتنے نادان تھے۔ (چراغوں کا سفر)

☆کس کو اس علمی ذخیرے کی بربادی پر ندامت نہیں ہے۔ ہم نے یہاں بیٹھ کر 'ہر اِزم' کا مطالعہ کیا تھا۔ آخر میں راز کھلا کہ سب بکواس تھی۔ سب ڈھکوسلہ تھا۔ انسان کو کسی 'اِزم' کی نہیں دو وقت کی روٹی کی ضرورت ہے۔ یہ کتابیں کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتیں۔ ان کے مطالعہ سے اچھا بھلا دماغ اُلٹ جاتا ہے۔ بڑے بڑے فلاسفروں کی تھیوریاں جب تک کتابوں کی زینت بنی رہیں۔ بہت خوبصورت لگیں۔ لیکن جب ان تھیوریوں کو زندگی میں برتنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ سب جھوٹ اور فریب کا پلندہ تھا۔ نری بکواس تھی۔'' (چراغوں کا سفر)

☆

- بقیہ -

خواب در خواب سفر

بیٹے کی قبر پر مٹّی ڈال کر وہ تھکے تھکے قدموں سے اس چار دیواری کی طرف چل پڑا۔۔۔ جس کو اس نے اپنا گھر سمجھا تھا۔۔۔ لیکن آگ کے شعلوں نے اور گاڑھے سیاہ دھوئیں نے اس گھر کو چھپا لیا تھا۔ نفرت اور تعصب کی آندھی نے تنکا تنکا کر کے بنایا ہوا آشیانہ ایک پل میں جلا کر خاک کر دیا تھا۔۔۔ کچے آنگن میں دھانی کریلیاں اور سنہری بانکیں کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی تھیں۔۔۔ وہ سانولا اور گداز ہاتھ جھلس گیا تھا۔۔۔ جس نے اسے سہارا دیا تھا اور نئی زندگی کی اجنبی راہوں پر اس کا ساتھ دیا تھا اور اب وہ لق ودق۔۔۔ بے آب وگیاہ صحرا میں تنہا کھڑا تھا۔

خواب در خواب ایک سفر تھا۔۔۔ مسلسل سفر۔۔۔ لیکن منزل اب بھی دور تھی اور اس کے پاؤں چلتے چلتے شل ہو چکے تھے۔۔۔ اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو کر اس کی آنکھوں میں چُبھ رہے تھے۔ لہو رنگ آنکھوں میں سارے منظر سُرخ ہو گئے تھے۔ اس نے تھکن سے بے حال ہو کر آنکھیں موند لیں۔۔۔ بند پلکوں تلے کوئی خواب نہیں تھا۔۔۔ کوئی رنگ نہیں تھا۔ بس چند آنسو تھے۔۔۔ جو اس سے بغاوت کر کے پلکوں سے باہر آ گئے تھے۔ اور وہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیا۔۔۔ یہ اداس سی مسکراہٹ اس کی ساری زندگی کے خوابوں کی تعبیر ہی تو تھی کیونکہ اسی مسکراہٹ پر اس کے سفر کا اختتام ہو چکا تھا۔

سماجی حقیقت نگاری

وقار ناصری
(لکھنؤ، بھارت)

دبے کچلے اور نادار لوگ اس معاشرے کی حقیقت ہیں۔ یہ تو اس دن بھی موجود تھے جب انسانی معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ دنیا کے حصول کا دیرینہ خواب چاہے جس عمل کی بشارت ہو مگر ان کے وجود کی پیچیدگیاں ویسے ہی شہر نا پُرساں کا نوحہ بنتی ہیں۔ سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے ردوبدل کے باوجود یہ تبدیلیاں کوئی ایسی تبدیلیاں نہ تھیں جو ان کے لیے سازگار رہی ہوں۔ ان کا ہونا یا نہ ہونا جو کچھ تھا بس اتنا ہی تھا کہ وہ اپنے وجود کو تھپیڑوں سے بچاتے رہیں جو انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ وقت کے بہتے دریا میں ڈوبتے اُبھرتے یہ لوگ صدیوں سے اسی سماج کا حصہ ہیں۔۔۔؟

مسرور جہاں کا ناول ''نئی بستی'' ایسے ہی کرداروں کی کہانی ہے۔ قصہ در قصہ یہ سارے کردار بظاہر اپنی اپنی کہانی رکھتے ہیں مگر یہ ساری کہانیاں ایک ہی کہانی کے مختلف روپ ہیں۔

شہر کے ایک غیر آباد مگر آبادی کے قریب سناٹے میں گنگا دین کے چند کھیت ہیں جن کے سہارے وہ کسی طور پر جینے کے بہانے رکھتا ہے۔ پاس ہی ایک قبرستان، پیر کا مزار، اکھاڑا اور ریلوے لائن ہے۔ سامنے ہی سڑک کے دوسری طرف کچھ فاصلے پر ایک شاندار کالونی ہے۔ جہاں بڑے لوگوں کے فلیٹ اور بنگلے ہیں، گنگا دین نے جب سنا کہ سڑک کے آس پاس کی زمین اور اس کے کھیت سرکاری اسکیم میں آ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دادا، پردادا کے زمانے کی یہ زمین جو اب اس کی ملکیت ہے سرکار کیوں کر لے سکتی ہے۔ مگر سرکار تو سرکار ہے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے، آخر یہ سوچ کر کہ اب یہ کھیت اس سے چھن ہی جائیں گے، گنگا دین غریب، مزدور پیشہ اور چھوٹے موٹے روزگار کرنے والوں کو اونے پونے داموں پر زمین کو ٹکڑا ٹکڑا کر کے بیچ دیتا ہے۔ ''دیہاتوں سے روزگار کی تلاش میں آنے والے غریب اور مزدور پیشہ لوگ اس بستی کو جنت سمجھنے اور گنگا دین کو دعائیں دیتے تھے۔

''نئی بستی'' اس بستی کا نام خود بخود پڑ گیا حالانکہ یہاں کے رہنے والے سب اس پرانے سماج کے پرانے لوگ تھے۔ نئی یہاں کوئی بات بھی نہیں تھی۔ نہ غریبی، نہ جہالت، نہ غنڈہ گردی، نہ برائیاں اور نہ بیماریاں۔ اونچے طبقے کی ہر بات اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے ہی پوشیدہ رہتی ہے۔ لیکن چھوٹے گھروں کی ہر اچھی بری بات جھٹ سے باہر آ جاتی ہے۔ ان چھوٹے گھروں میں کسی بات کی سمائی نہیں ہوتی۔ لہٰذا سوال اچھائی برائی کا نہیں ہے۔ بات تو محض چھپنے اور کھلنے کی ہے۔ ورنہ اونچی دیواروں کے پیچھے ہر برا کام دھڑلے سے ہوتا ہے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں کے بیڈروم میں شوہر کے علاوہ بھی کئی لوگ جا سکتے ہیں اور اونچی سوسائٹی اور نئی تہذیب کے نام پر شوہر چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ایسی بستیوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی عورت اپنے آشنا کے ساتھ پکڑی جاتی ہے اور مرد کی مار کھا کر بے دم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ''نئی بستی'' بھی اسی طرح کی ساری برائیوں اور اچھائیوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں بسنے والے مرد اور عورت اس دنیا میں کوئی خاص کارنامہ بھی انجام دینے نہیں آئے ہیں۔ وہ تو بس اپنے ماں باپ کی حرام و حلال کے ثبوت بطور پیدا ہو گئے تھے اور جو جو کارنامے یہ لوگ انجام دے رہے تھے۔ وہ ان کے سوا کوئی اور انجام بھی نہیں دے سکتا تھا۔

جن ساری ضرورتوں یا ڈھکی چھپی خواہشوں نے اس بستی کو آباد کیا وہ تو وہی تھیں جو ازل سے آدمی کا مقدر ہیں مگر اس کے پیچاک کی گرہیں کھولنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے اس بستی اور اس کے رہنے والوں نے جو طریقے اختیار کیے وہ چاہے جیسے ہوں مگر ان کے وجود کی پیچیدگیوں کو ان سے الجھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گنگا دین، استاد محمد بھائی، بنسی، زیبن، دین محمد، چھوٹے لال، رمضان میاں، شرفو، جبار، امینہ، نورن، کانتی، رجو، سنتو، شمشاد، پردیپ، دلّن، زلفی میاں تو محض نام تھے اس بستی کی پرچھائیوں کے ورنہ ان کی شناخت زندگی کا ایک بے نام تماشا تھا۔

اس بستی کے تمام رہنے والوں کی اپنی اپنی کہانیاں تھیں۔ وقت اور حالات کے مارے ہوئے یہ لوگ جانے کب سے اپنی اپنی کہانی دہراتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں وہ زیبن بھی ہے جو دین محمد رکشہ والے سے پیار کرتی ہے اور اس سے شادی کر کے خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کرتی ہے اور وہ خیرن بھی جو بن بیاہی ماں بن کر دو جڑواں بچوں کو جنم دیتی ہے۔ زیبن جس کا بچہ پیٹ ہی میں ختم ہو گیا تھا اس کے ایک بچے کو لے کر یہ سوچے بغیر کہ وہ حرام کا جنا ہے اسے پا کر اس طرح نہال ہو جاتی ہے جیسے اسی نے اس بچے کو جنم دیا ہو۔ یہاں وہ رجّو بھی ہے جو اپنے تن کا سودا کرتی رہتی ہے اور نورن جیسی لڑکیوں کو اس دلدل میں دھکیلنا چاہتی ہے جس میں وہ خود دھنسی ہوئی ہے۔ یہاں شامو جیسا شرابی بھی ہے جو نشے میں گالیاں بکا کرتا ہے لیکن زیبن کے بھائی کو ڈوبنے سے وہی بچاتا ہے۔ شمشاد جیسا بدمعاش بھی اسی بستی میں رہتا ہے جو چائے کے ہوٹل پر کام کرنے والے سنتوں کو اپنی ہوس کا شکار بنا لیتا ہے اور جسے قتل کر کے پردیپ جیل چلا جاتا ہے۔ موٹر گیرج میں کام کرنے والا جبّار اپنی بیوی امینہ کو گاؤں میں چھوڑ کر دُکھی رہتا ہے کیونکہ اس کے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ جب اسے ٹھکانہ ملتا ہے تو گاؤں جا کر امینہ کو لے آتا ہے۔ یہ اس کانتی کی بھی کہانی ہے جو بچوں کے اسکول کے سامنے ٹھیلے پر بیٹھی رہتی ہے۔ اس کا بچہ بھی اس سے بچوں کو اسکول جاتے دیکھ کر ماں سے ضد کرتا ہے کہ اس کا بھی نام اسکول میں لکھا دیا جائے۔ وہ پڑھنا چاہتا ہے۔ کانتی کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ بچے کو پڑھا سکے مگر وہ بچے کی ضد سے ہار جاتی ہے اور اسکول کے

چوکیدار اور شنکر دادا کی مدد سے شامو کا داخلہ کرا لیتی ہے۔ یہ رحیمن اور اس کے شرابی بیٹے دلن کی بھی کہانی ہے جو نشے میں ٹرک سے گر کر مر جاتا ہے۔ دوسرے کرداروں کے علاوہ چپ شاہ کے مزار پر بیٹھنے والے زلفی میاں اس بستی کا ایک اور کردار ہیں جو دعا تعویذ کرتے کرتے اس قابل ہو گئے کہ ان کا مکان پختہ ہو گیا۔ بچے اچھے اسکول میں داخل ہو گئے اور ان کے گھر کے دروازے پر موٹریں کھڑی رہتی ہیں۔

ایک روز کچھ مزدور ٹھیلے پر ایک بڑا سا بورڈ لے کر آئے اور سڑک کے کنارے ذرا سا پیچھے ہٹ کر دو بلّیاں گاڑیں اور بورڈ لگا دیا۔ جن لوگوں کو ہندی پڑھنا آتی ہے انہوں نے بورڈ کی عبارت پڑھی اور جن کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا انہوں نے دوسروں سے پڑھوایا۔ یہ بورڈ ایل ڈی اے کی طرف سے لگایا گیا تھا۔ بورڈ کے ساتھ آنے والے آدمی نے بتایا کہ یہاں کالونی بنے گی۔ وہ لوگ تو اپنا کام ختم کر کے چلے گئے لیکن سارے دکاندار، کارخندار، بانس بلّی والے اور بستی والے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ:

''اگر یہاں کالونی بنے گی تو ہم کہاں جائیں گے۔''

یہ کچّے پکّے مکان اور جھونپڑے ان میں رہنے والے سینکڑوں خاندان، بچے، بوڑھے اور جوان کہاں رہیں گے۔ ان کا جو پیسہ یہاں زمین خریدنے اور مکان بنانے میں خرچ ہوا ہے وہ کون دے گا؟

''نئی بستی'' کوئی نئی بستی نہیں ہے۔ اس طرح کی بستیاں ہر پھیلے شہر میں آئے دن آباد ہوتی رہتی ہیں۔ سرکار کو جب اپنی ضرورت کے لیے زمین کی تلاش ہوتی ہے تو اس کی نظر ان بستیوں پر پڑتی ہے۔ سرکاری حکام اور پولیس کے دستے انہیں اُجاڑنے آ جاتے ہیں۔ ''نئی بستی'' کے لیے بھی یہ فرمان ہو چکا ہے۔ گنگا دین سرکار سے مقدمہ لڑ رہا ہے مگر اس کا نتیجہ؟ پی اے سی کے ٹرک اور بے دخلی کی کارروائی۔

اس روز سارا دن دکانداروں میں یہی باتیں ہوتی رہیں۔ ''نئی بستی'' میں بھی اس واقعے کو لے کر کافی جوش و خروش نظر آ رہا تھا۔ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ غرض دن اس طرح بیتا، شام ہوئی، رات اُتری، صبح ہوئی اور بستی کی زندگی معمول کے مطابق شروع ہو گئی۔ مرد کھا پی کر کام پر چلے گئے۔ بچے گلیوں میں رُلنے لگے۔ عورتیں گھر کا کام ختم کر کے ایک دوسرے کے گھروں میں جھانکنے لگیں اور تیرے میرے عیب و ثواب گنوانے لگیں۔ ریلوے لائن پر ٹرینیں چھک چھک کرتی گزرتی رہیں۔ سید شہید بابا کے مزار پر ہوا سرگوشیاں کرتی رہی۔ قبرستان میں بستی کے بے فکرے بیٹھے تاش کھیلتے رہے۔ زندگی کا ایک دن اور گزرنے لگا۔ پھر شام ہو گی، رات اترے گی اور صبح پھر زندگی جاگ اٹھے گی۔ آنے والے کل کی فکر سے لاپرواہ اور بے خبر۔ ایک دن اور بیت جائے گا اور ایک ایک کر کے دن اسی طرح بیتتے رہیں گے۔ کوئی تبدیلی نہیں، کوئی نیا پن نہیں، بس نیا پن اُس دن ہو گا جب ایل ڈی اے کے ٹرک مزدور اور بلڈوزر لے کر بستی پر چڑھ دوڑیں گے۔

ساری بستی اس دن کے انتظار میں وقت کاٹ رہی ہے۔ کب آئے گا وہ دن؟ کب آئے گا؟ جو کبھی نہ آتا۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اسے تو آنا ہے۔ قیامت کے دن کی طرح وہ بھی ایک روز اچانک ہی آ جائے گا اور نئی بستی پر سچ مچ قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ لیکن اس قیامت کا انتظار بھی تو کسی قیامت سے کم نہیں ہے؟ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں شہر کی بے نام بستیوں جنہیں غیر قانونی کہا جاتا ہے کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بستیاں کیونکر آباد ہوتی ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کی زندگی اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ یہ ناول اسی سے عبارت ہے۔ پریم چند نے دیہی معذوروں کو اپنے ناولوں میں عنوان بنایا ہے مگر اس ناول میں وہ شہری معذور ہیں جن کی اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔ پامال ہوتی ہوئی زندگی اور اس کی قدریں ہیں۔ دبے کچلے انسانوں کا ہجوم ناول کے ان گنت کرداروں اور اس سماج کی روداد ہے جس میں تقسیم در تقسیم کا عمل صدیوں سے جاری ہے۔ ناول کے سارے کردار اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کہانی رکھتے ہیں مگر یہ ساری کہانیاں مل کر ایک ہی کہانی بن جاتی ہیں۔ اپنی اپنی رام کہانی سنانے والے یہ سارے کردار مرکزی قصے سے اس طرح پیوست ہیں کہ ان میں سے کوئی عنصر دوسرے سے جدا ہو کر بامعنی نہیں رہتا اور نہ اس کی اپنی کوئی اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔

یہ ناول کسی چیز پر اصرار نہیں کرتا یہ تو بس قصوں کو آگے بڑھنے اور منکشف ہونے دیتا ہے۔ زیبن اور دین محمد کی کہانی وہ نہیں جو خیرن کی ہے، رجّو اور کانتی کی کہانی کچھ اور ہے۔ گنگا دین، صدیق کباڑیے، پردیپ اور جبّار کی اپنی اپنی کہانیاں ہیں لیکن وحدت عمل نے سب کو ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ یہ ہر اس بستی کی کہانی ہے جہاں کوئی نہ کوئی گنگا دین اپنی زمین پر ایک بورڈ کے لگتے ہی اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے اور کھڑے ہوئے لوگ ایک اور دربدری پر مجبور ہو جاتے ہیں اور پھر کسی اور بستی ایک ''نئی بستی'' کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔

''الہامی کتاب''

میری قوم! ایک عرصے سے مغرب کی غلام تھی۔ افیون ہماری کاشت تھی، جہالت کے انبار تھے۔ پھر میں نے ان جاہلوں کو پڑھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے علم کو جھٹلا دیا۔ میں نے ان کے ووٹ کا حق ہمیشہ کے لیے ان سے چھین لیا اور صرف علم والوں کو اختیار دے دیا۔ چنانچہ اسی گھسی پٹی جمہوریت سے چین میں انقلاب برپا کر دیا۔۔۔ آپ کی تو الہامی کتاب کہتی ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر آپ کے آئین میں جاہلوں کو اس فیصلے کا حق کیوں دیا ہوا ہے؟؟؟

ماؤزے تنگ

جہانِ رنج والم

شاہ نواز قریشی

(بھارت)

مسرور جہاں کے بارے میں ہم یہ تو نہیں جانتے کہ ان کا ''جہان'' کہاں سے کہاں تک ہے۔اپنی زندگی میں انہیں کن مراحل سے گزرنا پڑا۔کون کون سے نشیب وفراز ان کی زندگی میں آئے۔کیونکہ ہر انسان کی زندگی میں نشیب بھی آتے ہیں اور فراز بھی۔لیکن باظرف لوگوں کا چہرہ ہمیشہ ایسا رہتا ہے جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کن صبر آزما مراحل سے گزر چکے ہیں۔ان کے چہرہ پر ہمیشہ ایک ٹھہراؤ، شانتی اور سکون نمایاں رہتا ہے۔مسرور جہاں کا شمار ایسی ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ان کی شخصیت میں ایسی سادگی اور انکساری نظر آتی ہے جسے آج کے عہد میں حماقت سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ پی آر اولابنگ کا زمانہ ہے۔ عام طور سے لوگ اہلیت اور صلاحیت کو نہیں دیکھتے۔لابنگ اور مارکیٹنگ کے جادو سے متاثر ہوتے ہیں۔جارحانہ رویے سے ڈرتے ہیں۔اوران صفات اعلیٰ سے مسرور جہاں آج بھی محروم ہیں۔

ہمیں حیرت اس پر ہوتی ہے کہ وہ اب تک ۵۰۰ افسانے اور ۶۵ ناول لکھ چکی ہیں۔اس کے باوجود ان کی شخصیت کی سادگی اور منکسر المزاجی برقرار ہے۔ان میں ایسی کوئی ٹیڑھ نہیں پیدا ہوئی جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی، بڑے بڑوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتی اور سبھی کو نہ صرف ہدف تنقید بناتی ہے بلکہ بڑی آسانی سے جاہل قرار دیتی ہے۔

مسرور جہاں دانشوری کے عذاب سے محفوظ رہی ہیں۔لیکن اپنے ہی خاندان کے ایک قلم کار رکن کے دانشورانہ بلکہ جارحانہ تبصرے سے وہ خاصی محظوظ بھی ہوتی ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ تمہیں آج تک لکھنا نہیں آیا۔جب کہ ہمارے ایک دوست کا ماننا ہے کہ مسرور جہاں کی نثر بہتوں سے کہیں زیادہ موثر اور''پروقار'' ہوتی ہے۔

مسرور جہاں کو ہم جہاں تک یعنی جتنا پڑھ سکے ہیں اس کی بنیاد پر بغیر کسی پس وپیش کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں بیانیہ پر پورا عبور حاصل ہے ان کا بیانیہ بہت واضح، اسلوب ابہام سے پاک اور سادہ ہوتا ہے۔زبان پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔

انہیں خصوصیات کی بنا پر مسرور جہاں کو ریڈرشپ بھی ملی اور مقبولیت بھی۔جبکہ ہمارے دانشورران ادب ایسی ریڈرشپ اور مقبولیت کے حامل قلم کاروں کو بڑا فنکار نہیں مانتے۔لیکن مسرور جہاں نے دانشوران کرام کی کبھی پرواہ نہیں کی اورانہیں جو لکھنا تھا جیسا لکھنا تھا لکھتی رہیں۔انہوں نے جنوں کی حکایات خونچکاں لکھنے کے بجائے جو دل پہ گزری، جو کچھ انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا لکھتی رہیں۔وہ کبھی بد دل نہیں ہوئیں۔شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' لکھا تھا۔مسرور جہاں نے ''نئی بستی'' جیسا ناول لکھا۔جسے ان کے نکتہ چیں بھی نظرانداز نہیں کرسکے۔مسرور جہاں نے اپنی افسانوی تخلیقات میں ہیئت واسلوب کا کوئی تجربہ نہیں کیا جو ہمیں چونکاتا۔کوئی فلسفہ طرازی نہیں کی اگر وہ نام نہاد فکری گہرائی اور تہہ داری پیدا کرنے کے لیے ایسی کوئی ترکیب استعمال بھی اپنی کسی افسانوی تخلیق سے منسلک کردیتیں کہ اسے کہیں ''تنہائی'' میں بہ آواز بلند پڑھا جائے تو ہمارے دانشوران کرام ضروران کی جانب متوجہ ہوجاتے۔

مسرور جہاں کی تاریخ ولادت ۸۔جولائی ۱۹۳۸ء ہے۔اس طرح وہ اس سال یعنی ۲۰۱۷ء کی ۸۔جولائی کو ۷۹ سال کی ہوگئیں۔اس عمر میں بھی وہ کہیں سے تھکی ہوئی نہیں نظر آتیں۔نہ اس کی شاکی ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا جیسا بھی لکھا اس کی قدر نہیں ہوئی کیونکہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا بڑی سرگرمی سے اعتراف کیا گیا چنانچہ انہیں اترپردیش اردو اکادمی، بہاراردو اکادمی، آل انڈیا میر اکادمی اور دیگر ادبی اداروں نے اعزاز دیے اورانہیں ادبی اداروں سے سرفراز کیا ان کے افسانے اور ناول صرف ہندوستان نہیں پاکستان اور کناڈا سے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آرہا ہے کہ ایک بار مجازؔ کو سلامؔ مچھلی شہری کچھ مضمحل اور بد دل سے نظر آئے تو مجازؔ نے کہا کہ مایوس کیوں ہوتے ہو تم اپنی کچھ شعری تخلیقات کا فرانسیسی میں ترجمہ کرالو میں ان کا از سر نو اردو میں ترجمہ کر کے انہیں شائع کراؤں گا اوراس پر فرانسیسی سے ترجمہ لکھ دوں گا۔اس سے تمہارا بڑا نام ہوجائے گا۔اس پر سلام ہنس پڑے تھے اوران کی بد دلی کافور ہوگئی تھی لیکن مسرور جہاں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ مضمحل نظر آتی ہیں نہ بد دل اور پھر ان کی تخلیقات کے ترجمے تو پہلے ہی ہو چکے ہیں اور جن زبانوں میں ہوئے ہیں ان میں ہندی، انگریزی، کنٹر، تیلگو، تمل اور پنجابی وغیرہ شامل ہیں چنانچہ ان زبانوں کے ادبی حلقے کے لوگ کسی حد تک مسرور جہاں کے نام سے واقف ہی ہوگئے ہوں گے۔

مسرور جہاں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے عام آدمی کے لیے لکھا۔ عام آدمی کے دکھ درد اوراسے درپیش مسائل کی عکاسی کی اور یہ بات خواص کو نہیں بھاتی کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ ادب عام آدمی کے لیے نہیں ہوتا اسی لیے وہ ایسا لکھتے ہیں جسے خواص ہی پڑھیں اور خواص ہی سمجھیں۔اسے یوں کہنا چاہیے کہ ''ان کا کہا یا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے''۔دانشوران ادب کی نظر میں عام آدمی یا عام قاری کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔اس قبیلے کے لکھنے والے ادب کو خواص کی چیز مانتے ہیں اور خواص تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اسی لیے وہ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی پہنائیوں میں گم رہنے والے ''اب شہر میں نکلے ہیں تو حیران کھڑے ہیں'' کیونکہ اب ابن صفی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا جانے لگا ہے۔یہاں تک کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی ابن صفی کے ناول کا انگریزی میں ترجمہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔۔۔ہم نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب ابن صفی کو لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب کہ ان کا انداز

تحریر، ان کا بیانیہ اور منظر نگاری خاص طور سے ان کی جیسی نثر بڑے بڑوں کے یہاں نہیں ملتی۔ابن صفی کا پلاٹ اور کہانی بننے کا فن بڑے بڑوں کو نہیں مل سکا۔کم و بیش مسرور جہاں کی نثر اور ان کا اسلوب بھی اسی نوعیت کا ہے جس میں سادگی کے ساتھ پُرکاری بھی ملتی ہے۔ان کی زبان میں لکھنؤ کی نازکی بھی ملتی ہے اور عصری آہنگ کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔

ان کا ''خواب در خواب (تخلیقی) سفر'' جاری ہے۔ انہوں نے ''تیرے میرے دکھ'' بہت قریب سے دیکھے بھی ہیں اور محسوس بھی کیے ہیں ۔ مسرور جہاں نے ''چراغ پھولوں کے'' روشن کیے ہیں اور ''درد کے الاؤ'' میں جھلسی بھی ہیں۔

مسرور جہاں کی مجموعی خدمات نے تاجکستان یونیورسٹی کے اسکالر جاوید خولوف کو کچھ اس طرح متوجہ کرلیا کہ انہوں نے بے خوف ہوکر پی ایچ ڈی کے لیے ان پر تحقیقی مقالہ (۲۰۱۲ء) میں لکھ ڈالا۔مسرور جہاں کی شخصیت اور فن پر ہندوستان کی نگہت سلطانہ عابدی نے ڈی لٹ کے لیے تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔اس کے علاوہ کئی اور افراد نے بھی انہیں اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔اسی لیے مسرور جہاں کبھی ناقدری کا شکوہ نہیں کرتیں لیکن ہمیں ضرور ان دانشوران کرام سے شکایت ہے جو مقبولیت کی بنا پر کسی کو بڑا فنکار نہیں مانتے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض عدم مقبولیت کی بنا پر کسی کو بڑا فنکار تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کسی فنکار کے یہاں وہ خصوصیات ''تلاش کی جاتی ہیں'' جو اس کے یہاں نہیں ملتیں جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ جو کچھ اس کے یہاں موجود ہے اس کی بنا پر اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ویسے عمیق حنفی (مرحوم) نے لکھنؤ کے ایک ادبی جلسے میں بہت پہلے کہا تھا کہ ''میں نقادوں کے چکر میں نہیں پڑتا۔وہ اگر کہتا ہے کہ آسان زبان میں لکھو تو میں مشکل زبان میں لکھتا ہوں۔وہ کہتا ہے کہ مشکل زبان میں لکھو تو میں آسان زبان میں لکھتا ہوں۔'' نقاد اپنا پیشہ کرتا ہے میرا کام لکھنا ہے میں لکھتا ہوں۔

- بقیہ -

نئی بستی

مابی۔۔۔مار پڑی رَہے۔۔۔کئی روج سے گریب ماندی چل ری ہے۔تو وئی وکھت۔۔۔دُوناس پٹیا آئے پڑا۔۔۔وئی کرانے والا بڈھا۔باہر بچوں کا انگریجی مٹھائی دے کر ہُواں سے دور بھگائے دیا۔اور کھد وہ راچھس بھیتر گھُس گوا۔۔۔اور اُس بچاری لونڈیا پے پھاٹ پڑا۔۔۔او تو کہو کھلیک کی گھر والی آن پڑی۔۔۔مُوا دھوتی سنبھالتا بھاگ گوا۔۔۔مار کے چھوکری کھُونم کھُون۔۔۔تو ماں ہلاّ مچائے وہیں لوگ باگ دوڑ پڑے۔۔۔اور بڈھّے کا پکڑ کر کھوب مارا۔۔۔کھوب مارا۔۔۔اب وہ تو گوا اَرامی تھانے اور نگوڑی لونڈیا ہسپتال گئی۔اب اے ہی دیکھ لیو۔۔۔بہنی۔۔۔سات۔۔۔اَٹ سال کی لونڈیا۔۔۔ہَو رودئی ساٹ سال کا جھڑوس۔۔۔''

ہیرا کی تو سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔اس نے اپنی دونوں لڑکیوں کو اپنے قریب گھسیٹ لیا۔جیسے اس ڈر ہو کہ کہیں وہ بڈھا پھر نہ آجائے۔وہ بھی تو بچیوں کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر کام پر چلی جاتی تھی۔ بھُلئی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔کبھی اسپتال میں پڑا ہے۔۔۔تو کبھی گھر پر۔۔۔اس نے بچیوں کو اندر لے جاکر کھاٹ پر بٹھا دیا۔۔۔اور پوٹلی کھول کر دال بھات ان کے سامنے رکھ دیے۔ساگ اور روٹی بھُلئی کے آگے سرکا دی۔

''تو کھالے۔۔۔میں نا کھاؤں گا۔۔۔بھوک نئیں ہے۔۔۔''

بھوک پیاس تو ہیرا کی بھی اڑ گئی تھی۔اس نے روٹی اٹھا کر ٹپرے پر رکھ کر ڈھانک دی اور خود دروازے پر آ کر بیٹھ گئی۔کچھ لوگ اب بھی وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔سب کی باتوں کی تان بھکٹ جمانہ پر آ کر ٹوٹ جاتی تھی۔۔۔پَر ایسا ''جمانہ'' بھی کس کام کا۔۔۔کہ بچہ۔۔۔بچہ نہ سمجھا جائے اور بوڑھوں کو اپنی بزرگی کا خیال نہ رہے۔یوں تو غریبوں کے لیے بھکٹ جمانہ سدا خراب ہی رہتا ہے پر اتنا بھی نہیں کہ ایک ساٹھ برس کا بڈھا اپنی پوتی اور نواسی کے برابر کی بچی کو عورت سمجھ لے۔۔۔پھر بابا، دادا، چاچا، کاکا۔۔۔کس کو کہا جائے۔؟ یہ سارے رشتے ناطے کیا ہوئے اور سنسار میں بس ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا عورت اور مرد کا رشتہ۔۔۔مرد اور عورت کا رشتہ۔۔۔آدم اور حوّا کا رشتہ؟

بچیاں کھاپی کر اونگھ رہی تھیں۔۔۔اس نے دونوں بچیوں کو کھاٹ پر ٹھیک سے لٹا دیا اور میلی سی چادر اڑھا کر انہیں سر سے پیر تک ڈھانک دیا۔۔۔ مانو اس میلی سی پرانی چادر سے ان کی حفاظت کر رہی ہو۔۔۔پھر وہ بھی ان کے پاس ہی لیٹ گئی۔ہیرا سوچ رہی تھی کہ اب جب کبھی بھُلئی اسپتال میں ہوگا تو وہ بچیوں کو اپنے ساتھ کام پر لے جایا کرے گی۔انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گی۔نیند میں اونگھتے ہوئے بھی اس کے دماغ میں ''بھکت جمانہ'' کی گردان جاری تھی۔

☆

خواب درخواب سفر

رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

لکھنؤ کی سوندھی مٹی کی خوشبو وہاں کی اپنی مشہور دلنشیں تہذیب اور زبان و بیان کی نزاکت یہ سب مسرور آپا یعنی مسرور جہاں کی تحریروں کی جان ہیں۔ ۸۔ جولائی ۱۹۳۸ء فتح پور، لکھنؤ میں علمی و ادبی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ گھر کے ماحول نے ادب کی طرف گامزن کیا اور ۱۹۵۲ء میں پہلی کہانی ''وہ کون تھی'' قومی آواز لکھنؤ سے منظرِ عام پر آنے سے باقاعدہ ادبی سفر کی شروعات ہوگئی۔ پہلی کہانی ان کی رومانی کہانی تھی اور یہ عنصر اب تک اُن کے افسانوں میں موجود ہے۔ شادی کے بعد گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کے بیچ بھی ان کے قلم کا جادو چلتا رہا۔ اُن کا پہلا ناول ''رُما'' ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ اب تک اُن کے ۱۲۔ افسانوی مجموعے اور تقریباً ۶۵ ناول منظرِ عام پر آچکے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں چھپے۔ اُن کے ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ پاکستان میں کسی اور کے لکھے ناول اُن کے نام سے چھپے۔ اُن کی لکھی کہانی ''شال فروش'' مہاراشٹر کے آٹھویں درجے کے نصاب میں شامل ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں پر کئی طلبہ نے پی ایچ ڈی کی اور صرف اُن کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سبھی خواتین فکشن نگار کے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ اُن پر لکھا مقالہ روسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ادبی حیثیت بین الاقوامی فکشن نگار کی ہے۔

''خواب درخواب سفر'' اُن کا تازہ افسانوی مجموعہ جس میں بیس افسانے شامل ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ایک بھی افسانہ اس مجموعہ میں ایسا نہیں جو قابلِ دادنہ ہو۔ ان کے افسانوں کی مرکزی کردار عورت ہوتی ہے۔ خانگی پس منظر میں لکھیں کہانیاں رشتوں کے اردگرد گھومتی رہتی ہیں۔ معاشرے سے جڑے موضوع، نفسیاتی الجھنیں، زندگی کے اہم مسائل ان کے افسانوں کی نبض ہیں۔ اپنی بات نہ تو وہ اشاروں میں کہتی ہیں نہ رمزو کنائے میں۔ سیدھی اور صاف بات کہنے سے گریز نہیں کرتیں۔ کہانی چشمے کی روانگی کی طرح بڑھتی جاتی ہے نہ کہیں الجھاؤ ہوتا ہے اور نہ ہی قاری کو ذہن پر زور ڈال کر الفاظ کے پیچھے چھپے معنی سمجھنے میں الجھنا پڑتا ہے۔ دل سے لکھی کہانی سیدھے دل پر اثر کرتی ہے جس کا قاری بھرپور لطف اُٹھاتا ہے۔ زبان و بیان کی وہی لکھنوی نزاکت، سلیس اور شیریں زبان کہانی کا مزادوبالا کردیتے ہیں۔ کردار جانے پہچانے ہمارے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ کچھ کردار ایسے نوابی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب کم و بیش نوابوں کے شہر میں بھی آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی ''قفس'' ہے۔

محاوروں کا استعمال بھی جابجا کرتی ہیں۔ افسانہ ''واپسی'' میں اس کی مثال دیکھئے۔

''بیچ سڑک سے غائب ہوگئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ (ص:۵۹)

''جانتا تھا پتھر میں جونک لگ سکتی ہے۔''

''خدا جانے کس مٹی کا بنا تھا یہ شخص۔''

''آفس میں بھی وہ بہت لیے دیئے رہتی تھی۔'' (ص:۷۹)

مسرور آپا کے افسانوں میں کئی رنگ ملیں گے مثلاً رومانی، جذباتی، نفسیاتی، عورت کی بے بسی، جہیز کا مسئلہ، بیرون ملک جانے والوں کا درد، فساد اور کئی خانگی مسائل مگر سیاست سے جڑے موضوع پر افسانہ اس مجموعہ میں نظر نہیں آیا۔

''اندھیارے میں ایک کرن'' اور ''گڑیا'' فساد کا درد بیان کرتے ہیں۔ ''گڑیا'' کا اختتام زبردست ہے۔ قاری کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ فساد کا منظر، ایک آدمی پریشان حالت میں بھاگ نکلتا ہے۔ ہر طرف سے بچتا بچاتا بچی کو سینے سے لگائے محفوظ جگہ پر دم لینے کو رکتا ہے تو دیکھتا ہے کہ بچی کی جگہ وہ گڑیا اُٹھا لایا۔ بچی تو وہیں رہ گئی۔

اپنی زمین سے بچھڑنے کا درد ''خواب درخواب سفر'' میں بیان کیا ہے۔ مہاجر ہونے کا دکھ کیا ہوتا ہے یہ وہ ہی جان سکتا ہے جس کے تن من پر بیتی ہے۔

''بسے بسائے گھر اجڑ جائیں تو اُن کا دوبارہ بننا آسان نہیں ہوتا لیکن جذبے بے ایمان بن جائیں تو کوئی مشکل نہیں رہتی'' (ص:۵۳)

اسی افسانے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''وہ ایک تناور درخت تھا جس کا اجنبی زمین پر نامانوس آب وہوا میں جڑیں پکڑنا آسان نہیں تھا۔'' (ص:۵۷)

اس مجموعہ کی پہلی کہانی اُن کے پہلے افسانے کی طرح رومانی اور جذباتی ہے۔ ''انتظار کی صدی'' ایک مدت کے بچھڑے دو پیار کرنے والوں کی کہانی ہے جس کا اختتام بھی رنج و غم فاصلوں کا درد مٹا کر آپس میں ملن سے ہوتا ہے۔ ''اپنا سورج اپنا چاند'' بھی رومانی رنگ لیے ہوئے ہے۔ انا کا مسئلہ محبت کے رشتوں میں دُوری پیدا کردیتا ہے۔

عورتوں کی بے بسی اُن پر جبر وظلم کی داستان افسانہ ''بشارت'' میں لکھ کر انہوں نے اپنے دل اور ضمیر کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔ عورت کو کبھی عزت کا حوالہ دے کر کبھی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ کر، کبھی مذہب کی دہائی دے کر جسمانی اور نفسیاتی تشدد جبر وظلم کا شکار بنایا جاتا ہے۔ اسی افسانے کا اقتباس حاضر ہے:

''اپنی پسند و ناپسند کا اظہار بدترین سمجھا جاتا تھا۔ جہاں دیواروں سے دیواروں کے درمیان اتنے فاصلے تھے کہ ایک طرف کی آواز دوسری طرف نہیں جاسکتی تھی جہاں صداؤں پر بھی قدغن لگانے کا رواج تھا اور یہ عجیب جگہ تھی۔ یہاں انسانوں اور جانوروں میں کوئی تخصیص نہیں تھی بلکہ زن و شوہر کی یکجائی بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ کل بل کرتے ڈھیروں بچے خدا جانے کہاں سے آجاتے تھے۔'' (ص:۲۳)

مسرور آپا صرف عورتوں کی ذہنی تشدد یا اُن کے مسائل کی بات نہیں کرتیں اُن کی نظر میں وہ مرد بھی مظلوم ہے جس کی زندگی رشتوں کو نبھاتے نبھاتے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہو۔ ''جلاوطن'' میں ساری ہمدردی اس افسانے کا

ہیرو بٹور لیتا ہے جو اپنے وطن کی مٹی سے سبھی رشتوں سے دُوری کا درد سہہ رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گھر والوں کی فرمائش پوری کرتے کرتے خود کی ضرورتیں ملتوی کرتا جاتا ہے۔آج کے دور کی حقیقی عکاسی کی ہے۔قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

بچوں کی نفسیات کو بھی وہ بخوبی سمجھتی ہیں۔''میں نے کچھ نہیں دیکھا'' ایسی ہی ایک کہانی ہے جو بن ماں کے بچے کی نفسیات کو بیان کرتی ہے۔ ببلو دوسری ماں کو قبول نہیں کرتا مگر آہستہ آہستہ ماں کی ممتا اُس کے سرد جذبات کو پگھلا دیتی ہے اور وہ ماں کی مجبوری کو محسوس کر کے دل ہی دل میں اسے ماں کا درجہ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

ایک عورت ہونے کے ناطے انہوں نے عورت کو ہمیشہ صحیح قرار نہیں دیا بلکہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہا۔ پھر چاہے عورت ہی غلط کیوں نہ ہو۔ عورتوں کی خامیوں پر پردہ نہیں ڈالا۔افسانہ ''ساتھ ساتھ'' میں کرن گلیمر کی دنیا میں جانے کی خاطر اپنے شوہر اور بچے کو چھوڑنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ والدین کی علیحدگی بچے کی نفسیات پر اثر انداز ہوئی۔اسے تو ماں باپ دونوں کی محبت چاہیے۔ وجے بیوی کی ہر خطا معاف کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور سب بھول کر بیوی بچے کو لینے چلا جاتا ہے۔

اس مجموعہ کی ایک کہانی ''واپسی'' بھی ایسی ہے جس میں زندگی کے سبھی رنگ موجود ہیں۔لڑکی کی مجبوری، لڑکے کا محبت جتانا اُسے یقین دلانا اور پھر کسی اور کی خاطر اُس کا دل توڑ دینا، اس سے بے وفائی کرنا۔ مرد کی بھٹکنے کی فطرت اُس کی نفسیات کا پردہ فاش کرتی ہے۔

مسرور آپا نے نئے دور کے موضوع کو بھی ان دیکھا نہیں کیا۔'' بے ثمر ٹہنی'' دل کو چھونے والی کہانی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے بچے کی پیدائش اس کہانی کا موضوع ہے۔ اپاہج شوہر کی بیوی ماں بننا چاہتی ہے مگر قدرتی طریقے سے۔ دل ہی دل میں چاہتی ہے کہ شوہر سے طلاق لے لے۔ اُس کے کہنے سے پہلے ہی شوہر اُس کی مشکل آسان کر دیتا ہے اور طلاق کے کاغذات تھما کر کہتا ہے کہ اُسے اپنی مرضی سے جینے کا پورا حق ہے۔ رومانی کہانی چشمے کی روانگی سے بڑھتی جاتی ہے اور آخر میں قاری کو رُلا دیتی ہے۔

کبھی کبھی غلط فہمی رشتوں میں دراڑ پیدا کر دیتی ہے انسان کے سوچنے کا نظریہ بدل دیتی ہے اور جب حقیقت کھلتی ہے تو سوچ کے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ ''بند دروازہ'' ایسی ہی کہانی ہے۔

''نمک حرام'' ایسی کہانی ہے جس میں خادمہ کو نمک حرام کا خطاب ملتا ہے اور وہی نمک حرام اپنے آقا کے گھر کی عزت بچا کر نمک کی قیمت ادا کر دیتی ہے۔ کہانی دلچسپ ہے اور اندازِ بیان بھی خوب ہے۔

اندازِ بیان کا خوبصورت نمونہ افسانہ ''قفس'' میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ لڑکی کی خوبصورتی کا نقشہ الفاظ سے اس طرح کھینچا ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دی۔ ملاحظہ فرمایئے:

''محل میں کوئی تقریب تھی۔ زمرد بھی موقع محل کی مناسبت سے سولہ سنگھار کے کام کاج میں مصروف تھی۔ سبز رنگ کا چوڑیدار پاجامہ اس کی سڈول پنڈلیوں میں اس طرح پھنسا ہوا تھا جیسے پہننے کے بعد سلائی کی گئی ہو۔ زرد ریشم کا پھولدار کُرتا اس کی سرکش اٹھانوں کو چھپانے میں ناکام نظر آ رہا تھا۔ سبز ہی جارجٹ کا کرن لگا دوپٹہ اس کی گردن میں لپٹا ہوا تھا۔ بالوں کی لمبی سی چوٹی میں سبز ریشمی موباف (ربن) کے ساتھ ساتھ پھولوں کا گجرا بھی لپٹا ہوا تھا۔ صندلیں کلائیوں میں سنہری بانکیں سجی ہوئی تھیں۔ اُس وقت زمرد ایک ایسی برق نظر آ رہی تھی جس نے ہر خرمنِ دل کو جلا کر خاکستر کرنے کا تہیہ کر لیا ہو۔'' (ص:۶۱-۶۰)

''ٹکڑوں میں بٹی عورت'' ایسا افسانہ ہے جو بیوہ ماں کے درد کو بیان کرتا ہے۔ بیوہ ہونے کے بعد مجبوراً اُسے بچے کو چھوڑ کر شادی کرنی پڑتی ہے مگر اولاد کے بنا اس سے دُور رہ کر وہ نہ تو کوئی کام سلیقے سے کر پاتی ہے اور نہ ہی رشتہ نبھا پاتی ہے۔ شوہر سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں۔ آخر میں شوہر بیوی کی ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے اور اُس بٹی ہوئی عورت کو مکمل کرنے کے لیے اس کی اولاد کو اپنا لیتا ہے۔ گھر کو بنانے اور سنوارنے میں صرف عورت ہی ذمہ دار نہیں ہوتی بلکہ مرد کا بھی پورا ہاتھ ہوتا ہے۔

قلم کار کے لیے سب سے بڑی سزا اُس سے اُس کا قلم چھین لینا۔ اُسے کتابوں سے لکھنے پڑھنے سے روکنا ہے۔ افسانہ ''کھوئے ہوئے لمحے'' میں اپنی شادی کو بچانے کے لیے افسانہ نگار ہر قربانی دیتی ہے۔ خود کو لکھنے پڑھنے سے روک کر ذہنی اذیت میں مبتلا ہوتی ہے مگر سنگ دل شوہر مجازی خدا ہونے کا حق اس کو جلی کٹی سُنا کر ادا کرتا ہے۔ صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھتا ہے اور وہ بغاوت کر کے ہر بندھن توڑ دیتی ہے۔ بنا قلم کے وہ خود کو بانجھ محسوس کرتی تھی اور قلم ہاتھ میں آتے ہی سکون اور نئی توانائی محسوس کرتی ہے۔ کہانی کا اسلوب عمدہ ہے۔

ہمارے سماج میں بیٹی کی پیدائش کو اس لیے بھی بُرا سمجھا جاتا ہے کہ جہیز کا بوجھ اُس کی پیدائش کے ساتھ ہی والدین کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ''چڑھاوا'' میں رتّو اپنی بیٹی نجّو کو اچھی تعلیم دیتی ہے۔ خود محنت کرتی ہے بیوگی اور غربت کے باوجود اکیلے ہی بیٹی کی سبھی ذمہ داری پوری کر کے جہیز جمع کر کے اُس کو عزت سے رخصت کرتی ہے۔ ابھی کچھ سال ہی سکون سے گزرتے ہیں کہ نجّو زچگی کے وقت آپریشن ٹیبل پر ہی دم توڑ دیتی ہے اور بیٹے نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی آنکھیں موند لی تھیں۔

مردوں کی نفسیات کا تجزیہ خوب کیا ہے:

''گرہستی کا سکھ بھوگنے کے بعد کوئی مرد سارا جیون مرنے والی کے نام پر جوگ نہیں لیتا۔ یہ تو عورت ہی ہے جو پتی کے مرنے کے بعد سنسار کا ہر سُکھ خود پر حرام کر لیتی ہے۔'' (ص:۱۴۶)

دل تو اُس کا اُس وقت چھلنی ہوتا ہے جب بیٹی کے جہیز کا زیور داماد کی نئی دُلہن کو پہنے دیکھتی ہے۔ خون پسینے سے پیسہ اُس نے کمایا اور نئی دُلہن کو چڑھاوا چڑھا کر واہ واہ اُس کی مرحوم بیٹی کے سسرال والے لُوٹتے ہیں۔

''خواب در خواب سفر'' کا ایک ایک افسانہ قابلِ داد ہے۔ خوبصورت اسلوب، خوبصورت اندازِ بیان افسانوں میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت یاب رکھے، اُن کی عمر دراز ہو اور اُن کا ادبی سفر جاری رہے۔

کہاں کا عشق!!

مسرور جہاں

''جگنو میاں بتول کے عشق میں پاگل ہو رہے تھے۔'' ''جگنو میاں زہر کھانے کے لیے تیار ہیں۔''

''جگنو میاں اٹوائی کھٹوائی لئے پڑے ہیں۔''

خاندان میں ہر طرف جگنو میاں کے عشق کے چرچے تھے۔ اگر جگنو میاں عشق کر رہے تھے تو اس میں حیرت کی کیا بات تھی۔ عشق کرنا تو مردوں کا پیدائشی حق ہے وہ مرد بیوقوف ہوتے ہیں جو اپنے حق سے کبھی ہنسی خوشی اور کبھی مجبوراً دست بردار ہو جاتے ہیں اور ساری عمر اپنی حماقت پر پچھتاتے ہیں۔ عقل مند مرد وہ ہے جو بار بار۔۔۔ بلکہ ہزار بار اپنے حق کا استعمال کرے اور ڈنکے کی چوٹ پر ہر نئے عشق کا اعلان کرے۔

جگنو میاں کا بھی یہ پہلا عشق نہیں تھا۔ وہ اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔۔۔ اور بہتوں نے تو انہیں سے عشق کا سبق سیکھا تھا۔ ضویا سے انہوں نے بڑا زناٹے دار عشق کیا تھا۔۔۔ اور اپنی بات منوانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔۔۔ اس کی بس ایک ہی رٹ تھی کہ شادی کریں گے تو ضویا سے ورنہ ساری عمر کنوارے رہیں گے۔ ان کی امّاں بھی ایک ضدّی تھیں کہ واویلا کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور صاف کہہ دیا۔

''بیٹا بھنگن لاؤ۔۔۔ چمارن لاؤ۔۔۔ لنگڑی، لولی، اندھی اور کانی لے آؤ ہم ہنسی خوشی اسے دلہن بنا کر اپنے آنگن میں اتاریں گے۔ لیکن ضویا کو اپنے گھر کی بہو ہرگز نہیں بنائیں گے۔

جگنو میاں ایک تو اکلوتے اوپر سے سر پھرے بھی۔ ساری محبت اور سعادت مندی کنارے رکھ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''اگر ضویا سے شادی نہیں ہوئی تو زہر کھا لیں گے۔''

امّاں نے کہا۔

''زہر کھائیں تمہارے دشمن۔ میں جنم جلی، نصیبوں کی ماری خود ہی جان دے دوں گی۔ شوق سے بیاہ رچاؤ۔ کم از کم اپنی آنکھوں سے دشمن کی اولاد کو چھاتی پر مونگ دلتے تو نہیں دیکھوں گی۔''

جب ماں، بیٹا دونوں جان دینے پر آمادہ ہو گئے تو خاندان بھر کے لڑکے اور لڑکیاں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''آخر اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ دونوں میں سے کون جان دے گا؟''

کسی شریر لڑکے نے جھٹ جیب سے ایک روپے کا سکّہ نکالا۔۔۔

''لو ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔ بولو سن یا پٹلی؟'' سَن پٹلی کے شور میں فیصلہ امّاں کے حق میں ہو گیا۔ اور سب نے چین کی سانس لی۔

''اب جگنو میاں ٹھاٹ سے ضویا کے ساتھ بیاہ رچائیں امّاں تو گئیں کام سے''

امّاں نے اُڑتی پڑتی اپنے مرنے کی خبر سُنی تو اُچھل پڑیں۔ ''مریں میرے دشمن! یہ کون خدائی خوار، موت پیٹا میری موت کا فرمان جاری کر رہا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس ناس پیٹے سورما کی شکل۔۔۔ لو ایک روپے والا گلٹ کا سکّہ اُچھال کر سن پٹلی کھیلا جا رہا ہے۔ اور کھیل کھیل میں مجھے عدم آباد کا راستہ دکھایا جا رہا ہے۔''

اب کوئی ایک سُورما ہوتا تو اسے ان کے حضور حاضر کر دیا جاتا۔ یہاں تو ڈھائی درجن سُورما تھے۔ سب ہی نے باری باری سن پٹلی کھیلا تھا۔۔۔ اور ہر بات موت کا قرعہ امّاں کے نام نکلا تھا۔۔۔ یا یوں کہیں نکالا تھا۔

ضویا کوئی غیر نہیں۔۔۔ جگنو کے سگے چچا کی لڑکی تھی۔ اس میں کوئی عیب بھی نہیں تھا۔ صورت شکل ہزاروں میں ایک تھی۔ تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند تھی۔ اگر کوئی عیب تھا تو جٹھانی دیورانی کے کٹیلے رشتے میں تھا۔ جگنو کی امّاں زبیدہ بیگم معمولی صورت شکل کی عام سی خاتون تھیں لیکن ان کے دولت مند والدین نے بیٹی کی بدصورتی کا عیب ڈھانکنے کے لیے دو ٹرک جہیز دیا تھا۔ جس میں چاندی کے پایوں والا پلنگ تک شامل تھا۔ نکہت کی خوبصورتی کو کسی رشوت یا سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ اور وہ اکہرا، اکہرا زیور اور گیارہ جوڑے لے کر سُسرال آئی تھیں۔ اور اپنے حسنِ اخلاق، شائستگی اور سلیقے سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ زبیدہ بیگم ان کا تو کچھ بگاڑ نہ سکیں۔ لڑ جھگڑ کر الگ رہنے لگیں۔ یہ الگ رہنا بھی ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھے بنا چین بھی نہیں آتا تھا۔ اِدھر جٹھانی، اُدھر دیورانی بیچ میں نو انچ کی پتلی سی دیوار کہ اُدھر کسی کو چھینک آتی تو اِدھر کہہ اٹھتا ''شکر اللہ''۔

زبیدہ بیگم کی سخت تاکید تھی کہ جگنو میاں اور یاسمین چچی کی طرف نہ جائیں۔ یاسمین بے چاری تو ماں کی عقابی نظروں کی تاب نہ لا کر گھر ہی میں دبکی رہتی۔۔۔ لیکن جگنو میاں نے تو گویا ماں کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بہانے بہانے سے دس چکر ضویا کی طرف کے لگاتے۔۔۔ اور صبح کا ناشتہ گھر میں کرتے تو دوپہر کو ضویا کی طرف دسترخوان پر نظر آتے۔ ضویا بھی بڑی امّاں کی نظر بچا کر یاسمی کے کمرہ میں گُھس جاتی اور دونوں مل کر تر تراتے حلوے میوے اور مُربّے اڑاتیں۔

نکہت دیکھ رہی تھیں کہ جگنو میاں کی متلاشی نظریں ہر دم ضویا کو تلاش کرتی ہیں۔ اور وہ بھی جیسے ان کی منتظر رہتی تھی۔ اپنی بدلتی ہوئی کیفیت سے جگنو میاں خود بھی آگاہ تھے۔۔۔ آنکھیں، آنکھوں میں ڈوب کر دل کا پیغام دینے لگی تھیں اور دھڑکنیں چھاتی کے اندر دھما چوکڑی مچانے لگی تھیں۔ اُن کے آنے اور

جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ پھر بھی ضویا کو جیسے الہام ہو جاتا کہ جگنومیاں کس وقت آئیں گے اور جگنومیاں کو ہر آہٹ پر ضویا کا گمان ہوتا۔

اِدھر جگنومیاں کو بینک میں ملازمت ملی اُدھر زبیدہ بیگم ان کے لیے چاند چہرہ، ستارہ آنکھوں والی دُلہن تلاش کرنے نکل پڑیں۔ دیوار کے دوسری طرف رہنے والی ضویا انہیں بھلا کیسے نظر آتی۔ جس کے چہرہ پر کئی چاند قربان کیے جاسکتے تھے۔ اور جس کی آنکھوں کے آگے ستاروں کی چمک بھی ماند پڑ جاتی تھی۔

جگنومیاں کو اپنی امّاں کی دھاندلی پسند نہ آئی اور انہوں نے ببانگ دہل ضویا سے اپنے عشق کا اعلان کر دیا۔ زبیدہ بیگم نے ضویا کے نام پر وہ دہائی ڈالی کہ نکہت سن کر پسینے پسینے ہو گئیں۔ اور انہوں نے جگنومیاں کو پیار سے سمجھایا۔

''بیٹا امّاں سے ضد کر کے اپنی من مانی کرو گے تو نہ تم خوش رہو گے نہ ضویا سکون سے جی سکے گی۔ بہتر ہے کہ ماں کی خوشی پوری کرو۔۔۔ اور جہاں وہ کہیں شادی کرلو۔''

''لیکن دُلہن چچی۔۔۔ میں امّاں کی خوشی کے لیے اپنی جان تو دینے سے رہا۔۔۔ اور اگر ضویا مجھے نہ ملی تو میں جی نہ سکوں گا۔''

بے چاری نکہت چپ ہو گئیں۔۔۔ وہ جگنومیاں کے دل کا حال بھی جانتی تھیں اور بیٹی کے جذبات بھی سمجھتی تھیں۔ جٹھانی کی سخت مزاجی اور بدزبانی کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ رہی ضویا۔۔۔ تو اسے جگنومیاں پر پورا بھروسہ تھا۔ اس موقع پر خاندان کی بزرگ خواتین آڑے آئیں اور سب نے زبیدہ بیگم کو سمجھا بجھا کر رضامند کر لیا۔ وہ تو خود بیٹے کی دیوانگی سے سہمی ہوئی تھیں کہ کہیں ضد بحث میں کچھ کھا نہ لے۔ اور بیوگی کا سہارا بھی چھن جائے۔ بیچارے میاں زندہ ہوتے تو شاید وہ ان کی ہی کہتے۔۔۔ لیکن اب تو سوائے جگنومیاں کے کوئی اور سہارا بھی نہیں تھا۔ خاندان کے مردوں نے اس معاملے سے خود کو پہلے ہی الگ کر لیا تھا۔ شادی بیاہ کے معاملے میں مرد غریب کو یوں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسے موقع پر اُچھل کود مچانے والے مرد شادی کے بعد بیویوں کے سامنے منہ کھولتے گھبراتے ہیں۔۔۔ اور ایک دن ضویا دلہن بن کر جگنومیاں کے آنگن میں اُتریں تو جیسے ایک ساتھ کئی چاند ان کے گھر میں اُتر آئے۔

جگنومیاں نے جی بھر کے بیوی سے عشق کیا۔ اب تو کسی کا ڈر بھی نہیں تھا۔ میاں اپنی بیوی سے پیار نہ کرے گا تو اور کس سے کرے گا۔؟ شروع شروع میں تو امّاں بہت جلیں کُڑھیں لیکن پھر بیٹے کے پاگل پن نے انہیں موہ لیا۔ خاندان والے جگنومیاں اور ضویا کی محبت کی مثالیں دیتے تو امّاں کا سینہ گز بھر کا ہو جاتا۔ دس سال کے اندر ضویا چار بچوں کی ماں بن گئی۔ لیکن نہ تو اس کے حسن کا سورج ڈھلا اور نہ ہی جگنومیاں کے پیار میں کوئی کمی آئی۔ جگنومیاں ترقی پا کر بینک میں منیجر ہو گئے تھے۔

ان کے آنے کا وقت ہوتا تو ضویا سج سنور کر میاں کے استقبال کے لیے تیار ہو جاتیں۔۔۔ موسم کے لحاظ سے موتیا، خس یا شمامہ میں مہکتیں۔ لمبی سی چوٹی میں بیلے کی کلیوں کی لڑی لپیٹے پان کی لالی سے رچے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے وہ موٹر کے ہارن کی آواز پر دوڑ جاتیں۔ جگنومیاں بھی ان کے حسن کو ایسے والہانہ پن سے نہارتے جیسے پہلی بار انہیں دیکھ رہے ہوں۔ ایسے میں زبیدہ بیگم بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتیں اور بیٹے بہو کو پیار کرنے کا موقع فراہم کرتیں۔ ضویا سارا دن گھر داری اور بچوں میں مصروف رہتی لیکن جگنومیاں کے آنے کے بعد وہ صرف ان کی ناز برداریوں میں لگی رہتی اور بچوں کو ساس کے حوالے کر کے کہتی:

''امّاں۔۔۔ وہ آ گئے۔۔۔ اب آپ جانیں اور بچے''

زبیدہ بیگم زیرلب مسکراتیں۔۔۔ جانتی تھیں اب بیٹے اور بہو کا کمرہ صبح تک بند رہے گا۔۔۔ کبھی موڈ میں ہوتیں تو کہہ دیتیں۔

''اُوئی نوج۔۔۔ ایسی بھی محبت کس کام کی۔ چار بچے ہو گئے اور ان کی سہاگ رات ہی ختم نہیں ہوتی۔''

جگنومیاں شرارت سے ہنس کر کہتے۔

''ضویا جان! تم نے سُنا امّاں کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔؟''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ میرا دل آپ ہی کے بچوں میں لگا رہتا ہے۔''

''اچھا جی۔۔۔ یہ بات ہے؟ خیر تم جاؤ اپنے بچوں کے پاس میں جا رہا ہوں کسی نپٹ کنواری کی تلاش میں۔''

''وہ کس لیے؟''

''اس کے ساتھ بچوں کا دم چھلاّ تو نہیں ہوگا۔ ٹھاٹ سے دونوں عشق کریں گے۔''

''منہ دھو رکھئے جناب۔ آپ کو میرے سوا اور کوئی نہیں پوچھے گا'' وہ بڑے غرور سے کہتیں۔

''وہ سلمیٰ ہے نا بیچاری۔ اب بھی مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے۔'' جگنومیاں سینے پر ہاتھ رکھ لیتے۔

''نا کہیں۔۔۔ بیچاری دمے کی مریض ہے۔ ہر وقت سانس پھولتی ہے۔'' ''اور ثمرہ۔۔۔؟''

''غریب پیدائشی بھینگی ہے۔۔۔ دیکھتی کہیں اور ہو گی۔ آپ سمجھتے ہیں نشانے پر آئی ہیں۔ اُف ری خوش فہمی۔۔۔؟''

''چلو چھوڑو۔۔۔ ہمیں کسی سے کیا لینا دینا''

''اتنے مایوس نہ ہوں۔ آپ کہیں تو میں کسی سے سفارش کر دوں؟''

''کر سکو گی؟''

''کیوں نہیں۔۔۔ کبھی آزما کر دیکھ لیں۔''

''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟''

''یہ سوال آپ نے کیوں کیا؟ محبت ہے تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔''

''پیار کرنے والے تو جان وار دیتے ہیں۔''

''میں بھی تو اپنی جان وارنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔آپ میری جان ہی تو ہیں۔۔۔اورآپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔''

''میں مرجاؤں تب بھی نہیں؟''

''شش۔۔۔خبردار جو ایسی بات پھر کبھی کہی۔''

''نہیں کہوں گی۔''

''میں تو خواب و خیال میں بھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔میری محبت کی ابتدا بھی تم اور انتہا بھی تم ہو۔''

''چلئے مان گئی۔اوراب یقین آیا کہ آپ جیسے چاہنے والے ہی تاج محل تعمیر کراسکتے ہیں۔''

''خیر آج کل کے زمانہ میں تو کوئی تاج محل نہیں بنوا سکتا۔لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہماری محبت کو کسی تاج محل کی ضرورت نہیں ہے۔''

جگنومیاں کی محبت میں گلے، گلے ڈوبی ہوئی ضویا کو پتہ نہیں چلا کہ وقت کیسے گزر گیا۔بڑی بیٹی ثنا فراک کے بجائے شلوار کرتا پہننے لگی تو احساس ہوا کہ بیٹی جوان ہوگئی ہے۔دوسری بیٹی حنا بھی قد نکال رہی تھی۔۔۔بیٹے دونوں چھوٹے تھے۔۔۔لیکن انہیں بھی بڑا ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

ضویا اپنا زیور نکالے بیٹھی تھی۔اور ساس سے کچھ مشورہ کر رہی تھی۔

جگنومیاں نے دوچار ڈبے اٹھا کر دیکھے۔پوچھا۔۔۔

''یہ دوکان کیوں سجا رکھی ہے؟''

''امّاں سے پوچھ رہی تھی اس زیور کے دوحصّے کس طرح کیے جائیں کہ ثنا اور حنا کو شکایت نہ ہو۔''

''حصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''چاردن کے بعد دونوں کی شادی کرنا ہوگی اس لیے ضرورت ہے''

''ایں شادی؟۔۔۔ثنا اور حنا کی شادی؟''

''شاید آپ نے انہیں نظر بھر کے دیکھا نہیں ہے۔ماشاءاللہ دونوں آگے پیچھے بیاہنے کے لائق ہیں۔''

''واقعی؟ جھک کر بولے۔ہمیں تو آپ کے سوا دوسرا کوئی نظر نہیں آتا۔''

''جگنومیاں کیا کہہ رہا ہے بیٹی؟''

امّاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو ضویا سے پوچھ بیٹھیں۔۔۔''کچھ نہیں امّاں۔۔۔کہہ رہے ہیں دونوں ابھی بہت چھوٹی ہیں۔''

''ہونہہ۔مرد ان باتوں کو کیا سمجھیں۔چار دن کے بعد سروقد نکل آئے گا لڑکیوں کا۔۔۔''امّاں نے پتے کی بات کہی۔

''ضویا۔۔۔یہ سب سمیٹ کر رکھ دو۔۔۔پھر کمرہ میں آنا ایک ضروری کام ہے۔''

جگنومیاں نے اپنے کمرہ کی راہ لی۔

ضویا نے میاں کو کپڑوں کی الماری میں گھسے دیکھا تو مسکرا دیں۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔ساری الماری اُلٹ پلٹ کر ڈالی۔''

''میرے تین چار جوڑے نکال دو۔کل صبح کی فلائٹ سے مجھے مدراس جانا ہے۔بینک کے منیجر کی کانفرنس ہو رہی ہے۔''

''وہ تو میں نکال دوں گی۔کتنے دن کے لیے جائیں گے؟''

''چاردن تو لگ ہی جائیں گے۔''

''اُف۔۔۔اتنے دن؟''ضویا کا جی دھک سے ہوگیا۔

''کیا کریں مجبوری ہے۔میں نے تو لاکھ کوشش کی کہ جان بچ جائے لیکن۔۔۔''جگنومیاں کھسیانی ہنسی ہنس دیئے۔

''اتنے دن اکیلی کیسے رہوں گی؟''

''میں بھی تو کبھی ایک رات تمہارے بغیر نہیں رہا۔''

خاندان میں ان دونوں کا خوب مذاق بنتا تھا۔شادی بیاہ ہو یا پھر کوئی اور تقریب۔۔۔میاں بیوی ساتھ جاتے اور ساتھ ہی واپس آجاتے۔جگنو میاں ضویا کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔شادی کے بعد وہ تو میکے میں بھی ایک رات نہیں رکی۔۔۔یہ تو اچھا تھا کہ میکہ اور سسرال پاس پاس تھے۔بلکہ ایک ہی مکان کے دوحصّے تھے۔تو بات نبھ گئی ورنہ بڑی مشکل ہوتی۔اوراب جو میاں کے باہر جانے کی خبر سنی تو ضویا بوکھلا گئی۔

''میں کام ختم ہوتے ہی آجاؤں گا''جگنومیاں نے تسلی دی۔

''آپ میری بیماری کا عذر پیش کر دیتے۔''

''بیمار ہوں تمہارے دشمن۔میرے بس میں ہوتا تو اپنا ڈیتھ سرٹیفکیٹ تک پیش کر دیتا''

''اللہ نہ کرے۔۔۔یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''ضویا نے بُرا مان کر کہا۔اور ٹُسر ٹُسر رونے لگی۔۔۔رونا تو پہلے سے آرہا تھا۔اب تو خاصا مضبوط بہانہ مل گیا تھا رونے کا۔

جگنومیاں بھاری دل سے رخصت ہوئے۔اور جاتے جاتے بیوی کو ڈھیروں دلاسے دیتے رہے۔ان کے جانے بعد ضویا کو محسوس ہوا کہ ایک گھر ہی کیا ساری دنیا ویران ہوگئی ہے۔مدراس پہنچتے ہی جگنومیاں نے ضویا کو فون کیا۔اوراپنی خیریت بتائی۔تب کہیں جا کر اسے قرار آیا۔۔۔قرار بھی کب آیا۔۔۔خواہ مخواہ رکھی دھری چیزیں اُلٹ پلٹ کرتی رہی اور بولائی بولائی سارے گھر میں پھرتی رہی۔۔۔زبیدہ بیگم کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا اپنے پاس بُلا کر بٹھایا۔۔۔اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا۔

''پگلی۔۔۔دو ہی دن میں منہ اُتر گیا۔ٹھیک سے کھاتی پیتی بھی نہیں۔۔۔جگنو آکر کیا کہے گا؟''

''امّاں۔۔۔کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''اسی لیے بڑے بوڑھے کہتے ہیں عورت کو ذرا کھینچ کر رہنا چاہیے۔۔۔ پیارے کرے تو اظہار نہ کرے۔ مرد اور زیادہ مغرور ہو جاتا ہے۔''

''وہ ایسے نہیں ہیں امّاں'' اس نے لاڈ سے کہا۔

''جانتی ہوں بیٹی وہ کتنا پاگل ہے۔ بلکہ تم دونوں ہی مجھے پاگل لگتے ہو۔۔۔ لیکن کبھی کبھی میاں بیوی کو الگ بھی رہنا چاہیے۔۔۔ اس طرح قدر اور محبت بڑھتی ہے۔ خدا تم دونوں کو نظرِ بد سے بچائے۔۔۔ جوڑی سلامت رہے''

ضویا نے دل میں ''آمین'' کہا اور بچوں کے پاس لیٹ گئی۔ جس دن سے جگنو میاں گئے تھے ضویا ساس کے کمرہ میں سو رہی تھی۔ اکیلا کمرہ اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔

کہتے ہیں چوبیس گھنٹے میں ایک ساعت ایسی بھی ہوتی ہے جب دعاؤں کی قبولیت کے در کھل جاتے ہیں۔ ایسے میں جو دعا مانگی جائے پوری ہوتی ہے۔ لیکن ان ساعتوں کی نشاندہی نہیں کی گئی اور بندوں کو راضی بہ رضا رہنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔

ضویا نے تکیے پر سر رکھا تو اچانک سارا تکیہ سرخ سرخ خون سے تر ہو گیا۔ کانوں اور ناک سے خون جاری تھا۔ زبیدہ بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ ذرا دیر میں سارا گھر عورتوں اور مردوں سے بھر گیا۔ سب نے فوراً ہی ضویا کو ہاسپٹل پہنچایا۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ وارڈ کے باہر ماں باپ عزیز اور ملنے جلنے والے جمع تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اُسے ''برین ہیمبرج'' ہوا ہے۔ ضویا کی حالت لحہ بہ لحہ گرتی جا رہی تھی۔ ایسے میں نہ جانے کس کے ہوش و حواس سلامت تھے کہ فون کر کے جگنو میاں کو اس کی علالت کی خبر دے دی۔

جگنو میاں پہلی فلائٹ سے بھاگے آئے۔ ہر دم ہنسنے مسکرانے والی محبوب بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں کے چہروں پر مایوسی رقم تھی۔

کاش ضویا ایک بار آنکھ کھول کر اپنے دیوانے کو دیکھ لے۔ دیکھ لے کہ اس کے عاشق کا کیا حال ہے۔۔۔؟ تب شاید۔۔۔ شاید نہیں یقیناً وہ پیدا کرنے والے سے لڑ جھگڑ کر زندگی مانگ لے۔۔۔ اپنے لیے نہیں۔ ان کے لیے، ان کی خاطر جی اٹھے گی۔۔۔

''جگنو میاں گڑ گڑا کر ضویا کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اور بلک بلک کر رو رہے تھے۔ زبیدہ بیگم نے بیٹے کی حالت ابتر دیکھی تو انہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ تسلّی دلاسے کے سارے الفاظ آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گئے۔ اور وہ سسک اٹھیں۔

''امّاں ضویا ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔''

جگنو میاں نے ماں سے شکوہ کیا۔ اور بچوں کی طرح رونے لگے۔

''اسے روک لیں امّاں۔۔۔ اسے روک لیں۔ ورنہ میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔''

جگنو میاں کے بین سُن کر اپنے پرائے سب ہی بے قرار ہو گئے۔

''ہائے غریب نے ضویا کو پانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے۔ جان تک دینے کے لیے تیار تھا۔۔۔ اور جب وہ اس کی ہو گئی تو بچھڑنے کی گھڑی آ گئی۔۔۔''

ڈاکٹروں کی چارہ گری کسی کام نہیں آئی۔ نہ ہی کسی کی دعاؤں نے اثر دکھایا اور ضویا سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی۔

قیامت کا ذکر تو بہت سُنا تھا لیکن قیامت کا آنا آج ہی دیکھا تھا۔ سب کے دل ایک انجانے خوف سے دھڑک رہے تھے۔ کہیں جگنو کے دل کی حرکت نہ بند ہو جائے؟ کیسے سہہ سکے گا اتنا بڑا صدمہ۔۔۔؟ اور شاید قدرت کو اس پر رحم آ گیا۔۔۔ ضویا کا جسدِ خاکی آخری سفر کے لیے گھر کی دہلیز ابھی پار بھی نہیں کر پایا تھا کہ جگنو میاں بے ہوش ہو گئے اور بے ہوشی اتنی طویل تھی کہ وہ بیوی کے جنازے کو کاندھا بھی نہ دے سکے۔ سینکڑوں لوگوں نے ضویا کو آخری منزل تک پہنچایا۔۔۔ بس جگنو میاں ان میں شامل نہیں تھے۔۔۔ انہوں نے جس محبوب ہستی کو سہاگ کے سرخ جوڑے میں گھر کی دہلیز پر بڑے ارمانوں سے اتارا تھا۔۔۔ اسے کفن میں لپٹا گھر سے رخصت ہوتے نہ دیکھ سکے۔

بے قرار راتیں بے چین دن اور سفّاک لمحے آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔۔۔ جگنو میاں ضویا کے غم میں پاگل ہو رہے تھے۔۔۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ سونے کا۔ ڈاکٹر نیند کی گولیاں کھلا کر سلاتے تو سو رہتے اور جب بیدار ہوتے تو در و دیوار سے لپٹ کر رونے لگتے۔۔۔ کبھی ہنستے۔۔۔ کبھی روتے۔۔۔ ثنا اور حنا ماں کا غم بھول کر باپ کو سنبھالنے میں لگی رہتیں۔۔۔ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلاتیں۔ روز صبح وہ قبرستان چلے جاتے۔۔۔ اور گھنٹوں ضویا کی قبر پر بیٹھے رہتے۔ کوئی نہ کوئی انہیں زبردستی وہاں سے پکڑ کر گھر لاتا۔ زبیدہ بیگم نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہوتیں تو جگنو خفا ہو جاتے۔

''امّاں! آپ کس کی بندگی کر رہی ہیں۔۔۔؟ وہی تو ہے جس نے میری ضویا کو مجھ سے چھین لیا۔۔۔ کیا ظالم ہے آپ کا خدا؟''

کفُر کے کلمات سن کر امّاں دہل جاتیں۔۔۔ لیکن اس رحیم و کریم پر تو سارا حال روشن تھا۔ وہ اس کی طرف سے معافی مانگتیں۔۔۔ اور تڑپ تڑپ کر ایک ہی دعا مانگتیں۔

''پروردگار مجھ بیوہ کا آخری سہارا مجھ سے نہ چھیننا۔۔۔ بن ماں کے بچوں کو یتیم نہ کرنا۔۔۔ اسے صبر دے میرے مولا۔ ورنہ وہ مر جائے گا۔''

ضویا کا سہ ماہی کا فاتحہ تھا۔۔۔ گھر رشتہ داروں سے ملنے والوں سے بھرا تھا۔ جگنو میاں باہر اپنے غمگساروں کے درمیان اداس اور دل گرفتہ سے بیٹھے تھے۔ فاتحہ کا وقت ہوا تو سب لوگ انہیں سنبھال کر اندر لے گئے۔ اگر مضبوط ہاتھوں کی گرفت کا سہارا نہ ہوتا تو شاید اپنے پیروں سے چلنا بھی مشکل ہوتا۔ ان کی حالت دیکھ کر سب کو افسوس ہو رہا تھا۔ ''اگر یہی حال رہا تو بے چارے جگنو

میاں کیسے جئیں گے؟'' موت سے پہلے مرنا اسی کو کہتے ہیں۔۔۔اور وہ بھی مر رہے تھے۔۔۔تل تل کر کے موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کسی رشتے دار نے انہیں متوجہ کیا۔

''میاں فاتحہ پڑھو''

جگنو میاں کے ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھے۔۔۔تو اٹھے ہی رہ گئے۔ آنسوؤں کے پردہ کے اس پار بتول نظر آئی۔سفید ڈوپٹے میں لپٹی سوگوار بتول چندروز قبل ہی دہران سے آئی تھی۔اس کا شوہر ایک ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گیا تھا۔ ابھی اس کی شادی کو ایک برس بھی نہیں گزرا تھا کہ بیوہ ہو گئی۔یہ سوگوار حُسن جگنو میاں کے دل پر قیامت ڈھا گیا۔۔۔ان کا دل زورزور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی ابھی مصنوعی سانس دلانے کے عمل کے بعد دل نے از سرِ نو دھڑکنا شروع کیا ہو۔۔۔جسم میں گرم گرم لہو اُچھلنے لگا۔۔۔اور مردہ جذبات پھریریاں لے کر زندہ ہو گئے۔

فاتحہ کے خوان باہر لے جائے گئے۔۔۔تو امّاں اپنے بیٹے سے لپٹ کر رونے لگیں۔۔۔جو سکتے کی کیفیت میں سارے جہاں سے بے نیاز کھڑا ایک ٹِک بتول کو دیکھ رہا تھا۔لڑکیاں ان کے پہلو سے لگی سِسک رہی تھیں اور دونوں بیٹے پیروں سے پلٹے بلک رہے تھے۔لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے سارے منظر اور سارے لوگ غائب ہو چکے تھے۔انہیں بتول کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔۔۔اور پھر جس نے سنا گنگ رہ گیا۔

جگنو میاں بتول سے عقد کرنا چاہتے تھے۔اگر بات صرف ''چاہنے'' کی حد تک رہتی تب بھی کوئی اعتراض نہ کرتا۔لیکن وہ تو اتنے بیتاب تھے کہ انتظار کے جاں گُسل لمحوں پر لعنت بھیج رہے تھے۔ایک بار پھر ان پر عشق کا دورہ پڑ گیا تھا۔کل تک جو لوگ ان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔۔۔اور ہمدردی جتانے میں پیش پیش تھے اب وہی انہیں ملامت کر رہے تھے۔۔۔ضویا سے محبت کا دعویٰ کرنے والے جگنو میاں جو محبوب بیوی کی قبر پر گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔۔۔اب بتول کے گھر کے چکّر کاٹ رہے تھے۔میلا لباس، الجھے بکھرے بال، اور داڑھی کا جنگل سب قصہَ پارینہ بن گئے تھے۔اب تو وہ اُجلے اُجلے، مہکے، مہکے پندرہ سال پہلے والے جگنو میاں نظر آتے تھے۔

زبیدہ بیگم شرمندہ تھیں۔بچے حیران تھے۔۔۔اور دنیا والے انگشت بدنداں تھے کہ ابھی تو ضویا کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔۔۔اور یہ شادی کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔انہیں تو بیٹیوں کی شادی کرنا چاہیے تھی۔۔۔مانا کہ مرد ہیں۔ نوجوان نہ سہی جوان تو ہیں۔دوسری شادی کرنا کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔۔۔لیکن عشق؟ اور محبت کا چکّر! بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے والی بات تھی؟

جگنو میاں نے ایک بار پھر زہر کھانے کی دھمکی دی۔''آخر یہ مرد کتنی بار عشق کرے گا۔۔۔؟ کتنی بار زہر کھانے کی دھمکی دے گا؟ اگر ''وہ'' عشق تھا تو یہ کیا ہے۔۔۔؟''

زبیدہ بیگم نے ایک دن جل کر کہہ دیا کہ ''کھالو زہر تمہیں ذرا معلوم تو ہو کہ زہر کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟''

زہر کون کھاتا اور جان کون دیتا۔جان ہی دینا ہوتی تو اس وقت دیتا جب ضویا نے دنیا چھوڑ دی تھی۔

ضویا کی پہلی برسی ہوئی تو جگنو میاں کے سوا سب ہی موجود تھے۔وہ تو بتول کے ساتھ ہنی مون منانے جا چکے تھے۔

☆

- بقیہ -

''خوبصورت افسانوں کا آسمان''

''اب آ بھی چکو۔'' پرکاش نے پکارا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔اور باہر آ گئی۔بستر پر لیٹی تو اس پر تھکن کا غلبہ ہونے لگا، پرکاش نے بتی بجھا دی اور پھر وہ اس پر اس طرح ٹوٹ پڑا جیسے ایک وحشی درندہ اپنے شکار پر ٹوٹتا ہے۔شانتی کا جی چاہا کہ وہ دوڑتی ہوئی جائے اور کومشی کے سینے سے لگ کر اس کے موٹے موٹے ہونٹوں کو عقیدت اور احترام سے چوم لے۔جس نے ڈاکو ہونے کے باوجود اس کے ''ماں'' ہونے کا بھرم رکھ لیا تھا۔۔۔لیکن یہ پرکاش اس کو کبھی کسی حالت میں معاف نہیں کرتا۔اس کو کیا کہیں گے؟ پتی ہونے کا مطلب یہ بھی تو نہیں ہے کہ وہ اس کی کوکھ میں پلنے والے اپنے بچے کا بھی خیال نہ کرے۔جسے اس کے نام کے ساتھ اس دنیا میں آنا ہے۔اور آج اس نام اور حق کو بنائے رکھنے کے لیے ایک ڈاکو کا دل پسیج گیا۔وہ چاہتا تو اس کو لوٹ سکتا تھا۔لٹیرا وہ نہیں۔۔۔پرکاش ہے، اس کا پتی جو اس کا ریپ کر رہا ہے۔'' (لٹیرا)

مسرور جہاں انسانیت اور اس کی آفاقی قدروں کو پہچانتی ہیں ان سے محبت کرتی ہیں اور کسی بھی ایسی تحریر کو پنپنے نہیں دیتی ہیں جو آدمیت اور انسانیت کی عظمت کو مجروح کر دے۔

یہ واضح ہے کہ مسابقت اور تصادم انسانوں کو بنیادی خصوصیات ہیں اور زندگی کی تگ و دو میں ان کے بغیر ترقی و کامیابی کا ہونا مشکل ہے مگر ساتھ ساتھ مطابقت اور تعاون کا عمل انسانوں میں توازن و تناسب اور سماجی شعور پیدا کر کے ان کو صالح اور صحت مند معاشرے کی تشکیل اور پرامن و پُرسکون زندگی گزارنے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔مسرور جہاں اثرات کا جائزہ لیتی ہیں اور فکر و درک و احساس سے گزرتی۔

نئی بستی

ناول کا باب

مسرور جہاں

بھگوان غریبوں کو پیدا تو بڑے طمطراق سے کرتا ہے لیکن پھر انہیں ایسا بھولتا ہے کہ بس پھر مرنے ہی کے وقت یاد کرتا ہے۔اور اگر غریب کو مرنا نہ ہوتا تو شاید اس وقت بھی انہیں یاد نہ کرتا۔لیکن اس جگہ تو اوپر والا خود ہی ذرا مجبور سا ہو جاتا ہے۔کیونکہ مرنے کا کام زیادہ سے زیادہ یہ غریب ہی انجام دیتے ہیں۔ دولت والوں کو تو مرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی پھر ان کے سِر اتنے جھگڑے رگڑے ہوتے ہیں کہ اگر آئے دن وہ سب مرنے لگیں تو دنیا کا سارا کام ہی چوپٹ ہو جائے کیونکہ دنیا کی باگ ڈور سچ پوچھو تو انہیں دولت والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔لہٰذا انہیں تو مجبوراً اور ضرورتاً جینا پڑتا ہے اور ان کے بدلے مرنے کا کام غریب کرتے ہیں۔سیلاب، سوکھا، وبائی بیماریاں ،غریبی، بھوک، فساد، حادثات، یہ سب غریبوں ہی کو دبوچتے ہیں۔ جوان سب سے مرنے سے بچ جاتے ہیں وہ سچ مچ بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔اور یہ سخت جان، بے غیرت اور ضدی لوگ زبردستی جینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ نچلی ذات کے یہ ہٹ دھرم غریب لوگ اونچے طبقے والوں کو زہر ہی لگتے ہیں۔خاص طور سے اس لیے بھی کہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور موروثی بدنصیبوں کے باوجود یہ نہ صرف جیتے ہیں بلکہ اپنے وجود اور اپنی شخصیت کو مختلف طریقوں سے منوانے کی بھی ضد کرتے ہیں۔ بستی کے نیتا گردھاری لال جی نے مختلف طریقوں سے بھولا عرف بھلئی کو سمجھانا چاہا کہ تو ''چمار'' ذات میں پیدا ہوا ہے اس لیے تجھے بھی وہی کام کرنا ہوگا جو تیرے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔لیکن بھولا عرف بھلئی نے ان کی کوئی تاویل نہیں مانی اور صاف انکار کر دیا گردھاری لال جی سے اس کی شکایت اس کے باپ کندھئی نے کی تھی۔ بھلئی کو تو شروع ہی سے چمڑے کی بُو سے قے آتی تھی۔ بھیگے ہوئے چمڑے کو دیکھ کر اسے مَری ہوئی چھچھوندر کا خیال آتا تھا۔اور وہ اس بدبودار چمڑے کو ہاتھ تک لگانے کا روادار نہیں تھا۔کندھئی کے جوتے کھا کر بھی اس نے چمڑے کو ہاتھ نہ لگایا حتیٰ کہ باپ نے ہار کر صبر کر لیا کہ لونڈا اُبگڑ گیا ہے۔

کندھئی کے باب دادا گاؤں میں رہتے تھے۔لیکن یہی کام کرتے تھے۔کندھئی شہر چلا آیا۔اور شروع میں اس نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کو جوتے گانٹھے پھر اس نے ایک چھوٹی سی گمٹی فٹ پاتھ پر کھڑی کر لی۔اور اب اس پر بیٹھ کر جوتوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔سوچا تھا کہ بھولا اس کے کام کو سنبھالے گا تو وہ نئے جوتے بنانا شروع کر دے گا۔ اور اپنی دوکان کو بڑھالے گا لیکن اس نے کندھئی کے سارے ارمانوں پر پانی ہی پھیر دیا۔اور باپ دادا کی وراثت سنبھالنے کے بجائے محنت مزدوری کرنے لگا۔منڈی میں جھوّا لگایا۔اینٹ گارا ڈھویا، قلی گیری کی لیکن ان کاموں میں آمدنی کم ہوتی تھی۔ایک دو دن کام ملتا تو چار دن خالی گزر جاتے۔ بیاہ تو کم عمر میں ہو چکا تھا اب وہ چار بچوں کا باب بن گیا تھا اور خرچ بڑھ گیا تھا۔جس کے لیے اس کی آمدنی بہت کم پڑتی تھی۔کندھئی کے مرنے کے بعد اس نے وہ گمٹی اور بچا کھچا سامان، اوزار سب کچھ بیچ ڈالے۔اور اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے جوتے گانٹھنے کے کام کا نام نشان مٹا ڈالا۔اس نے تو طے کر رکھا تھا کہ وہ کبھی اپنے بچوں کو یہ ذلیل کام نہیں سکھائے گا۔اور کسی اچھے کام میں ان کو لگائے گا۔دنیا میں سینکڑوں کام ہیں۔

مہنگائی کے ساتھ ساتھ بھلئی کی مزدوری تو بڑھی لیکن اس کے ساتھ گھر کا خرچ بھی بڑھ گیا مجبوراً وہ رکشہ چلانے لگا۔اس میں اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مالک کو کرایہ دے کر بھی دس پندرہ روپے بچ جاتے تھے اور دونوں وقت بچوں کو پیٹ بھر روٹی مل جاتی تھی اور بُرا بھلا تن بھی ڈھک جاتا تھا۔لیکن رکشہ چلانے سے بھلئی کی صحت خراب رہنے لگی۔کبھی بخار آ جاتا،کبھی کھانسی آنے لگتی، کبھی ہاتھ پیروں میں درد ہو جاتا اور وہ اپنی بیماری کی پرواہ کیے بغیر رکشہ چلاتا رہتا۔سردی، گرمی، برسات ہر موسم میں رکشہ چلانا مشکل ہوتا۔لیکن لُو کے تھپیڑوں میں یا بھری برسات میں سواری سے دگنے پیسے مل جاتے۔کڑکڑاتے جاڑوں میں جب لوگ گرم کپڑے پہننے کے باوجود گھر سے نکلتے جھجکتے تھے۔ بھلئی دُور دور کی سواریاں ڈھوتا تھا۔صبح منہ اندھیرے سٹی اسٹیشن کے باہر رکشہ لے کر کھڑا رہتا کہ اس وقت سواریاں اچھے پیسے دیتی تھیں۔لیکن موسوں کے وار سہتے سہتے بھلئی کی طاقت جواب دینے لگی اور ایک دن جب وہ چار باغ سے علی گنج کی سواری لے کر چلا تو راستے ہی میں اسے چکّر آ گیا۔رکشہ روک کر وہ سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ سینے میں شدید درد ہو رہا تھا۔اور تب ہی اس کو ایک بڑی سی قے ہوگئی اور اس نے جیتا جیتا خون اگل دیا۔سواریاں تو رکشہ سے اتر کر ''ہے رام۔ہے رام'' کرتی دوسرا رکشہ پکڑ کر آگے بڑھ گئیں۔وہ وہیں بے سُدھ ہو کر لیٹ گیا کچھ رکشہ والے دوڑ کر آ گئے کسی نے پانی پلایا، کسی نے سینہ سہلایا اور جب اس نے گھر کا پتہ بتا دیا ایک رحم دل رکشہ والا اس کو اسی کے رکشہ پر ڈال کر گھر پہنچا گیا۔ بھلئی کی عورت تو اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور رونے لگی۔لیکن اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ جا کر فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھا دیتی۔ وہ تو بڑی ہی صابر عورت تھی بھلئی جتنے پیسے اس کو دیتا تھا اس میں گھر کا خرچ چلاتی تھی۔اور روپے دو روپے بچا بھی لیتی تھی لیکن جس دن بھلئی کی طبیعت ماندی ہو جاتی اور وہ رکشہ کھڑا کر دیتا اس دن وہ انہیں بچائے ہوئے پیسوں میں روٹی پانی کا خرچ چلاتی۔ بچے بیمار ہوتے تو وہ سارا سارا دن بلرام پور ہسپتال میں ڈاکٹروں اور دوائیوں کی لائین میں لگی رہتی لیکن بچوں کے علاج میں کمی نہیں کرتی تھی۔اپنے جگر کے ٹکڑوں کو وہ نظروں کے سامنے مرتے کیسے دیکھ سکتی تھی۔اکثر وہ سوچتی تھی کہ بھلئی نے اپنے باپو کا کہنا نہ مان کر بُرا کیا۔ اچھی بھلی دوکان تھی اسی پر لگا رہتا۔تو بچے بھی اس کے پاس کام سیکھ کر دو پیسے کمانے کے قابل ہو جاتے اور بڑے ہو کر باپ کا ہاتھ بٹاتے۔لیکن وہ بھلئی سے کبھی

شکایت نہ کرتی سب سے بڑالڑکا اسکوٹر کا کام سیکھ رہا تھا، دوسرا موٹر کی رنگائی پر لگا تھا۔لیکن ابھی تو ان کو ایک دھیلا بھی نہیں ملتا تھا الٹے دو چار آنے ان کو دینا ہی پڑتے تھے ان کے بعد دو لڑکیاں تھیں اور ابھی بہت چھوٹی تھیں لیکن اب جو بھُلئی کھاٹ سے لگ گیا تو روٹی کا سہارا بھی ختم ہوگیا۔

اس نے بھُلئی کو اسپتال میں دکھایا۔ جہاں وہ بھرتی کرلیا گیا۔ڈاکٹر نے اسے پھل دودھ انڈا وغیرہ بتایا۔ وہ غریب ہاتھ جوڑ کر بڑے ڈاکٹر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اور اپنی بپتا سنائی تو بڑے ڈاکٹر نے بھُلئی کے لیے دودھ، انڈا اور مکھن اسپتال سے دینے کا آڈر لکھ دیا۔ اس کی طرف سے تو ذرا سا اطمینان ہوا لیکن گھر پر بچے اس کی جان کو روتے تھے۔ دوڑ بھاگ کر کے اس نے ریور بینک کالونی میں تین چار گھروں میں جھاڑو پوچا لگانے کا کام پکڑلیا۔ اس طرح کم از کم اسے بچا کھچا کھانا گھروں سے مل جاتا تھا۔ اور بچوں کے لیے پھٹے پرانے کپڑے بھی مل جاتے تھے۔ دو مہینے کے بعد بھُلئی اسپتال سے گھر آیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اب وہ رکشہ نہیں چلائے گا۔ بھُلئی پہلے ہی پتنی کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ یہ سن کر رونے ہی لگا۔

''تیرا متبل (مطلب) ہے کہ اب ہم بیٹھ کر کھائی اور محنت مجوری کرے تو۔''

''ہاں۔اے ہی متبل آئے'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔
اب ہم بالکل ٹھیک ہُوئی گئے۔ کوئی دُوسر کام کرنے کی کوسس کرب۔

''کون سا دُوسر کام۔ کچھ ہم بھی تو سُنی۔''
''ابھی کا کہہ سکت ہے۔ یہ تو دیکھے سے پتہ چلی۔''
''کچھ نہ پتہ چلی۔ گھر سے نکسے کی دیری آئے دئ رکسہ گھسیٹے لگیو''
''ناہیں رکسہ اب ہم سے نا چلی۔''

بھُلئی نے نیچی آواز میں کہا اور گھر سے نکل گیا۔ وہ سیدھا اپنے پرانے مالک کے پاس پہنچا اور اس سے رکشہ دو گھنٹے کے واسطے لے لیا نزدیک کی ایک سواری پکڑ کر وہ چلا۔ تو لگا کہ آج پہلی بار رکشہ چلا رہا ہے۔ پیڈل پر پاؤں ٹھیک سے نہ مارے جاتے۔ ذرا دور چل کر اس کی سانس پھولنے لگی۔ سواریاں اتر گئیں۔ تو وہ چھاؤں میں رکشہ کھڑا کر کے گدی پر لیٹ گیا اور سستانے لگا۔ ذرا دم میں دم آیا تو ایک سواری اور پکڑ لی پھر ہمت جواب دے گئی اور اس نے مالک کے ہاں رکشہ کھڑا کر دیا۔ اس کی جیب میں آٹھ روپے چار آنے تھے۔ مالک نے پیسہ نہیں لیا تھا وہ اس کی حالت سے واقف تھا۔ دو گھنٹے کے دو روپے لے لیتا تو اس کے پاس چھ روپے ہی بچتے۔ برسوں سے وہ اس کا رکشہ چلا رہا تھا کبھی کرائے میں جھک جھک نہیں کی تھی۔ روز پورا پیسہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا اب وہ طاقت نہ تھی نہ اتنی کمائی کر سکتا تھا۔ تو ایسے وقت میں اس سے ہمدردی کرنا اس کا فرض تھا۔

بھُلئی گھر واپس گیا۔ تو کھاٹ پر بے دم ہو کر گر پڑا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت اس کی عورت گھر پر نہیں تھی۔ ورنہ سوال جواب سے اس کا ناک میں دم کر دیتی اور اگر اسے پتہ چل جاتا کہ وہ رکشہ چلا کر آ رہا ہے تو رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیتی اور اس سے بھی ناراض ہو جاتی۔ پھر اس کے بعد تو بھُلئی کا معمول ہو گیا کہ وہ اپنی پتنی کے کام پر جانے کے بعد مالک سے رکشہ لے کر دو تین گھنٹے چلاتا۔ دس پانچ روپے مل جاتے۔ مالک کو بھی دو روپے دے دیتا جو کچھ پیسے بچتے اس سے کھانے پینے کا سامان لے آتا۔ چند روز تو وہ گھر والی کو بہانے سے ٹالتا رہا۔ کبھی کہتا مالک سے پیسے اُدھار لیے ہیں اور کبھی کہتا کہ مالک کے رکشوں کی صفائی کی تھی، کبھی کوئی اور بہانہ کر دیتا۔ لیکن روز تو بہانہ چل نہیں سکتا تھا اس لیے عاجز آ کر ایک دن اس نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ دو تین گھنٹے کے لیے مالک سے رکشہ لے کر چلاتا ہے۔ اس کی پتنی ہیرا کو دکھ تو بہت ہوا لیکن اس کی کمائی میں چھ جانوں کی روٹی نہیں چل سکتی تھی اس لیے چپ ہو گئی۔ پھر تو یہ ہونے لگا کہ کبھی بھُلئی کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی اور کبھی کچھ آرام ہو جاتا۔ ہیرا اسپتال سے اس کے لیے برابر دوائیں لاتی تھی لیکن محنت کا کام اوپر سے دودھ اور پھل کا نام نہیں۔ طاقت گھٹتی چلی گئی۔ جب زیادہ اس کی حالت بگڑنے لگتی تو اسپتال میں بھرتی کرا دیتی۔ کم از کم وہاں اسے دودھ، مکھن اور پھل تو ملتے تھے۔ بلکہ اب تو بھُلئی کو اسپتال سے چھٹی دی جاتی تو ہیرا ڈاکٹروں کی خوشامد کر کے اسے کچھ دن اور اسپتال میں رکھنے کی بنتی کرتی لیکن اسپتال والوں کے لیے ایک وہی مریض تو نہیں تھا اس کے جیسے بھوکے بیمار اور مفلس کتنے ہی مریض تھے جن کے لیے بھُلئی کی چارپائی خالی کرانا ضروری ہوتا۔

ایک روز ہیرا کام سے گھر واپس آئی تو دیکھا کہ اس کے دروازے پر بھیڑ جمع ہے۔ بھُلئی چار پانچ دن پہلے ہی اسپتال سے گھر واپس آیا تھا اس کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کا جی دھک سے ہو گیا۔ وہ سہمی سہمی سی بھیڑ کے قریب پہنچی۔ تو اسے بھُلئی نظر آ گیا۔ وہ لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ چھوٹی لڑکیاں بھی باپ کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ اس نے بھُلئی سے پوچھا۔

''کا ہوئے گیا؟''

بستی میں مجمع اس وقت اکٹھا ہوتا تھا جب کوئی واقعہ یا حادثہ ہو جاتا تھا۔ بھُلئی نے صرف سِر ہلا دیا۔ لیکن اس کے سِر ہلانے سے وہ کیا سمجھتی۔ اس نے پاس کھڑی میکو کی عورت سے پوچھا۔

''دیدی کا بات ہے؟''

''ارے کا پوچھتی ہو بہنی۔ ایسا کھراب جمانہ آئے گیا۔۔۔ رام۔۔۔رام۔۔۔؟ میکو کی عورت نے دیدے پھاڑ کر کہا۔

''پَر ہُوا کا؟''

''وہ جو سِدّیک کے بروبر والا جھونپڑا آئے ارے وئ۔۔۔ جاں کھلیک رکسہ والا۔۔۔ جی کی پتلی پتلی اَورت آئے۔۔۔ تو بچاری اُوئ بجّار گئی رہے۔۔۔ بچے سب باہر کھلیت رہیں۔ اُو کی بڑی لونڈیا۔۔۔ جھونپڑے

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ کیجیے

''گدائے مصطفےٰ''

نعتِ رسولِ مقبولؐ

لیا جو نام محمدؐ ہوا دہن روشن
دہن کا ذکر ہی کیا ہو گیا بدن روشن

نگین اسم محمدؐ تری دمک کے نثار
جبین دہر کی کر دی شکن شکن روشن

ہوئے تھے نور مجسم کے روبرو تخلیق
اسی لیے ہے مہ و خور کا پیرہن روشن

میں فکرِ نعت میں تھا حشر میں کہ بولے ملک
یہ کون شخص ہے جس کے ہیں جان وتن روشن

کسی نے چاند کسی نے کہا سورج ہے
ہوئی جو نعت سر آسمان فن روشن

خدا گواہ بجز سرور جہاںؐ قیصرؔ
کسی کا دیکھا نہیں سایۂ بدن روشن

قیصر نجفی
(کراچی)

نعت نبیؐ

زندگی ہی زندگی ہے کوچۂ سرکار میں
روشنی ہی روشنی ہے کوچۂ سرکار میں

رونقیں ہی رونقیں ، ارضِ نبی پر جلوہ گر!
دلکشی ہی دلکشی ہے کوچۂ سرکار میں

جس طرف دیکھو، حیاتِ جاوداں آئے نظر
تازگی ہی تازگی ہے کوچۂ سرکار میں

گمرہی کا ہر تصور، ہے وہاں پر بے اثر
رہبری ہی رہبری ہے کوچۂ سرکار میں

جو بھی پہنچا ہے درِ اقدس پہ منزل پا گیا!
بات سب کی ہی بنی ہے کوچۂ سرکار میں

کُھلتے جاتے ہیں وہاں، کیا کیا رموزِ کائنات
آگہی ہی آگہی ہے، کوچۂ سرکار میں

ہوں گدائے مصطفےٰ، میں بھی انیسؔ بے نوا
ہر گلی پہچانتی ہے کوچۂ سرکار میں

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

چُنوا کا حلالہ

شموئل احمد

(پٹنہ، بھارت)

چنوا کالاکلوٹ تھا۔اور لگائی غزال چشم تھی۔سروجیسا قد،سڈّول بازو.....بال کمر تک لہراتے ہوئے اور جامنی کساوٹ سے بھرپور لب ورخسار۔

غریب کا حسن سماج کی آنکھوں میں چبھتا ہے۔حسن طبقہ اشرافیہ کے لیئے ہے۔کبھی سنا کہ کوئی شہزادی بدصورت بھی تھی؟یا کسی دلت کے آنگن میں کبھی چاند بھی اترا ہو؟لیکن چنوا کے پہلو میں چاند ہنستا تھا اور بلبل چہکتی تھی اور مولوی تاثیر علی یہ منظر غلیل کے پیچھے سے دیکھتے تھے۔ان کے سینے میں دھواں سا اٹھتا....کنجڑے کی بیوی اتنی حسین....؟اتنی....؟

چنوا پھل بیچ کر گذارہ کرتا تھا۔کوئی دکان نہیں تھی۔ایک ٹھیلہ تھا جس پر پھلوں کو سجائے گلی گلی ہانک لگاتا۔شام کو تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو بچے ہوئے پھل لُگائی کے سپرد کردیتا۔وہ اچھے پھلوں کو چن کر الگ کر دیتی۔جو پھل سڑنے کے قریب ہوتے انہیں تراش کر چنوا کو کھلاتی۔چنوا نے بکری بھی پال رکھی تھی۔ایک میمنا بھی تھا۔بکری کو داڑھی تھی لیکن دودھ دیتی تھی۔لُگائی چنوا کو بکری کا دودھ بھی پلاتی لیکن دودھ پینے میں وہ آنا کانی کرتا۔وہ ضد کرتی تو کٹورہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیتا کہ تو بھی پی....دونوں باری باری ایک ہی کٹورے سے دودھ پیتے۔

جامع مسجد کے بہت پیچھے ندی کی طرف پڑتی زمین تھی جہاں التماس کے درخت تھے۔وہاں پر کچھ مزدوروں کی جھوپڑیاں تھیں۔چنوا نے بھی وہاں اپنی مڑئی گاڑ رکھی تھی۔اس کی مڑئی کشادہ تھی۔چنوا کی مڑئی میں دھوپ جیسے آٹھوں پہر ٹھہر گئی تھی۔کسی گوشے میں اندھیرا نہیں تھا۔چنوا کا من چنگا تھا اور کٹھوتی میں گنگا تھی۔اس کو کسی سے شکائت نہیں تھی۔اس کو سبھی اچھے لگتے تھے۔پھر بھی ایک کسک تھی۔شادی کو دو سال ہو گئے تھے اور للنہ نہیں تھا کہ مڑئی میں کلکاریاں بھرتا۔چنوا پھل بیچنے نکلتا تو لگائی میمنے سے کھیلتی۔وہ اچھل کر بھاگتا تو اس کے پیچھے دوڑتی اسے پکڑ کر سینے سے لپٹا لیتی اور دلار کرتی ''اتھن پتھن بدھوا متھن''۔اس نے میمنے کا نام رکھا تھا بدھوا۔دلتوں کے نام بھی دلت کی طرح ہوتے ہیں،بدھوا...چنوا....کلوا...منوا......طبقہ اشرافیہ کا میر قاسم علی دلت کے یہاں کسوا ہو جاتا ہے اور رضوان اللہ رجوا۔

شروع شروع میں چنوا مولوی تاثیر کے گھر کے سامنے والے چوک پر ٹھیلا لگاتا تھا۔لگائی بھی ساتھ ہوتی۔کوئی گاہک آتا تو پھل تراش کر دونے میں پیش کرتی۔دیکھتے دیکھتے گاہکوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی۔گھنٹے دو گھنٹے میں سارا پھل بک جاتا۔لگائی نے محسوس کیا کہ سب کی آنکھوں میں یرقان ہے۔جموا ترچھی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور خواہ مخواہ بھی ٹھیلے کے پاس کھڑا رہتا۔جموا مولوی تاثیر علی کا ایلچی تھا۔مولوی تاثیر علی آنکھوں میں جلن لیئے ادھر سے گذرتے تھے۔

لُگائی سب کی نگاہوں سے پریشان ہوگئی۔اس نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔

ایک دن تاثیر علی نے ایلچی کے زریعہ چنوا کو بلا بھیجا۔چنوا دوڑا دوڑا آیا۔مولوی تاثیر علی نے ایک پیٹی انار کی فرمائش کی۔چنوا انار کی پیٹی لے کر پہنچا تو دبی زبان میں بولے۔

''لگائی کو بھیج دیا کر۔ملکائن کو تیل لگا دیگی۔بیس روپے روز دوں گا۔''

لگائی ایک دن گئی دوسرے دن نہیں گئی۔چنوا نے بھی پھر نہیں بھیجا۔ملکائن بار بار ڈکار لیتی تھی اور مولوی تاثیر پردے کے پیچھے سے جھانکتے رہتے۔

چنوا اپنی زندگی سے خوش تھا.....،بس ایک کسک تھی....للنہ ہوتا تو مڑئی میں ٹپ ٹپ چلتا۔دونوں ہر جمعرات کو گھورن پیر کے مزار پر اگر بتّی جلاتے... یا پیر...؟ پیر سن نہیں رہے تھے لیکن چنوا کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔کسی نے کہا کہ جمعہ کی نماز میں دعا قبول ہوتی ہے۔چنوا جمعہ کی نماز بھی پڑھنے لگا لیکن لگائی کی گود ہری نہیں ہوئی۔

معلوم ہوا کہ دیوی ماں کے مندر سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔کھپّر پوجا کے موقع پر ماں دیوی کی ڈالی یاترا نکالی جاتی تھی.مندر کوئی چار سو سال پرانا تھا جس کی تعمیر میں الرکھو میاں اور سپھو میاں راج مستری کا بھی ہاتھ تھا۔ڈالی یاترا کی روایت گزشتہ دو سو برسوں سے چلی آرہی تھی۔کہتے ہیں کہ یاترا کے دوران آگ سے نکلی خوشبو جہاں تک جاتی ہے وہاں قدرتی عذاب نازل نہیں ہوتے اور مہاماری بھاگ جاتی ہے۔ایک زمانے میں پھلواری شریف میں مہاماری پھیلی تھی۔ماں نے خواب میں ہدائت دی کہ میری یاترا نکالو اور کھپّر پوجا کرو۔یاترا نکالی گئی اور تب سے کھپّر پوجا جاری ہے اور کہیں کوئی بیماری نہیں پھیلی۔

اس بار پرانی جگہ سے قریب بیس فٹ ہٹ کر وسیع پنڈال کی تعمیر کی گئی تھی جس میں پیلے کپڑے اور تھرماکول کا استعمال کیا گیا تھا۔اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ پنڈال اونچے برقی تاروں سے دور رہیں۔پنڈال کی اونچائی ساٹھ فٹ اور چوڑائی پچیس فٹ رہی ہوگی۔پنڈال کی سجاوٹ دیدنی تھی۔جگہ جگہ رنگین قمقموں کے ساتھ رنگ برنگ کی برقی چرخی اور رالیکس بھی لگائے گئے تھے۔

اس بار یاترا میں پچاس ہزار لوگ شامل ہوئے۔۔صبح سے ہی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔عورتیں بھجن گانے میں مصروف رہیں۔جل ابھیشیک کے ساتھ پوجا ارچنا بھی ہوتی رہی۔دور دراز سے لوگ منّتیں لے کر ماں دیوی کی پرتیما کے آگے جھولی پھیلا کر فریاد کر رہے تھے۔ان میں چنوا اور اس کی لگائی بھی شامل تھے۔چنوا آنکھیں بند کیئے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور لگائی آنچل پھیلائے فریاد کر رہی تھی۔۔۔ہے مائی۔۔۔ایگو للنہ چاہیں۔۔۔ایگو للنہ۔۔۔اس نے آرتی بھی کی۔رات ساڑھے سات بجے مندر کے پجاری مندر کے احاطے سے کھپر میں آگ لے کر نکلے تو جے ماں کالی کا نعرہ لگاتے ہوئے ہجوم بھی شامل ہوگیا۔یاترا میں عورتیں بچّے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔یاترا جس سڑک اور گلی سے گذرتی لوگ نعرہ لگاتے ہوئے شامل ہو جاتے۔چنوا اور لگائی بھی ساتھ

تھے۔ یاترا ٹم ٹم پڑاؤ اور مسجد چوراہا سے ہوتے ہوئے صدر بازار سے گذری تو جموا کی نظر چنوا پر پڑ گئی۔ جموا اس وقت بنارسی کی دکان سے کھینی خرید رہا تھا۔ ڈالی یاترا پوٹھیا بازار اور بلاک آفس سے ہوتے ہوئے مندر کے احاطے میں لوٹ آئی۔ ماں دیوی کی آرتی کے بعد پرشاد تقسیم ہوئے۔ دونوں پرشاد لے کر گھر لوٹے۔

صبح عجیب بدرنگ تھی۔ میمنا خاموش تھا اور مڑئی سے باہر کوّں کا شور تھا۔ سیاہ بادل گھر آئے تھے۔ ہوائیں ساکت تھیں۔ چنوا کا دم گھٹنے لگا۔ وہ مڑئی سے باہر آیا تو کوّے کا شور بڑھ گیا۔ چنوا حیرت سے افق کے مشرقی کناروں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے۔ سامنے التماس کے پیڑ پر ایک گدھ بیٹھا تھا۔ وہ اڑا تو پیڑ کے پیچھے سے جموا نمودار ہوا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مڑئی کی طرف آرہا تھا۔ لگائی نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو اندر چلی گئی۔ جموا کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اس نے جارحانہ انداز میں مولوی تاثیر علی کا فرمان سنایا کہ فوراً دربار میں حاضر ہو۔ چنوا پہلے خوش ہوا کہ انار کی مانگ ہوگی۔ ایک پیٹی انار میں اسے تین سو کا منافعہ ہوتا تھا۔ لیکن جموا کے جارحانہ رویّے سے اسے تشویش ہونے لگی۔ چنوا نے پوچھا کہ کس لیئے بلایا ہے تو اس نے ٹکا سا جواب دیا کہ جانے پر معلوم ہوگا۔ چنوا نے دوبارہ پوچھا تو جموا کرخت لہجے میں بولا۔

''تو ہندو ہو گیا ہے۔''

مولوی تاثیر علی مسند پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

''تو کھپّر پوجا میں شامل تھا۔''

چنوا نے اعتراف کیا کہ وہ یاترا میں شامل تھا۔

''تو نے دیوی کے نعرے لگائے۔''

چنوا کا جواب تھا کہ اللہ ایشور ایک ہی نام ہے تو دیوی سے بھی مانگ لیا اللہ سے بھی مانگ لیا۔ مولوی تاثیر علی گرجے۔

''کمبخت....کفریہ کلمات ادا کرتا ہے۔''

چنوا مڑئی میں واپس آیا تو عورتیں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔

''چھی چھی۔۔۔دیوی پوجا کرتی ہے۔''

خبر پھیل گئی کہ چنوا ہندو ہو گیا ہے۔

مولوی تاثیر علی نے غلیل سمبھالی۔ امارت دین کا رخ کیا۔ مفتی دین نے فتویٰ جاری کیا۔

''کفریہ کلمات کہنے، دیوی کے نعرے لگانے اور اللہ کے ساتھ ایشور کی پوجا کرنے پر پھل فروش چنوا خارج از اسلام ہوا۔ چنوا مرتد قرار دیا جاتا ہے اور اس کی بیوی نکاح سے خارج ہوئی۔ ایسے شخص پر تجدید ایمان، تجدید نکاح اور توبہ استغفار لازم اور ضروری ہے۔ جب تلک تجدید ایمان تجدید نکاح اور توبہ استغفار نہ کرے تمام مسلمانوں کے لیئے اس سے کسی طرح کے تعلقات رکھنا شرعاً جائز نہیں۔ ایسے شخص کے فتنہ سے خود بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں۔''

چنوا کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ خلا میں ٹنگ گیا۔ اب ٹھیلہ کہاں لگائے۔ لوگ حقارت سے گھورتے ہوئے گذر جاتے۔ وہ کسی سے معاملات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب مسلمان نہیں تھا۔ اگر مر جاتا تو قبر نصیب نہیں ہوتی۔ کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جہاں بھی جاتا فتویٰ کو خود سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔

چنوا نے مولوی تاثیر علی کے پاوں پکڑ لیئے۔ مولوی تاثیر اسے لے کر امارت دین آئے۔ امارت سے اعلان جاری ہوا۔

''پھل فروش چنوا نے امارت دین آ کر توبہ کی ہے۔ اپنے غیر شرعی بیان پر ندامت و شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے مفتی امارت دین اور دیگر علما کے سامنے اپنی غلطیوں پر توبہ و استغفار کیا اور ایمان کی تجدید کی اور کلمہ شہادت پڑھا۔ وہ اب مسلمان ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کیا جائے۔

چنوا اب مسلمان تھا۔

اور لگائی.....؟

لگائی نکاح سے خارج ہو چکی تھی۔ وہ مڑئی میں میمنے کو لپٹائے زار و قطار رو رہی تھی۔ چنوا سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے سینے میں جلن تھی۔ آنکھوں میں دھواں تھا۔ چنوا اس کو اب چھو نہیں سکتا تھا۔ وہ حرام ہو چکی تھی۔ تجدید نکاح کے لیئے اس کا حلال ہونا ضروری تھا۔

حلال کون کرے؟

باہر التماس کے پیڑوں پر گدھ جمع ہونے لگے تھے مڑئی میں حبس کی فضا تھی۔۔ مڑئی کی دیوار پر ایک پتھر پڑا،

''نامحرم کو لے کر اندر بیٹھا ہے۔ باہر نکل۔''

''حرام کاری نہیں چلے گی۔''

''یہ زنا ہے۔''

مولوی تاثیر علی نے غلیل سمبھالی۔ جموا کو اشارہ کیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مڑئی میں گھسا۔۔

'مولوی صاحب سے حلالہ کرا لے'.....وہ اوروں سے بہتر ہیں۔''

لگائی کے سینے سے دلخراش چیخ نکلی۔ مڑئی میں اندھیرا چھا گیا۔ چنوا نے چاہا ہاتھ بڑھا کر لگائی کو تھام لے لیکن گدھ اندر گھسنے لگے۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کے شور میں لگائی کی چیخ دب گئی۔ اندھیرا گہرا گیا۔

چنوا کی مڑئی میں پھر روشنی نہیں ہوئی۔ اس کا دم گھٹ گیا۔ مڑئی قبر میں تبدیل ہو گئی۔ صبح صبح جموا چنوا کے مڑئی پہنچ گیا۔

امت نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ''اللہ ایشور تیرو نام۔

غلیل چلانے کا وقت آ گیا تھا۔ مولوی تاثیر علی نے چنوا کو بلا بھیجا۔

''مسلمان ہو کر تو نے دیوی دیوتا کی پوجا کی۔''

چنوا خاموش رہا۔ مولی تاثیر علی گرجے۔

''احمق! تو خارج از اسلام ہوا۔''

مولوی تاثیر علی نے امارت شریعہ کا رخ کیا۔

''بات ایک رات کی''

عذرا اصغر (کراچی)

اور آج ان کا خصوصی دن تھا۔

وہ سب کی سب سیٹھ بھاکڑہ جی کی کوٹھی کے بیرونی باغ میں جمع تھیں۔
بھاکڑہ جی کے مالی نے آج صبح ہی صبح لمبی لمبی گھاس کو مشین سے ہموار کیا تھا اور اب ان کے نیچے سبز مخمل کا ٹھنڈا فرش تھا جس میں سے ہری گھاس کی تازہ مخصوص خوشبو اٹھ کر ان کے گلابی، نازک نتھنوں میں گھس رہی تھی۔۔۔ سبز مخملیں فرش ان کے نرم نرم ریشم جیسے جسموں میں زندگی کی حرارت پیدا کر رہا تھا۔ نومبر کے مہینے کا پورا چاند فیاضی کے ساتھ اپنی ٹھنڈی اور روپہلی چاندنی دنیا پر لٹا رہا تھا اور فضا محبت آمیز سکوت میں لپٹی ہوئی تھی۔ عجیب دل فریب سا ماحول تھا اور وہ سب سیٹھ بھاکڑہ جی کی کوٹھی کے بیرونی باغ میں جمع تھیں۔ اپنا خصوصی دن منانے کے لیے۔۔۔ ان سب کے آزادی کے ساتھ اکٹھے ہونے کا یہی تو موقع تھا۔ ورنہ ان کی مالکائیں ایسی تھوڑی واقع ہوئی تھیں کہ پل بھر کو انہیں اپنے سے جدا ہونے دیتی تھیں۔ بیگم الطاف کی منّا تو بے حد باغی ہو چکی تھی۔ اس کا جب دل چاہتا اپنے لمبے لمبے سفید پنجوں سے بیگم الطاف کے کپڑے پھاڑ دیتی۔ ان کے ہاتھوں پر پڑے گھرونٹوں سے خون رسنے لگتا اور مرچیں سی لگتیں تو وہ منّا کے سفید مخمل جیسے جسم پر ایک دھپ مار کر کہتیں۔

''کمبخت نے مجھے کھسوٹ ڈالا۔ چل دفع ہو یہاں سے۔''

منّا ان کی گود سے چھلانگ لگا کر نیچے کود جاتی۔ بیگم الطاف جھریوں سے پھوٹتا ہوا خون اپنے ننھے سے رومال سے صاف کر کے ٹالکم پاؤڈر چھڑکنے لگتیں اور منّا بڑے غرور سے ایرانی قالین پر بیٹھی انہیں تکتی رہتی۔ تھوڑی دیر نہ گزرنے پاتی کہ منّا پھر بیگم الطاف کے سرسراتے کپڑوں میں چھپی بیٹھی ہوتی اور وہ دھیرے دھیرے اس کے نرم بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیر رہی ہوتیں۔

بیگم الطاف کے اسی لاڈ پیار نے منّا کی عادتیں خراب کر کے رکھ دی تھیں۔

منّا کو ویسے بھی کچھ زیادہ ہی اپنی شیخی بگھارنے کی عادت تھی۔ ورنہ ان میں سے کون تھی جو اپنی مالکن کی لاڈلی اور سر چڑھی نہ تھی۔ دادا بھائی شوگر والا کے گھر تو ان کا بڑا کنبہ تھا۔ صرف تین سال پہلے ان کے گھر بنو آئی۔ سفید اور لال دھبوں والی بنو۔ مسز دادا بھائی شوگر والا اسے دیکھتے ہی پھڑک اٹھیں۔

''ہائے، سویٹ، لولی، ویری چارمنگ بنو۔'' انہوں نے کھڑے پیر اس کا نام بھی تجویز کر دیا۔ بنو نے آہستہ سے اپنی بلوریں آنکھیں اٹھا کر مسز دادا بھائی شوگر والا کو دیکھا اور شرما کر گردن جھکالی۔ ان کی آنکھوں میں اتنا پیار تھا بنو کے لیے کہ بنو ان سے نظریں چار نہ کر سکی۔

بنو ایرانی نسل تو نہ تھی مگر اس نے بہر طور ایرانی ماں کا دودھ پیا تھا اور اس کے پیٹ سے جنم لیا تھا۔ البتہ اس کا باپ خالص پاکستانی تھا۔ ایران اور پاکستان کے مشترکہ ملاپ نے بنو میں عجیب طرح کا حسن پیدا کر دیا تھا۔ اور اس کی اسی دلکشی نے مسز دادا بھائی شوگر والا کا دل موہ لیا تھا۔ ہاں! مسز دادا بھائی شوگر والا کو بنو کی تنہائی کا بڑا دکھ تھا۔ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس کا اظہار ضرور کرتی تھیں۔ ''دیکھو نا یہ کتنا ظلم ہے بچاری بنو پر۔''

مگر مسز دادا بھائی شوگر والا کو زیادہ دن اس دکھ میں مبتلا رہنا نہیں پڑا۔ جلد ہی خوبصورت اور جسیم رینو مل گیا اور مسز دادا بھائی شوگر والا کے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا۔ بنو کے تو مزے آ گئے رینو کے آنے سے۔ اسے پتہ چلا کہ اصل میں زندگی اور اس کا لطف کیا ہوتا ہے۔ رینو کے آنے کے چھ مہینے بعد ہی بنو ماں بن گئی۔ اکٹھے بارہ کومل سے بچوں کو جنم دے کر اس کا سر فخر سے تن گیا۔ مسز دادا بھائی شوگر والا کی مصروفیت یکلخت بڑھ گئیں۔ رسم کے مطابق بنو نے اپنے بچوں کو سات گھر بھی جھنکائے مگر پھر ایمانداری کے ساتھ سب بچوں کو لے کر اپنے گھر آ گئی۔ اور یہ بنو کا ہی طفیل تھا کہ مسز شوگر والا کے گھر رونق تھی۔ ننھے منے بچوں کی کلکاریاں تھیں اور بنو غرور سے مری جاتی تھی۔ اس اکیلی کے دم سے اس کے کنبے میں پورے بیس نفوس کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اور اتنی کم عمر ہونے کے باوجود بنو دادی، نانی بن چکی تھی۔

بلو، کلو، ننو، جوزی، شنو پوری دس بہنیں مسز دلراج کی چہیتی تھیں۔ وہ کالج جاتیں تو دسوں کی دس ان کی ہمرکاب ہوتیں۔ مسز دلراج شاپنگ پر جاتیں تو وہ سب جاتیں۔ شنو انکے کندھے پر جھولتی، ننو ان کی بانہوں میں چھپ جاتی اور گلو پیروں میں اڑتی پھنستی ساتھ چلتی رہتی۔ مسز دلراج اپنی دسوں لاڈلیوں کی وجہ سے ہر جگہ مشہور ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی ہجولیوں میں دس معشوقوں والی کے نام سے پہچانی جانے لگی تھیں۔

مسز بنکر والا البتہ بہت قناعت پسند تھیں۔ انہیں زیادہ شور وغل ناپسند تھا۔ تبھی انہوں نے تارا اور ججی پر اکتفا کی تھی۔ مگر ان کی مختصر تعداد نے مسز بنکر والا کو اور بھی وہمی بنا دیا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں بارش ہوتی تو مسز بنکر والا تارا اور ججی کو ڈھونڈتی پھرتیں۔ ''پتہ نہیں کہاں چھپ گئیں نامرادیں۔ کہیں ٹھنڈ ہی نہ لگ جائے۔''

''امّی تارا کو چھینکیں آ رہی تھیں۔'' مسز بنکر والا کا بیٹا اطلاع دیتا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو جاتیں۔

''ہائے! کہاں ہے کلموہی۔''

''میں نے اسے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔ ٹیلیوژن کے پیچھے سکڑی بیٹھی تھی۔'' وہ تارا کو دبوچ لاتیں اور کپکپاتا جسم اپنی گرم شال سے ڈھانپ کر اسے سینے سے چمٹا کر بیٹھ جاتیں۔ اور تارا ان کے سینے میں منہ چھپائے ان کے خوشبودار جسم کی حرارت اپنے اندر جذب کرتی رہتی۔ تارا کو کڑوی کڑوی دواؤں سے بہت خوف آتا تھا جو ایسے موقع پر مسز بنکر والا ضرور اسے کھلایا کرتی تھیں۔ اچانک انہیں احساس ہوتا ''ارے اسے تو کھانسی ہے۔''

''دیکھو نا ڈارلنگ! اس کا سانس کیسے آ رہا ہے'' وہ روہانسی ہو کر اپنے میاں سے مخاطب ہو کر کہتیں۔

''اف! مائی گاڈ، اس کا تو گلا خراب ہے۔''

''اسے کف سیرپ دیدو نا جانی۔'' مسٹر بنکر والا بیوی کو مشورہ دیتے۔

''ڈارلنگ تم ذرا اٹھو نا۔'' مسز بنکر والا نخرے پر اتر آتیں۔

ان کی باتیں سن کر تارا کا دل لرز اٹھتا۔ وہ اور بھی زور سے کانپنے لگتی۔ مسز بنکر والا اس کی پیٹھ سہلا کر اسے پیار سے پچکارتیں۔ ''اسی لیے تو کہتی ہوں سوئٹی، یوں نہ پھرا کر ماری ماری۔'' وہ تارا سے شکایت کرتیں۔ اور اسی لمحے مسٹر بنکر والا چمچے میں کف سیرپ بھر کر اس کے سینے پر آ چڑھتے۔ مسز بنکر والا اپنی نرم نرم گداز انگلیوں کو اس کے جبڑے کے بیچ پھنسا کر اس کا منہ کھولتیں اور مسٹر بنکر والا کڑوی دوائی کا چمچہ اس کے منہ میں پھنسا کر الٹ دیتے۔ تارا کو زبردست جھرجھری آ جاتی اور وہ گردن جھٹک کر جسم چرا کے مسز بنکر والا کی گود سے چھلانگ لگا کر پلنگ کے نیچے پہنچ جاتی۔

''پی لی۔۔۔؟'' مسٹر بنکر والا پوچھتے۔

''کہاں پی؟ یہ دیکھو ساری میرے ہاتھوں پر گر گئی ہے۔'' وہ تاسف سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی ہوئی غسلخانے کی طرف بڑھ جاتیں۔

''صبح کو ڈراپر سے پلاؤں گی۔'' مسز بنکر والا جاتے جاتے تارا کا خون خشک کر جاتیں۔ رات بھیگ رہی تھی۔ چاندی کہر کی دھندلی ردا میں لپٹی جا رہی تھی اور وہ سب سیٹھ بھاکڑہ جی کی کوٹھی کے لان میں گھاس کے سبز مخملیں فرش پر بیٹھی گپیں لڑا رہی تھیں۔ اپنی اپنی داستانیں سنا رہی تھیں۔ اپنی اپنی مالکاؤں کے لطیفے بیان کر رہی تھیں۔ دبلی، پتلی، مریل سی مانو نے کہا۔

''بھئی میری مالکا شہلا چوہدری تو بڑی ظالم عورت ہے۔''

''تم ہو بھی تو بن بلائی مہمان'' تیز طرار رانی نے چہک کر کہا۔

''لیکن بہن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' آخر حمد لی بھی تو کوئی چیز ہے۔ مد ہر بنو نے رائے دی۔

''مجھے تو شہلا چوہدری ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔'' مانو پھر گویا ہوئی۔

''اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی نا؟'' شنو نے پوچھا۔

''پہلے اسی گھر میں تمہاری بڑی آؤ بھگت تھی؟'' رانی نے ذرا طنز سے کہا۔

''بہن ہوا یہ کہ پچھلے سال کچھ سہیلیاں اور کچھ خالہ زاد، پھوپھی زاد بہنیں اور بھائی میرے گھر جمع ہو گئے۔ تم جانو! جہاں جوان لڑکے اور لڑکیوں کا اجتماع ہو جائے وہاں کون چپ بیٹھ سکتا ہے۔ ہم سارے بہن بھائی مل کر اُدھم مچانے لگے۔ خوب دھما چوکڑی رہی۔ رات بھر ہم سب مل کر گاتے بجاتے رہے۔ اچھل کود کرتے رہے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اگلے ہی دن شہلا چوہدری کی ماں مر گئیں۔ بیمار تو وہ پہلے ہی سے تھیں مگر شہلا چوہدری کو وہم ہو گیا۔ رو رو کر بس وہ یہی ایک جملہ رٹتی رہیں۔

''مجھے تو پہلے ہی وہم تھا۔ رات بھر یہ منحوس روتی رہی ہیں۔''

''میں دم سادھ کے کرسی کے نیچے چھپی رہی۔ مگر وہ ظالم عورت چپ بیٹھنے والی نہ تھی۔ ماں کے دفن کفن سے نمٹتے ہی مجھے بوری میں بند کرا کے نوکر کے ہاتھ باہر پھنکوا دیا۔''

میاؤں میاؤں۔۔۔ ہائے ہائے اتنا ظلم۔ یک لخت کئی زبانوں سے نکلا۔ مانو کہنے لگی۔

''وہ تو میں بے غیرت ہوں جو پھر واپس آ گئی۔''

''تمہیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔'' کئی زبانوں پر کلمۂ احتجاج ابھرا۔

''بھئی کیا کریں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے دل ہی ایسا دیا ہے۔ ایک دفعہ جس گھر کے ہو گئے بس ہو گئے۔'' اب کی بار مد ہر بنو نے رائے دی۔

''اس گھر سے مجھے کچھ ایسی محبت ہے کہ میں کہیں اور رہ ہی نہیں سکتی۔'' مانو نے اعتراف کیا۔

''تمہاری خبر گیری اب کون کرتا ہے؟'' محفل میں سے کسی نے پوچھا۔

''بہن شہلا چوہدری کے گھر ایسے موٹے موٹے چوہے ہیں کہ کیا بتاؤں؟ بس انہی کے شکار پر گزر بسر ہے۔ یا ان کا نوکر ہے جس کے کارن کھانے پینے کی کوئی تنگی نہیں ہوتی۔'' مانو نے تفصیل بتائی۔

''بہن! تمہیں چاہیے کہ کچھ دن شہلا چوہدری کے دئے ہوئے روکھے سوکھے ٹکڑوں پر بسر کرو۔'' کسی نے مشورہ دیا۔

''اس سے مانو بچاری کو کیا فائدہ ہوگا؟'' دو تین آوازوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''فائدہ یہ ہوگا کہ مانو چوہوں کا شکار نہیں کرے گی تو ان کی تعداد بڑھے گی اور وہ زیادہ سے زیادہ شہلا چوہدری کے اناج کا نقصان کریں گے اس کے قیمتی ملبوسات کتریں گے اور تب شہلا چوہدری کو مانو کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا۔''

''بہت معقول تجویز ہے۔'' سب نے تائید کی۔

ابھی وہ مزے مزے کی باتوں سے سیر نہ ہوئی تھیں اور چاند دھندلا چکا تھا۔ درختوں کے پتوں کے بیچ میں سے نظر آتی ہوئی چاند کی کرنیں پھیکی پڑ رہی تھیں وہ سب ٹھنڈی شبنمی گھاس پر بیٹھی خوشی سے اپنی دُمیں ہلا رہی تھیں کہ بجلی کے ایک کوندے سے تمام کی تمام چونک کر سہم گئیں۔

''نہ جانے کہاں مر گئی۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا'' سیٹھ بھاکڑہ جی ہاتھ میں ٹارچ پکڑے اپنی رانی کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

''توبہ توبہ! یہ انسان ایک پل کو بھی تو ہمیں آزادی سے نہیں رہنے دیتے۔''

جھاڑیوں کے پیچھے چھپتی درختوں کی جڑوں میں دبکتی اور بھاکڑہ جی کی نگاہوں سے بچتی بچاتی، ادھر اُدھر سے دیواریں اور چھتیں پھلانگتی سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیں۔ سیٹھ بھاکڑہ جی جب اس جگہ پہنچے جہاں ابھی کچھ لمحوں پہلے ان سب کی محفل جمع تھی تو وہاں صرف مانو بیٹھی سستی سے اپنی دم ہلا رہی تھی۔ سیٹھ بھاکڑہ جی نے دھندلی چاندنی میں کھڑے ہو کر چند ثانیے تک اسے گھورا۔ پھر ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی۔ مانو امید و بیم کے ملے جلے احساس کے ساتھ ان کے قدموں میں مچلی۔ شاید اس کی قسمت جاگ اٹھے۔ اور وہ بھی رانی کی طرح عیش کرنے لگے۔

سیٹھ بھاکڑہ جی نے پہچان کر اسے ایک ٹھوکر سے گیند کی طرح اچھال دیا۔

''سالی! یہ کس کی بلی ادھر آ مری۔'' وہ گرجے۔

مانو ٹھوکر کھا کر اچھلی، اچھل کر گری، گر کر سنبھلی اور تیزی سے بھاگ کر شہلا چوہدری کی کوٹھی کی دیوار پھاند گئی۔

مُتلَوِّن گرگٹ؛ سہ برُوتی

حنیف سید
(آگرہ، بھارت)

محوِ غفلت تھا مَیں؛ پہلے پہل...! پھر لگا الکٹران، پروٹان ٹکرا گئے ہوں؛ آپس میں، بل کھا کر...! اور نا قابلِ برداشت دھماکے سے موالید ثلاثہ کا ذرّہ ذرّہ لرز گیا؛ کرب سے، تھرّا کر....! جیسے کائنات کو؛ دو پیالوں میں کس کر بگھار دیا ہو کسی نے جامنوں کی طرح، جھلّا کر....! پھر میرے یخ وجود میں ہلکی سی انگڑائی لی؛ حرارت نے، مسکرا کر..! اُس کے بعد میرے احساس کے ساکت سمندر کی سطح پر دستک دی؛ ہوا کے معصوم جھونکے نے، شرما کر..! اور جب میرے شعور کی کالی رات کو اُفق کی نئی نویلی کرن نے احساس کرایا؛ اپنے وجود کا، جگا کر..! تو میرے سامنے ایک عجیب و غریب، لحیم شحیم، نٹ کھٹ، مُتلَوِّن گرگٹ؛ سہ برُوتی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ت، ت، تم ہو کون......؟'' مَیں نے جھجک کر پوچھا۔

''کیوں.....؟ ڈر گئے کیا.....؟'' اس نے پہلے، اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں، پھر فٹافٹ سارے رنگ بدل کر مجھ پر بھرپور رعب جماتے ہوئے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

''ہاں.....!'' مَیں نے اپنے شعور کے تانے بانے توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے؛ داعش کی زد میں آئے معصوم و مظلوم بچّے کی طرح گھبرا کر ہانپتے کانپتے جواب دیا۔

''ڈرنا کیا، اِس میں..؟'' اُس نے کہتے ہوئے اپنی آنکھیں پھر گھمائیں؛ گول مٹول۔ پھر مٹک مٹک کر چلتے ہوئے زمین پر ایک دائرہ بنایا؛ گول گول۔ پھر اپنا بدرنگا جسم پھُلایا، لمبی دُم کو اوپر اُٹھایا۔ پھر اپنے اندر کے بعد دیگرے سبھی جبلّتی رنگوں کو بدل بدل کر دِکھلایا، پھر اُچھل کر پیروں پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں کالی مونچھ کو زمین میں اور بیچ کی کھچڑی دار مونچھ کو موالید ثلاثہ کے ذرّے ذرّے میں پھیلایا، پھر دائیں سفید مونچھ کو اوپر کی جانب ہوا میں لہرایا۔ یعنی کہ اپنے سارے کے سارے کرتب دکھا ڈالے؛ داعش کے کسی خوں خوار سرغنہ کی طرح، اِٹھلا اِٹھلا کر۔

''دائیں طرف کی تمھاری سفید مونچھ تو جا رہی ہے سِدرَۃُ المُنتَہیٰ کو اور بائیں طرف کی کالی مونچھ، تحت الثریٰ کو اور بیچ کی کھچڑی دار مونچھ؛ کائنات کو گرفت میں لیے ہوئے ہے؛ جو کبھی اوپر کی سفید مونچھ میں پیوست ہونے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی نیچے کی کالی مونچھ میں۔'' مَیں نے ڈرتے ہوئے قصیدہ پڑھا، اُس کا۔

''تو اس میں حیرت کیا ہے.....؟ جناب.....!''

''ہے کیوں نہیں حیرت.....؟''

''یہ آج سے تو ہیں نہیں، میری مونچھیں؛ یہ تو ازل سے ہیں، بچّو...! اور رہیں گی بھی، ابد تک۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں، بھائی.....!''

''پر مَیں نہیں جانتا، اَنکل.....!'' مَیں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بھولے انداز میں کہا۔

''ہو تو تم بڑے فطرتی؛ نسلاً۔ یعنی کہ عالم، فاضل اور نہ جانے کیا کیا...؟ اُس پر اَشرف المخلوقات بھی اور اتنا نہیں جانتے....؟''

''نہیں انکل...! مَیں نہیں جانتا، یہ سب۔''

''بڑے بھولے ہو، نا...! بھولے کاہے کو۔ یوں کہو کہ فطرتی، جیسی کہ فطرت ہے، تمھاری۔ یعنی کہ عام لوگوں جیسی۔ وہی تو بول رہی ہے؛ اندر سے تمھارے۔ تمھارے آبا و اجداد جیسی، تمھاری اپنی فطرت۔'' امریکا؛ جیسے شیر نے دریا کا پانی میمنے کے گندا کرنے سے انکار پر، الزام اس کے باپ پر تھوپتے ہوئے، آنکھیں مجھ پر نکالیں۔

''نہیں.....! مَیں نہیں جانتا، فطرت وطرت۔'' مَیں نے بھی میمنے کی طرح، پانی گندا ہونے کی لاعلمی ظاہر کی۔

''آ...... ہاہاہا.....! کیا بات کہہ دی۔ کوئلے کی کان میں رہ کر؛ کوئلہ نہیں جانتے.....؟ سمندر کے واسی؛ پانی نہیں پہچانتے....؟ آگ میں رہ کر؛ شعلوں کو نہیں گردانتے...؟ اپنی مونچھوں کو؛ مونچھیں نہیں مانتے....؟ دیکھو....! دیکھو ذرا غور سے....!'' اس نے رعب سے آنکھیں نکال کر، سینہ تان کر، اپنی مونچھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے آگے کہا: ''یہ ہیں میری، مونچھیں...! یہ مونچھیں تو ہمیشہ رہی ہیں، میری۔ صرف میرے ہی نہیں، سبھی کے ہوتی ہیں یہ۔ تمھارے بھی ہیں۔ ہیں کہ نہیں....؟'' اس نے آنکھیں مزید نکال کر انگلیاں ہوا میں نچاتے ہوئے پوچھا کہا۔

''نہیں.! میرے تو ہیں نہیں مونچھیں۔'' مَیں نے اپنے ہونٹوں کے اوپر ٹٹول کر جواب دیا۔

''ہیں؛ ہیں، ہیں.....! ہیں مونچھیں، تمھارے بھی۔ مکمل ہیں، پوری طرح ہیں، سمجھے...! لیکن؛ ابھی پیٹ میں ہیں، دوست...! تم محسوس بھی کر رہے ہو۔ لیکن، چھپا رہے ہو تم، ان مونچھوں کو، اپنی فطرت کے مطابق۔ ایک تم ہی نہیں، سبھی چھپائے رہتے ہیں، اِن مونچھوں کو؛ ایک دوسرے سے اور مصنوعی چہرہ عیاں رکھتے ہیں سب؛ اپنا اپنا اور جب بھی موقع ملتا ہے؛ اینٹھنا شروع کر دیتے ہیں؛ اِن مونچھوں کو، بڑے رعب کے ساتھ۔ جو سب کرتے ہیں؛ وہی تم بھی کر رہے ہو، بچّو....!'' گرگٹ نے غصّے میں پہلے جسم پھلایا، پھر فٹافٹ اپنے رنگوں میں بدلا ولایا۔ بڑی بڑی مونچھیں دکھا کر امریکا کی طرح اپنے سارے ہتیاروں اور بین الاقوامی رسوخ کی دھونس دیتے ہوئے، بندر گھڑکی کے ساتھ اُچھل اُچھل کر پہلا مدار ہلا ڈالا۔

''اچھا؛ یہ بتاؤ....! تمھاری اوپر اور نیچے کی مونچھوں میں تضاد کیوں

ہے، اتنا.....؟''مَیں نے سوال کرنے کی جسارت کی۔

''تضاد...! تضاد کا ہونا بہت ضروری ہے، پیارے...! یہ تضاد سبھی میں ہوتا ہے؛ بڑی اہمیت ہے تضاد کی، اسی تضاد سے مدارج قائم ہیں۔ مثلاً تحت الثریٰ نہ ہوتو سِدرَۃُ المُنتَہیٰ کی اہمیت کیا....؟ اور اگر سِدرَۃُ المُنتَہیٰ نہ ہوتو تحت الثریٰ کا کیا مقام...؟ نہیں سمجھے...؟''اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں....!''میں نے انکار کیا۔

''اور سمجھو گے بھی نہیں، ابھی تم.....! چلو سمجھاتا ہوں تم کو، تمھاری بھاشا میں، یوں سمجھو کہ کالا رنگ نہ ہوتو؛ کیا مقام ہے، سفید کا.....؟ اور سفید نہ ہوتو؛ کیا اہمیت ہے، کالے کی.....؟ گرمی نہ ہوتو، سردی؛ اور سردی نہ ہوتو؛ کیا مقام ہے، گرمی کا.....؟ سمجھے.....؟ یا نہیں.....؟ اگر نہیں.....! تو اور سمجھاؤں....؟ یعنی کہ تفصیل سے۔ ویسے مَیں یہ جانتا ہوں کہ تم سمجھتے سب کچھ ہو۔ چوں کہ میری اِن مونچھوں کی طرح تمھارے اندر بھی لبادے ہیں۔ اسی لیے تم اندر کے کالے پن کو، سفیدی کے لبادے سے ڈھانکنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔ دنیا والوں کی طرح۔ کیوں کہ تم رہ ہی رہے ہو، اس دنیا میں۔ جو نہ اوپر میں ہے اور نہ نیچے میں۔ نہ سفید میں ہے؛ اور نہ کالے میں۔ نہ دن میں ہے؛ اور نہ ہی رات میں۔ مطلب یہ کہ نہ اِدھر میں؛ اور نہ اُدھر میں۔ چوں کہ مَیں بھی اسی دنیا میں ہوں۔ اسی لیے نہ اِدھر میں ہوں؛ اور نہ اُدھر میں۔ دنیا بھی اِدھر اُدھر کے چکّر میں لٹک گئی۔ اس لیے تو کچھ بھی نہ رہی۔ ہاہاہا.....!''اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے آگے کہا:''ایک بات اور بتاؤں...؟ معرکے کی۔ لو، سن لو.....! اگر یہ اوپر ہوتی، تو سبھی کچھ ہوتی اور نیچے ہوتی؛ تب بھی سبھی کچھ ہوتی۔ اگر یہ اُوپر ہوتی، تو اُوپر ہونے کا اندازہ کس سے لگایا جاتا...؟ تحت الثریٰ نہ ہوتا تو.....؟ غالبؔ نے یہی کہا ہے:

''نہ تھا کچھ تو خدا تھا؛ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا: ڈبویا مجھ کو ہونے نے؛ نہ ہوتا مَیں، تو کیا ہوتا.....؟'' جانتے ہو غالبؔ چچا کو.....؟''اس نے رک کر سوال کیا۔

''وہ تو میرے ابّا تھے۔''مَیں نے خوشی سے اچھل کر بتایا۔

''ابّا تھے تمھارے...؟ اُن کے اولاد تو تھی نہیں کوئی، پھر تم کہاں سے ٹپک پڑے غالبؔ کے ابّا.....؟''پہلے تو وہ اُچھل کر ہنسا، پھر اس نے اپنے ہاتھ کے پنجے کے بیچ کی انگلی اٹھا کر ہوا میں دائرہ بناتے ہوئے گھمائی اور آگے پوچھا:''اپنے ابّا کا کوئی شعر یاد ہے، تم کو.....؟''

''شیر.....! شیر تو کوئی تھا نہیں، میرے یہاں۔''

''یہی امید تھی تم سے، غالبؔ کے ابّا...!''اس نے ٹھٹا لگا کر آگے کہا:

''شعر (اشعار) تو بے شمار تھے، اُن کے، کچھ کو تو جلا کر تاپ گئے ہوں گے۔ کچھ ردّی میں بیچ کر پتنگیں اُڑا ڈالی ہوں گی، اچھا ہوا، جو کچھ بھی ہوا، اور ہوتا بھی کیا اُن کا.....؟ پڑھنے والے ہی کتنے رہ گئے ہیں، اُن کے....؟''وہ کچھ سوچ کر آگے بولا:''ہاں، تو مَیں کیا کہہ رہا تھا...؟ ہاں...! مَیں کہہ رہا تھا کہ کسی اور نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے؛ غالبؔ سے ملتا جلتا:''تو مثلِ سیاہی؛ حرف ہوں مَیں: تو آب بقا؛ اور برف ہوں مَیں: جب حرف مٹا؛ اور برف گلا: تو اور نہیں؛ مَیں اور نہیں۔ یعنی کہ کوئی فرق ہی نہ ہوتا'' سمجھے...! اور اگر اب بھی نہیں، تو اور آگے سمجھاؤں....؟ لو وضاحت کیے دیتا ہوں۔ یہ کالا پن؛ وہ ہے، جس سے سفیدی کا معیار قائم ہے۔ مَیں بھی چاہتا ہوں کہ یہ میری بائیں کالی مونچھ؛ جو تحت الثریٰ میں پیوست ہے؛ کسی طرح سفید ہو جائے اور مَیں پھر اپنے اُسی مقام پر پہنچ جاؤں۔ یا پھر یہ دائیں طرف کی سفید مونچھ؛ جو سِدرَۃُ المُنتَہیٰ کی جانب لپک رہی ہے؛ کسی طرح کالی ہو جائے۔ تو بھی بات بن جائے۔ یوں تو نہ اِدھر کا ہوں؛ اور نہ اُدھر کا۔ اور یہ جو بیچ کی مونچھ ہے، نا..؟ یعنی کہ کھچڑی دار...؟ جو موالید ثلاثہ میں پیوست ہے، یعنی کہ دنیا کو جکڑے۔ اوپر نیچے دونوں میں شامل ہونے کے باوجود نہ اِدھر کی ہے؛ اور نہ اُدھر کی۔ یعنی کہ معلّق۔ بس اِسی طرح مَیں بھی ہوں اور تم بھی۔ کہیں دور نہ جاؤ...۔ اِسدرَۃُ المُنتَہیٰ اور تحت الثریٰ کی بات بھی چھوڑو..! دنیا کو ہی لے لو۔ چلے جاؤ...! اُوپر، یعنی کہ پہاڑ پر۔ کیا ملے گا.....؟ صاف ہوا۔ شفاف پانی۔ سفید ہی سفید برف۔ ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول۔ کیا کہلاتا ہے...؟ پہاڑ...! یعنی کہ سب سے بڑا، سب سے اُونچا۔ پھر برف کی طرح پگھلو....! چلے آؤ بہتے ہوئے نیچے۔ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے۔ دنیا کی غلاظت اپنے پہلو میں سمیٹتے ہوئے۔ کیا بن گئے اب.....؟ سمندر بن گئے، نا..؟ یعنی کہ سب سے بڑے۔ اوپر تھے؛ تب بھی بڑے۔ نیچے پہنچے، اب بھی بڑے۔ بیچ میں کیا تھے.....؟ کچھ بھی تو نہیں۔ یعنی کہ غلاظت ہی غلاظت۔''

''پانی کیسا ہوتا ہے، سمندر کا...؟ کھارا۔ یعنی کہ بدمزہ۔ وہی جب اُوپر چلا جاتا ہے، پھر ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول۔ وہی غرور اُسے لے آتا ہے نیچے، میری طرح۔ یعنی کہ غلاظت ہی غلاظت اور جب اس میں عاجزی وانکساری آجاتی ہے، تو زمین اُس کے وجود کو اپنے میں جذب کر کے پاتال میں لے جا کر پھر شفاف، ٹھنڈا اور شیریں بنا دیتی ہے۔ اگر کچھ بننا چاہتے ہو تو پاتال کے پانی سے سیکھو..! پہاڑ پر رہو...! یا پاتال میں۔ پسند کیسے جاؤ گے، بیچ میں کچھ نہ پاؤ گے۔ گندے نالے کا کوئی مقام نہیں۔ کچھ بننا ہے دنیا میں۔ تو اندر کے کالے پن کو نکال پھینکو۔ یا پھر سفید پن کو۔ سب کچھ بن جاؤ گے۔ دنیا سلام کرے گی، جھکے گی تمھارے سامنے، یہ دنیا۔ آمیزش میں کچھ نہ ملے گا۔ لیکن مَیں جانتا ہوں۔ کہ مکمل طور سے نکال نہ سکو گے کسی کو بھی۔ کیوں کہ یہ دنیا نکالنے ہی نہ دے گی، کبھی۔ کوشش تو میں بھی کر رہا ہوں، ازل سے۔ لگتا ہے؛ نکال نہ سکوں گا کبھی۔ کاجل کی کوٹھری میں ہوں، نا؟ دیکھو...! اس کالی مونچھ کو...! کئی بار کاٹ چکا ہوں اسے، لیکن بار بار نکل آتی ہے، کم بخت۔ اسی طرح تم بھی نہ بچ سکو گے، کاجل کی کوٹھری سے۔ کیوں کہ جو مَیں ہوں؛ وہی تم بھی ہو۔ ہو، نا ہی تم....؟ یعنی کہ دنیا والے۔ خربوزے کی طرح ایک دوسرے کا رنگ پکڑنے والے۔ شاہین جیسی فطرت اب کہاں، تم میں...؟ تم بھی چھپائے رہتے ہو اپنی مُتلوّن فطرت، ایک دوسرے سے، میری طرح۔''

''آدم علیہ صلاۃ والسلام کا نام تو سنا ہوگا....؟''اُس نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''ہاں،ہاں۔''میں نے برجستہ اقرار کیا۔

''کیوں نہیں،ابّا جو تھے تمھارے وہ،کبھی اُوپر تھے،سفید پوش۔پھر میرے ایک اشارے پر یعنی کہ قدرتی نظام کے تحت نیچے آگئے،دھڑام سے؛ ہاہاہا...ہا..!۔کہتے ہیں:تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغامبر آئے ،دنیا میں۔ سارے کے سارے،سفید پوش۔سفید چہروں پر موچھیں لیے،سفید سفید۔پیغام بھی دیے،اپنی نسل کو۔لیکن اولادوں کی موچھیں نکلیں پھر کالی،بھیڑوں جیسی چال والی۔تم بھی وہی ہو،نا....؟''

''مَیں نے کہاں....؟''میری آواز ممیا گئی،شیر کے سامنے۔

''کہانا مَیں نے.....؟تم چھپا رہے ہوخود کو،مجھ سے۔دیکھو...!مَیں تمھارا ہی بھائی ہوں،پہچانتا خوب ہوں،تم کو۔مجھے بے وقوف بنا رہے ہو...!دائی سے پیٹ چھپا رہے ہو....؟''اُس نے پھر گھڑکی دی۔

''نہیں بھائی،ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔''میں کانپ گیا۔

''ہے...،ہے....؛ایسا ہی ہے کچھ۔ابھی اُتارتا ہوں ،تمھارے کپڑے۔کرتا ہوں ننگا سرِ عام،تم کو؛ پیاز کے چھلکوں کی طرح۔سمجھے....!''اس نے لمبا سانس لے کر آگے پوچھا:''اچھا پہلے یہ بتاؤ....! کہ تم ہو کون.....؟''

''اُسی آدم کی اولاد......!جس کی تم بات کر رہے تھے۔''

''اوہ.....! آدم.....؟ تھا جو مسجودِ ملائک،تم وہی آدم ہو....؟''

''ہاں،ہاں وہی وہی.....!''

''ہاں ہاں وہی وہی....!تھے تو آبا وہ تمھارے ہی؛ مگر تم کیا ہو......؟اوپر سے تو آئے تھے آدم کے روپ میں۔مگر اب کیا ہو، وہی وہی....؟میرا مطلب سکھ ہو...؟ ہندو ہو...؟یا پھر عیسائی....؟ کچھ تو بولو...!میرے بھائی....؟کون ہو، اُن میں سے تم...؟وہی وہی...!'' اس نے ایک ہاتھ اٹھلا کر انگلیاں نچاتے ہوئے میرا مذاق بنایا۔

''مَیں تو مسلمان ہوں، بھائی۔''

''مسلمان.....! آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا.....؟ شور ہے، ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود.....!مسلمان اب رہے کہاں ...؟اے نمرود...!بت شکن اُٹھ گئے ،باقی جو رہے؛ بت گر ہیں۔ہوگا،تو ہوگا کوئی؛ ڈھکا چھپا۔میری نظر میں تو کوئی ہے نہیں مسلمان،اب۔ہاں،نام نہاد تو ہیں؛ بے شمار ہیں۔''اس نے ذرا رُک کر پوچھا:''جانتے ہو...؟نام نہاد مسلمان،کیا ہوتا ہے....؟''

''بالکل جانتا ہوں۔''مَیں نے وثوق سے کہا۔

''بتاؤ تو ذرا....؟''اس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''پکا مسلمان،میری طرح۔''مَیں نے برجستہ بتایا،جس پر وہ ہنستے ہنستے لوٹ گیا،پھر بڑی دیر میں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر،ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا:''چلو مان لیتا ہوں کہ پکے مسلمان ہو تم،یعنی کہ نام نہاد۔مگر یہ تو بتاؤ میرے دوست کہ تم ہو کون سے مسلمان.....؟''

''کون سے مسلمان.....!''مَیں نے تعجب کیا۔

''ہاں بھئی ہاں،ہو کون سے مسلمان....؟مسلمانوں کی کٹا گری ایک دو تو ہیں نہیں۔دنیا بھری پڑی ہے،مسلمانوں کی کٹا گری سے...!اور ان کی مسجدیں الگ الگ ہیں، بھائی.....!خدا ایک اور اس کی مساجد کے خدا،جدا جدا!یعنی کہ بے شمار....! سمجھے کہ نہیں.....؟''اس نے مجھ کو ٹارگٹ مان کر مزائل داغ دیا۔

''نہیں''اور میں نے نہیں کہہ کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

''سمجھو گے بھی نہیں تم،اور نہ ضرورت ہے سمجھنے کی،ابھی تم کو۔بس، نام ہی کے بنے رہو مسلمان۔آپس میں مار کاٹ کرنے والے۔کچھ دنوں میں خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ابھی تو اتنا بتاؤ...!میرے بھائی کہ ہو کون سے مسلمان....؟شام کے نصری....؟ عمان کے عبادی ....؟دروز...؟ داعش....؟ کردوں...؟ خارِجی تکفیری...؟ داؤدی بوہرا....؟ آغا خانی بوہرا.....؟ ایزدی.....؟سنّی......؟یا پھر شیعہ....؟''اُس نے میرا سراغ لگانے کے لیے مجھ کٹی پتنگ کو پھانس کرلانے کے لیے اپنی پتنگ کی ڈھیل مزید بڑھا دی۔

''شیعہ شیعہ۔''مَیں نے برجستہ کہا۔

''پر کون سے شیعہ ہو بھائی...؟ کون سے شیعہ..؟ علوی...؟حسنی...؟ یا پھر حسینی...؟زیدی...؟باقری...؟جعفری...؟ کاظمی...؟رضوی...؟ تقوی...؟نقوی...؟ عسکری...؟ کچھ تو بولو بھائی...!''یا پھر آنے والے مہٰدی.....؟''

''نہیں نہیں،شیعہ نہیں۔مَیں تو سنّی ہوں؛سنّی ،یعنی کہ ٹناٹن سنّی۔''

''اوہ...!ٹناٹن سنّی..؟سمجھ گیا،سمجھ گیا مَیں؛ پوری طرح سمجھ گیا،تم سنّی ہو؛ یعنی کہ ٹناٹن سنّی۔مگر ٹناٹن سنّی صاحب....! یہ تو بتاؤ؛ ہو کون سے سنّی ٹنا ٹن..؟سلفی..؟شافعی..؟صوفی...؟مالکی...؟حنبلی..؟یا پھر حنفی.....؟''

''م۔م۔م۔مَیں حنفی ہوں،حنفی۔''

''کون سے حنفی بھائی....؟ بریلوی....؟یا دیو بندی.....؟''

''دیو بندی۔''

''کون سے دیو بندی.؟''وہابی..؟تبلیغی.؟مظاہری..؟ قاسمی..؟ جماعت اسلامی..؟ مودودی..؟ سرسیّد والے نیچری..؟ چکڑالوی...؟ قادیانی....؟ شمع نیازی....؟سلفی....؟یا اہلِ حدیثی.....؟''

''نہیں نہیں۔مَیں دیو بندی نہیں؛ بریلوی ہوں، بریلوی۔''

''کون سے بریلوی بھائی...؟کون سے بریلوی.. ؟ قادری. ؟ سہروردی..؟ نقشبندی..؟ چشتی..؟قطبی..؟ فریدی...؟ صابری؟ واحدی..؟ برکاتی..؟ اَشرفی..؟ رِضوی..؟عطاری...؟ قدیری...؟ فردوسی...؟ یاسالمی..؟'' اصولی؟ اخباری؟ ملنگ؟ اثنا عشری خوجہ؟ مولائی؟ دیو بندی ٹناٹن...؟ بریلوی ٹناٹن... ؟سلفی ٹناٹن...؟حنفی ٹناٹن..؟ شافعی ٹناٹن...؟اہلِ حدیث ٹناٹن..؟ مواحدون ٹناٹن..؟ خواجہ ٹناٹن...؟یا کہ پھر صوفی ٹناٹن....؟تم ہو کون سے سنّی ٹناٹن،یہ تو بتاؤ....؟''

''کون سے سنّی....؟''مَیں نے کہا۔

''ارے بھئی ہاں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمھیں پتا ہی نہیں کہ تم ہو کون.....؟ بھئی ٹناٹن سنّی صاحب.....! اگر تم نے بتا بھی دیا کہ مَیں فلاں سنّی ہوں؛ تو مَیں پھر پوچھوں گا کہ تم سیّد ہو....؟ ادریسی ہو..؟ قریشی؟ عباسی..؟ تیلی..؟ نائی؟ دھوبی..؟ تنبولی؟ بہشتی..؟ رنگریز یا انصاری..؟ یا کہ پٹھان....؟ سلمانی، فاروقی، میراثی، کون ہو ٹناٹن بھائی....؟''

''پٹھان، پٹھان، پٹھان، بھئی پٹھان ہوں مَیں تو پٹھان ،ٹناٹن پٹھان۔'' مَیں نے برجستہ جواب دیا۔

''پٹھان..! او..ہ..! پٹھان..؟ یعنی کہ خان بھائی۔ لڑھی جوت، یا لال منہ کے پٹھان یا پھر چوڑی ہڈّی والے یعنی کہ..''

''ہاں ہاں....وہی وہی۔'' میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی چوڑی ہڈی والے پٹھان ہونے کی حامی بھر لی۔

''خان بھئی، پہلے اپنی پٹھانوی پر ایک لطیفہ سن لو، ایک پٹھان تھے یعنی کہ خان صاحب؛ اور ایک تھے پنڈت جی۔ دونوں کی ایک دوسرے سے دوستی تھی، دانت کاٹی اور ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی۔ ایک بار ہندو مسلم فساد ہوا، تو خاں صاحب نے پنڈت جی کے یہاں جانا بند کر دیا، لیکن پنڈت جی برابر آتے رہے، خان بھائی کے یہاں۔ پنڈت جی نے خاں صاحب سے ان کے نہ آنے کا شکوہ کیا تو خاں صاحب نے کہا: ''پہلے آپ مسلمان ہو جائیں؛ تب ہی آؤں گا، ورنہ نہیں۔'' پہلے تو پنڈت جی بہت چکرائے، لیکن جب محبت نے جوش مارا تو بے چارے مجبور ہو گئے۔ انھوں نے خاں صاحب سے کہا: ''مجھے بتاؤ....! مَیں کیسے مسلمان بنو..؟'' خان صاحب نے برجستہ کہا: ''قلمہ (کلمہ) پڑھو..! قلمہ (کلمہ)۔'' پنڈت جی نے جوش میں آ کر کہا: ''اچھا، پڑھاؤ کلمہ..!'' خاں صاحب پہلے تو کچھ دیر کے لیے خاموش رہے، پھر چکرا کر بولے: ''قلمہ (کلمہ) تو بھائی مجھے بھی نہیں آتا...!'' لگتا ہے اسی طرح کے خان ہو، تم بھی.....؟ ٹناٹن۔''

''اچھا...! اچھا؛ اب تم بتاؤ.....! کہ تم کون ہو ....؟ '' مَیں نے رگرگٹ سے پوچھا۔

''ارے..! کمال ہے، کمال ہے بھائی...! ساری دنیا جانتی ہے؛ اور تم نہیں پہچانتے مجھے....؟''

''نہیں، مَیں نہیں پہچانتا....!'' مَیں نے برجستہ کہا۔

''نہیں پہچانتے...؟ تو سنو...! تم نے اقبالؔ کو تو پڑھا ہوگا..؟: ''گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے؛ قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو: مَیں لرزتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح؛ تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو۔''

''نہیں، مَیں نے تو نہیں پڑھا۔''

''نہیں پڑھا، تو تم کیا جانو، اُن کو....؟''

''ہاں، جانتا تو ہوں۔''

''جانتے ہو....! مگر کیسے.....؟''

''وہ تو میرے چچا تھے، گھنگرو باندھ کر ناچتے تھے اور دوسروں کو بھی سکھاتے تھے۔'' مَیں نے بتایا اور اس نے بڑے زور سے ٹھٹّا لگایا۔

''چلو شکر ہے؛ اتنا تو جانتے ہو اقبالؔ کو۔ وہ ناچتے تھے اور دوسروں کو بھی سکھاتے تھے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر آگے کہا: ''وہ بے چارے ناچ ناچ کر خود کو گھایل کر کے زندگی بھر دوسروں کو درس دیتے دیتے مر گئے اور تم ان کے گھنگروؤں کی آواز بھی نہ سمجھ سکے، یار.....! اور اَب سمجھ بھی نہ سکو گے۔ اب تو اُن کے گھنگروؤں کی وہ دل دوز جھنکار اردو ہی چھین لی مَیں نے، تم سب سے، جس میں درس تھا اُن کا اور تمھارا سبھی کلچر بھی۔ جس سے شناخت تھی تمھاری۔ اَب نہ رہا بانس اور نہ بجے گی بانسری، اب تو اپنی ہی بجے گی بانسری اور بج بھی رہی ہے۔ سنو...! اردو ختم کرنے والا کون..؟ حوّا کو بہکانے والا کون..؟ آدم کو نیچے لانے والا کون...؟ دنیا کو ملکوں میں بٹوانے والا کون....؟ مذہبی تفریق پھیلانے والا کون..؟ مسلمانوں کو مسلکوں میں بٹوانے والا کون..؟ انسان کو شیطان بنانے والا کون...؟ سمجھے....؟ مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا؛ ہم نے اُسے انسان سے شیطان بنایا۔ انسان تو انسان، بھگوان کی ہر شے کو مذہبوں کے رنگ دے ڈالے ہیں، مَیں نے، سمجھے...؟ یہاں تک کہ چرندوں، پرندوں، سبزیوں، پھلوں، اَناجوں، کھانوں، مٹھائیوں، دِنوں، مقاموں، مکانوں کی گرستیوں، سمتوں، پیڑ، پودوں، ندیوں، پتھروں، لباسوں اور رنگوں تک کو مذہبی رنگوں میں رنگ ڈالا ہے۔ ساری دنیا میں میری ہی حکومت ہے، اِس وقت۔ یہ اُونچ نیچ، ذاتیں، میری ہی کراماتیں ہیں۔ ننگا ناچ، مَیں ہی تو کروا رہا ہوں ،دنیا میں۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر نیم برہنہ دوشیزائیں مٹکتی پھرتی ہیں، چھیل چھبیلی؛ خوش بودار، تنگ کپڑوں میں، اپنے جسموں کی نمایش کرتی ہوئی؛ سرخی پاوڈر پوتے؛ میرے ہی اشارے پر تو۔ تو تم کیا سمجھتے ہو، یہ سب جنّت میں جائیں گی.....؟ ان کو بہلا پھسلا کر، بہکا کر بے غیرت، بے شرم، بے حیا اور ننگا اسی لیے کر دیا ہے کہ یہ سب جہنّم میں جھونکی جائیں، سمجھے.....؟ اور مَیں عیش کروں ،اُن کے ساتھ، سمجھے...؟ عورتیں پسند ہیں، مجھ کو، کیوں کہ یہ اپنے شوہروں کی اتنی نہیں مانتیں؛ جتنی کہ میری۔ حوّا نے بھی میری مان کر آدم کو گندم کھلایا تھا۔ مَیں انھیں میں رہتا بھی ہوں، زیادہ تر یعنی کہ بٹوے پر۔ وہیں اپنے رنگ ڈھنگ بدل بدل کر دل بہلاتا ہوں، اِن کے ساتھ۔''

''لے تو اُن کے شوہروں کو بھی جاؤں گا جہنم میں۔ پیر دبوانے کے لیے، اپنے۔ کیوں کہ وہ اپنی عورتوں کو آوارہ چھوڑے ہوئے ہیں، بے لگام۔ یہ لوگ اپنے ماں باپ کی خدمت نہ تو خود کرتے ہیں اور نہ اپنے بیوی بچّوں سے کرواتے ہیں۔ ضرورت تو بچّوں کی بھی ہوگی، وہاں۔ اسی لیے تو بگاڑ رکھا ہے، اُن کو۔ وہ اب میرے اشاروں پر چلتے ہیں، وہ اب بڑوں کا کہنا نہیں مانتے اور نہ ہی پڑھنے میں من لگاتے ۔ ٹی۔ وی اور موبائل پر فیس بک وغیرہ میں لگ رہتے ہیں۔ یہ لت مَیں نے ہی ڈال رکھی ہے، اُن میں۔'' رگرگٹ نے اچھل اچھل کر ناچتے ہوئے بتایا۔

باقی صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ کیجیے

وہ ایک لمحہ

مشتاق اعظمی

(اسنسول، ویسٹ بنگال)

اپنے فلیٹ کے زینے سے اترتے وقت اچانک پھسل جانے کی وجہ سے شاہدہ کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ وہ اسے دکھانے کے لیے ڈاکٹر قریشی کے نرسنگ ہوم گئی تھی۔۔۔ یہ ڈاکٹر قریشی سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔۔۔ سپاٹ سی ملاقات۔ ڈاکٹر قریشی نے کچھ انجکشن اور مالش کی دوا لکھ کر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ لیکن اس بات کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک دن شاہدہ نے اپنے گھر میں ڈاکٹر قریشی کے پیغام کے چرچے سنے۔ اب اس نے اس ملاقات پر غور کیا تو چوڑے شانے۔۔۔ سڈول جسم۔۔۔ اور پر کشش شخصیت کے ساتھ ڈاکٹر قریشی کا دل کش سراپا اس کی نظروں کے سامنے آموجود ہوا۔ وہ تنہا ہونے کے باوجود ایک جھینپ گئی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر قریشی شہر کے کامیاب ترین سرجن تھے۔ ان کا اپنا نرسنگ ہوم تھا۔۔۔ قدرت نے ان کے ہاتھوں میں شفا بھی غضب کی بخشی تھی۔۔۔ ہر کوئی ان کی مسیحائی کا معترف نظر آتا تھا۔۔۔ جو بھی مریض ان کے نرسنگ ہوم میں داخل ہوا۔۔۔ اچھا ہو کر ہی باہر نکلا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے نرسنگ ہوم کا بیڈ گھنٹہ بھر کے لیے بھی کبھی خالی نہیں ہوا تھا۔۔۔ اِدھر ایک مریض صحت یاب ہو کر باہر نکلا۔۔۔ اُدھر دوسرا مریض بیڈ پر آ گیا۔

شاہدہ نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں۔۔۔ وہاں لڑکی کے لیے اچھا رشتہ ملنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک رئیس ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ خوب صورت تھی۔۔۔ تعلیم یافتہ تھی۔۔۔ ہنر مند تھی۔۔۔ لڑکی پڑھی لکھی اور خوب صورت ہو۔۔۔ والدین دولت مند اور بارسوخ ہوں تو لڑکا تلاش نہیں کیا جاتا۔ لڑکے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

شاہدہ کے لیے کچھ پیغامات پہلے بھی آئے تھے۔ لیکن اب تک گھر کے کسی فرد نے اس سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر قریشی نے ایک عزیز کے ذریعہ سے اپنی شادی کا پیغام بھیجوایا تو گھر والوں کو یوں لگا۔۔۔ جیسے قدرت نے اپنی ساری برکتیں اس گھر پر اچانک نازل کر دی ہوں۔

یہ خبر سننے کے بعد نہ جانے کتنی ہی بار۔۔۔ ایسا ہوا کہ شاہدہ بے خیالی میں اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔۔۔ اس نے اپنی آنکھوں میں چھپی ہوئی سحر انگیزی تلاش کرنے کی کوشش کی۔۔۔ اپنے کنول جیسے رخساروں کی شادابی کو چھو کر محسوس کرنا چاہا۔۔۔ اپنے لمبے گھنے بالوں کو ہاتھوں میں لے کر ان کے ریشمی ہونے کی تصدیق کرنی چاہی۔ اور اپنے مرمر جیسے جسم کے دل آویز خطوط کا جائزہ لینا چاہا۔ لیکن اس کی ان سوچوں نے ہر بار حیا کا گھونگھٹ اوڑھ لیا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ آخر اس میں وہ خاص بات کیا تھی۔ جس نے ایک ہی ملاقات میں ڈاکٹر قریشی کا دل اپنی مٹھیوں میں لے لیا تھا۔ اور جب ایک مہینے کے بعد ڈاکٹر قریشی اسے دلہن بنا کر سجی ہوئی کار میں اپنے گھر لے آئے تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے جسم کو آہستہ سے اٹھا کر بادلوں کی کشتی پر رکھ دیا ہو۔

وقت ہوا کے دوش پر رنگین غباروں کی طرح ۔۔۔ اڑتا رہا اور ازدواجی زندگی کے پانچ سال ۔۔۔ پلک جھپکتے بیت گئے۔

شاہدہ اور ڈاکٹر قریشی کے دل کی دھڑکنوں کی ہم آہنگی آج بھی برقرار تھی۔ ان کے عالی شان بنگلے میں گلاب۔۔۔ جوہی۔۔۔ اور رات کی رانی۔۔۔ کے پھولوں کی گمگ آج بھی چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر وہ پھول۔۔۔ جس کی مہک دل کا سرور۔۔۔ اور جس کا حسن آنکھوں کا نور بن جاتا ہے۔۔۔ ابھی تک ان کی پھلواری میں نہیں کھلا تھا۔

انتظار کے کچھ اور موسم بیت گئے۔۔۔ لیکن شاہدہ کی گود بے جان سیپ کی طرح خالی ہی رہی۔ بالآخر ایک دن اس نے جان لیا کہ۔۔۔

"ماں"۔۔۔ کی شہد میں گھلی ہوئی آواز سننا اس کے کانوں کو کبھی نصیب نہیں ہوگا کہ مشیتِ الٰہی یہی ہے۔ اور تب اس کی آرزوؤں کے چراغ یک لخت بجھ گئے۔ آنکھوں میں بسے ہوئے سنہرے خواب ابدی نیند سو گئے۔۔۔ فضا میں تیرتے ہوئے رنگین غبارے خلا میں تحلیل ہو گئے۔

محرومی کا کرب۔۔۔ کبھی کبھی اس کی خود کلامی میں سمٹ آتا:

"آہ۔۔۔ دنیا کی ساری نعمتیں پا کر بھی میں نے کیا پایا۔۔۔؟ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔! میری زندگی ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے۔۔۔ جس میں کبھی کوئی پھول نہیں کھلے گا۔ لیکن اس میں ڈاکٹر قریشی کا قصور بھی کیا۔۔۔؟"

پھر وہ اپنے ٹوٹے وجود کو جوڑنے کی کوشش کرتی۔

"لیکن میرے لیے یہ خوشی کم تو نہیں کہ میں بلا شرکت غیرے ان کی محبت کی تنہا مالک ہوں۔ اپنے گھر والوں کے پیہم اصرار کے باوجود انہوں نے اپنی محبت کی تقسیم گوارا نہیں کی۔ نامرادی کا دکھ انہیں بھی تو ستاتا ہوگا۔۔۔ اور شاید مجھ سے زیادہ ہی۔۔۔! لیکن اپنی محرومی کو انہوں نے کس خوب صورتی کے ساتھ تبسم کی دبیز تہوں میں چھپا لیا ہے۔ کبھی کوئی گلہ نہیں۔۔۔ کوئی شکایت نہیں۔۔۔ بڑے انسان جو ٹھہرے۔۔۔!"

ایک دن۔۔۔ وہ شام کی چائے پینے کے بعد لان میں بیٹھی۔۔۔ ان پرندوں کو غور سے دیکھ رہی تھی جو دن بھر کے سیر سپاٹے کے بعد غول در غول۔۔۔ اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"اپنا گھر۔۔۔ پھر بھی اپنا گھر ہوتا ہے۔۔۔ چاہے وہ تنکوں سے بنا گھونسلا ہی کیوں نہ ہو۔ تحفظ کا احساس تو فراہم کرتا ہے۔"

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور شاہدہ کے خیالات کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر قریشی کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"شاید مجھے معاف کر دو۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ کوئی سوال نہ کرو۔۔۔"

"یہ کیا۔۔۔؟" شاہدہ حیران وششدر تھی۔

"شاہدہ تم سے سنا نہیں جاسکے گا۔مگر ریسیور مت رکھو۔۔مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی۔۔۔کچھ دن پہلے۔۔"اب شاہدہ کو ایک جھٹکا سا لگتا محسوس ہوا۔

"آج وہ غلطی ایک نوزائید بچے کی شکل میں میرے سامنے موجود ہے۔"

شاہدہ نے ایک گہری سانس کھینچی تو ڈاکٹر قریشی گھبرا کر بولے:

"شاہدہ فون نہ رکھنا۔۔۔پلیز۔۔۔! میری بات سن لو۔۔۔یقین کرو میری ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔۔۔نہ ہی اس نرس کے دل میں کوئی پاپ تھا۔۔۔بس۔۔۔وہ کوئی کم زور سا لمحہ تھا جس نے ہمارے قدم ڈگمگا دیے تھے۔۔۔بچے کو جنم دے کر وہ اس دنیا سے جاچکی ہے۔بچے کو ماں کو گود چاہیے ۔۔۔ہلو۔۔۔ہلو۔۔۔"

فون پر شاہدہ کی سسکیاں سنائی دیں۔۔۔تو ڈاکٹر قریشی کی بے چینی اور بڑھ گئی۔۔۔شاہدہ نے فون کا سلسلہ کاٹ دیا تھا۔

ڈاکٹر قریشی نے ڈرائیور نے کار نکالنے کو کہا۔۔۔بچے کو تولیہ میں لپیٹ کر ہتھیلیوں کی کشتی میں لیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تھوڑی تیز کی تو گھبرا کر بولے:

"آہستہ چلاؤ۔۔۔!"

ادھر شاہدہ سوٹ کیس میں کپڑے رکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔۔۔

"ڈاکٹر قریشی دوسری شادی کر لیتے۔۔۔میں گوارا کر لیتی۔لیکن یہ تو کھلی ہوئی بدکاری ہے۔۔۔گناہ کے اس لوتھڑے کو بھلا کوئی کس طرح سینے سے لگا سکتا ہے۔نہیں نہیں، میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے اس خزاں رسیدہ چمن کو اپنے ہاتھوں سے پھونک دوں اور یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں۔۔۔!

اس نے سوٹ کیس ہاتھ میں تھام لیا۔۔اور تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔لیکن باہر آتے ہی وہ زور سے چونکی۔۔سوٹ کیس ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔۔ڈاکٹر قریشی بچے کو کلیجے سے لگائے۔۔۔اس کے سامنے کھڑے تھے۔ندامت کے بوجھ سے ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

شاہدہ نے حقارت سے بھرپور ایک نظر ڈاکٹر قریشی کے چہرے پر ڈالی۔اس کے بعد سوٹ کیس اٹھانے کے لیے جھکی۔لیکن اس کا کاندھا ڈاکٹر قریشی کے گھٹنے سے مس ہوگیا۔اس ہلکے سے تصادم سے بچہ چونک گیا۔

" کیاں۔۔۔کیاں۔۔۔" کی معصوم گونج فضا میں تھرتھرائی۔

شاہدہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔پھر یہ گونج رفتہ رفتہ "ماں۔۔ماں۔۔" کے سریلے بول میں ڈھلتی چلی گئی۔

دفعتاً شاہدہ کی گھنی پلکوں پر جذبات کی گہری گھٹا چھا گئی۔ممتا کے بادل زور وشور سے برسنے لگے۔وہ آگے بڑھی اور اس کی بے چین بانہیں خود بخود بچے کی جانب بڑھ گئیں۔۔۔!

- بقیہ -

مُتلَوّن گرگٹ؛ سہ بُرُوتی

''مگر یہ تو بتاؤ...!ایسا تم کر ہی کیوں رہے ہو.....؟''

''اپنی بھلائی کے لیے۔''

''اس میں کیا ہے تمھاری بھلائی....؟''مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

''جس کے گناہ زیادہ ہوں گے وہی تو جائے گا جہنم میں،سب جانتے ہیں کہ مَیں نے بے شمار خدا کی عبادت کی ہے تمھاری بہ نسبت۔بس ایک نافرمانی پر یہ حشر ہوا میرا۔اور تم سب تو بے شمار نافرمانیاں کرتے ہو روز،اللہ کی؛تم لوگ تو ہم سے کہیں زیادہ گناہ گار ہو۔مَیں اَب بھی تم سب سے لاکھ گنا اچھا ہوں۔اس لیے میں جاؤں گا بہشت میں،یہاں تک کہ دس جانور تک،بہشت میں جائیں گے،اصحاب کاف کا کتا اور زبیر علَیہِ السّلام کا گدھا بھی۔ اور میاں تم جیسے حضرت یعنی کہ اشرف المخلوقات جہنم میں۔مَیں تو خوب عیش کروں گا بہشت میں حسیناؤں کے ساتھ۔او۔کے۔'' گرگٹ نے کہتے ہوئے اپنا سینہ تان کر اپنے سارے جسم کے سفید رنگ کو سمیٹ کر سفید مونچھ میں پیوست کر کے،سفید مونچھ کو مزید سفید کیا اور پھر ایک بھیانک آواز کے ساتھ،بھرپور زور لگاتے ہوئے آسمان کی جانب اُٹھاتا گیا؛اُٹھاتا گیا۔اور پھر ایک بھیانک دردناک چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔اس کی سفید مونچھ آگ سے جھلس کر کالی پڑگئی۔

''اس کا مطلب کہ تو ابلیس ہے.....؟''جب وہ کافی دیر بعد ہوش میں آیا تو مَیں نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم نے صحیح پہچانا،دوست.....!مَیں ابلیس ہی ہوں۔''

''اچھا ٹھہر.....!تیرا علاج تو ہے میرے پاس...!''اور جیسے ہی لاحول پڑھا مَیں نے۔وہ بجلی جانے پر ٹی۔وی۔کے اسکرین سے تصویر کی طرح غائب تو ہوگیا۔لیکن میرے وجود کے سیہ خانوں میں سہ بُرُوتی کے گلّے پھوٹنے لگے۔

فسانۂ محبت

نیئر اقبال علوی (لاہور)

وہ۔۔۔سکول سے گھر لوٹی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ تھکی ٹوٹی راہبہ کو پہلے تو احساس ناگواری ہوا کیوں کہ دن بھر کی مصروفیت کے باعث وہ ذہنی و جسمانی طور پر شدید تھکن میں مبتلا تھی۔ کسی کو دیکھنے کی خواہاں، نہ بات کرنے کی آرزو مند۔ فقط بستر پہ گر کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ سے ملنے کی خواہشمند۔۔۔لیکن اگلے لمحے ہی اس کے عقیدے نے اس کو جھنجھوڑا اور اندر کے جذبۂ خدمت سے معمور انسان نے جھٹ سے ریسیور اُٹھایا۔ انسان دوستی کے رویے نے اس کی صحیح راہنمائی کی تھی کیونکہ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے پل بھر کو اس کے کانوں میں رس گھول دیا۔ اس کے مضمحل پیکر کے انگ انگ میں جلترنگ سی بجادی۔ اس سازِ خاموش کا ہر ہر تار بجنے لگا۔

سسٹر صاحبہ! مبارک ہو۔ ایسی خوشنما اور معیاری کتاب چھپنے پر۔۔

شکریہ۔۔۔بہت بہت شکریہ!

راہبہ سارہ نے نہایت خوش دلی سے ارمان کی مبارکباد کا شکریہ ادا کیا۔

آپ کو کتاب تو اچھی لگی، مگر بتایئے کچھ پڑھا بھی؟

ہاں ہاں، بہت کچھ پڑھا

مثلاً۔۔۔

مثلاً یہ کہ۔۔۔

سُندر تا کا تو کبھی
مان گمان ہی نہ تھا
پر اس رات
کہا جو تم نے
اس کو سُن کر
آئینہ مجھ کو
دیوانوں سا
ڈھونڈ رہا ہے۔

وہ دفعتاً شرما گئی۔ چھوٹے چھوٹے کانوں کی باریک باریک لویں پل بھر میں دہکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یہ احساس اسے زندگی میں پہلی بار ہوا۔ سامنے کی دیوار پہ ٹنگے آئینے میں ہیبٹ (یونیفارم) میں لپٹا چہرہ کچھ بے گانہ سا۔۔۔لیکن بڑا سُندر لگا۔

کچھ اور۔۔۔اس نے فرمائشی انداز میں پوچھا۔ اور وہ ترت بولا:

عشق کی بازی مت کھیلو
زمانہ بے رحم ہے پرلے درجے کا
تمہیں جینے نہیں دے گا
مجھے مرنے نہیں دے گا

روشن سینے میں اس کا ناتواں دل اتنے زور سے دَھک دَھک کرنے لگا کہ لاچار اسے ریسیور پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ پھر ذرا تنک کر بولی:

دیکھیں ارمان صاحب! آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔

وہ قطعی طور پر بھول گئی کہ اس کی تحریر کردہ نظم ارمان اس کو سنا رہا تھا۔ شدت جذبات میں وہ زمان ومکاں فراموش کرنے لگی تھی اور کچھ۔۔۔بولیں۔

ہجرت کرنے والے پنچھی
لوٹ کے آئیں
یا نہ آئیں
ہم سے ہنس کر بات کرو

اگلے ہی لمحے۔۔۔وہ اداس ہوگئی۔۔۔یک دم۔۔۔مُہر بہ لب۔

راہبہ کی خاموشی کو بھانپ کر ارمان کہنے لگا:

ارے بابا! چرچ کی پتھریلی اور سیلی سیلی دیواروں کے اندر مجبور و نارسا مقید لوگوں کو شاعری کی لطافتیں اداس و مضطرب نہ کریں گی تو کیا کریں گی؟ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ شاعری ترک کر ڈالیں یا۔۔۔چرچ کو خیر باد کہہ دیں۔ یوں شب و روز مصلوب ہونے کا کیا فائدہ؟

اچھا لیکن! آپ کی کتاب پر بہت سی باتیں کرنا ہیں جو فون پر نہیں ہو سکتیں۔ بے کار وقت کب ہوگا۔۔۔آپ کے پاس؟ اس نے ازراہِ تفنن کہا۔

میرے ایک ایک سیکنڈ کا حساب ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ زندگی میری ملکیت نہیں۔

راہبہ نے حسرت سے کہا۔ اگرچہ اس کا جی چاہا کہ ارمان کو فوراً ہی اپنے پاس بُلا لے لیکن۔۔۔ساڑھے چار بجے کی اجتماعی عبادت اس کی دلی خواہش کے آگے دیوار بن کے حائل ہوگئی۔ ذرا دیر سوچ کر بولی۔

اتوار کی دوپہر کو آجائیں۔

ٹھیک ہے۔۔۔میں ڈیڑھ بجے چلا آؤں گا۔

بھُولنا نہیں۔۔۔ضرور آنا ہے آپ نے۔۔۔میں منتظر رہوں گی۔

کیتھولک راہبہ سارہ جیمز اور مشہور شاعر ارمان کی ملاقات اتفاقیہ طور پر ایک پبلشر کے ہاں ہوئی۔ جہاں چند برس قبل ارمان نے اپنا مجموعہ کلام اور اب۔۔۔سارہ اپنی نظموں کی کتاب چھپوا رہی تھی۔ انسان دوستی، اعلیٰ ظرفی، ادبی شغف اور باہمی احترام نے دونوں کو ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا۔ غلاف میں لپٹے چہرے پہ دو سیاہ، معصوم و پاکیزہ، گہری سوالیہ، خاموش آنکھوں نے اسے اپنا اسیر بنایا تو ارمان کے اُجلے، بے غرض سرتاپا محبت میں نچڑے سراپے نے اس کے پُرسکون اور شانت دل کو زیر و بم سے روشناس کروایا۔ پبلشر کے ہاں دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ فون نمبروں کا تبادلہ ہوا۔ قفس میں بلبل کے مانند قید راہبہ کو

وسعتِ چمن کا احساس اور لامحدود آزادی کی آرزو ہوئی۔ اس سے پیشتر عمر بھر وہ ان احساسات سے ناآشنا رہی تھی۔ آزاد دنیا میں قدم رکھنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی جو ارمان کبھی کبھار اس سے ملنے کے لیے سکول کے دفتر یا اس کی رہائش گاہ کے مشترکہ وزیٹر روم میں چلا آتا۔ سارہ جیمز ہمیشہ مذہبی ہیبٹ میں ملبوس رہتی۔

فون منقطع کرنے کے بعد۔۔۔ہم سے ہنس کر بات کرو۔۔۔نظم کا یہ فقرہ کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں کھُب کر پورے تن بدن میں درد کی لہریں پیدا کرنے لگا۔ دورانِ عبادت آنکھیں میچے اس نے اپنے رب سے محوِ گفتگو ہونے کے لاکھ جتن کیے لیکن۔۔۔آج۔۔۔آج ارمان کی شکل ذہن پہ یوں مسلط تھی جیسے وہ ہی خدا ہو۔

ہر حربہ آزمانے کے باوجود اس کا خیال محو نہ کر پائی۔ لاچار۔۔۔ اپنے گلے میں پہنی مقدس صلیب کو چوما۔ عقیدت کے ساتھ پیشانی سے لگایا۔ پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اس عذاب، اس بے بسی سے چھٹکارے کی غرض سے عبادت ختم ہونے سے قبل ہی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بستر پہ دراز ہو کر سونے کی کوشش کی مگر پہلو بدلنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔ آخر تنگ آ کر سرہانے ٹنگی شیلف سے ارمان کی کتاب اٹھائی اسے کھولا اور یہ نظم اس کے سامنے نمودار ہونے لگی:

مجھے اور کچھ نہیں چاہیے
تمہاری کل وقتی دوستی کے سوا
تمہاری معنی آفریں نظر سے بڑھ کر
تمہاری پُر خلوص دوستی سے زیادہ
مجھے اور کچھ نہیں چاہیے
تمہارے قرب سے چھلکتی مسرت بہت
تمہارے ملن جنم کی نعمت ہی غنیمت
تمہارے بدن کا ذائقہ منفرد
میں تمہارے خیالوں میں رہتا ہوں، تم میرا خیال رکھتی ہو
تمہارے ہونے کا احساس ہی میرے لیے بہت ہے
جب تک تمہارا من چاہے، میرے تن سے بچی رہو
جب تک تمہیں راس آؤں، میری رہو
مجھے اور کچھ نہیں چاہیے

لیکن۔۔۔لیکن ارمان۔۔۔میں تمہیں یہ سب کیسے دوں؟ تم دیکھتے نہیں میرے پاؤں میں پڑی مذہب کی آہنی زنجیریں؟ تم کتنے احمق دوست ہو جو میرا مذاق اڑاتے ہو، میری مدد کرنے کے بجائے اُلٹا مجھ پر ظلم کرنے کے درپے ہو۔ اس کے پاکیزہ آنسو اس کے ریشمیں عارض بھگو رہے تھے اگرچہ میرا کام انسانیت کی خدمت ہے۔ میں اپنے فرض سے بخوبی آگاہ ہوں مگر یہ کیسی خدمت کیسی دلجوئی ہے؟ میں کتنی مجبور، کتنی بے بس، کتنی محرومِ آرزو ہوں کہ کسی کو اپنی ہستی، اپنی محبت بھری نگاہوں، اپنی پُر خلوص دوستی میں بھی شریک نہ کر سکوں۔ بستر پر دراز تصوراتی دنیا بسائے وہ خود کلامی میں محو تھی۔ اُسے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی پر از حد رنج ہوا۔ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کے حساس شاعرانہ ذہن میں ایسے سوالات کے چشمے اُبل رہے تھے جو اس سے پیشتر کبھی نہ سُوجھے۔ اس نے حضرت یسوع مسیح کی تصویر پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے اس بات کا جواب طلب کرنا چاہا کہ محسوساتی محبت اور تصوراتی محبت، حقیقی محبت اور غیر مرئی محبت میں کیا فرق ہے؟ ان سب کی کیا امتیازی حیثیت ہیں؟ وہ خود کو فضا میں معلق پا رہی تھی وہ خود کو اس شک میں مبتلا پا رہی تھی کہ آیا اس کے اندر جذبات نامی کوئی شے ہے بھی یا نہیں؟ اس کا سوچ تقویت پا رہا تھا کہ وہ کسی سراب کے پیچھے رواں دواں ہے۔ اسے شدت کے ساتھ اتوار کا انتظار رہنے لگا۔ اُس کا اضطرار اور بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھنے لگا۔ اس کے اندر کی دنیا میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو گیا۔

وقتِ مقررہ پر وہ ملنے چلا آیا اور سارہ کو عجیب لطافت اور روحانی مسرت کا احساس ہوا۔ اس کی ہیجان انگیزی میں یکا یک کمی واقع ہوئی۔ یہ تجربہ اس کے لیے منفرد مگر نہایت خوش کن تھا۔ ارمان نے آتے ہی راہبہ کو مخاطب کر کے اُس کی نظم بلند آواز میں پڑھی۔

سنگ کی صورت
جانے کوئی
کون کہاں پر
سنگِ میل ہو جائے
قسمت ہے معماروں کی
وہ کون سا پتھر رد کر دیں

چند ثانیوں کے لیے وہ سچ مچ پتھر کا بُت بن گئی۔ چاہنے کے باوجود اپنے تن بدن میں حرکت نہ پیدا کر سکی۔ تا وقت کہ ارمان کی کھانسی نے اسے اس طلسم سے نجات دلوائی۔

چائے پیو گے؟

آپ مقدس جام میں زہر بھر کر بھی پلا دیں تو مضائقہ نہیں۔ بات اصل میں چائے، شراب یا زہر کی نہیں، بلکہ میرے نزدیک پلانے والے کی چاہت پہ موقوف ہے۔

سارہ جیمز کے دل میں پھر نشتر سا چبھا۔۔۔پھر اک نیا تجربہ۔۔۔ شیریں۔۔۔لیکن تلخ بھی۔۔۔ اچانک ارمان کی آواز کمرے میں گونجی اور سوچوں میں گم صم راہبہ کے قلب و روح کو جھنجھوڑنے لگی۔

نشے کے عادی لوگوں کو
دُگنا نشہ ملے تو پھر ہی
پہلے والا چھٹتا ہے
عشق نشہ ہی

ہوتو ہو۔۔۔۔

اس نشے کے بارے محترمہ کا کیا خیال ہے؟

جلدی سے دائیں ہاتھ کی جنبش سے اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، جیسے غیبی قوت اور تائیدایز دی کی خواہاں ہو۔خوداعتمادی کے فقدان اور غیر یقینی کیفیت کے ساتھ ہولے سے بولی:

میں نے اس نظم میں خدا سے عشق اور۔۔خلد کی بات کی ہے۔

ارمان نے سنجیدہ اور مہذب ماحول کا خیال رکھتے ہوئے نسبتاً ہلکا سا قہقہہ مارا۔ پھر کہنے لگا۔

محترمہ! جوانسان رُوئے زمین پر بسنے والے اپنے جیسے ذی روحوں سے محبت کی کیفیات سے نہ گذرا ہو، چاہنے والوں کی اُلفت میں گرفتار ہوکر تڑپنے، مچلنے، ہجر و وصال کی لذتوں، چاہنے اور چاہے جانے کے سحر انگیز احساسات، عہد و پیماں کی مسرتوں جیسی اس محبت کومحسوس کر کے اپنے تن بدن کو سلگانے کے تجربات سے نہ گذرا ہو، وہ بے چارہ۔۔۔بھلاعشقِ حقیقی کو کیسے سمجھ اور کیونکر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے؟

راہبہ دیدے پھاڑے بڑبڑا سے تک رہی تھی۔ وہ متحیر سارہ سے مسکرا کر کہنے لگا۔

میں ناصح بن کر آپ کواس بحث میں الجھانے کا خواہشمند نہیں۔ بلکہ آپ کے تخلیقی فن کے پس منظر میں یہ بات جاننے کا آرزومند ہوں کہ ایک جیتا جاگتا، گوشت پوست کا انسان دیگر انسانوں کی طرح سانس لینے والا، جذبات و احساسات کا حامل، اپنے ہم جنسوں کو چھوڑ کر کن کیفیات، کیسے تصورات کے تحت خدا سے عشق فرما سکتا ہے؟

کیا یہ سراسر خودفریبی نہیں؟ خود کو جھوٹی تسلی دینے والی بات تو نہیں؟ کسی مجبوری ومحرومی کا شاخسانہ تو نہیں؟ کہ سراب کے پیچھے بھاگتے بھاگتے۔۔۔

یک دم راہبہ کی آ ہوسی معصوم آنکھوں سے اشکوں کی دو پتلی پتلی لڑیاں پھوٹیں اوراس کے متبرک چہرے کوتر کرنے لگیں۔ معاً متصل چرچ کے گھنٹے بجنے لگے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور عبادت کی غرض سے چرچ کی جانب چل دی۔ سیڑھیاں طے کرتے رہ رہ کر یہ سوال اسے کچوکے لگا رہا تھا:

مُو

تو صرف ایک ہے

پھر وہ

کیسے بن کہے

جان لیتا ہے، میرے

دل میں ہر چھپا خیال؟

لیکن۔۔۔عبادت کے تمام دورانیے میں اُسے اس کا جواب نہ مل سکا۔ دوسری جانب ارمان اس پاکباز، نیک نیت اور خوش اخلاق راہبہ کے بارے میں سوچتے سوچتے گھر کو سدھارا کہ فقط نیک اور منزّہ تخیل ہی فنکار کو عظمت کی رفعتوں پر لے جانے کا واحد زینہ ہے۔ لحہ بھر کو اس صالح خاتون کی شخصیت کا یہ پہلو اس کی لوحِ ذہن پر آن دھمکا۔

وہ کہتا ہے

ایک جوارن

ایسی بھی تھی

جس نے

بازی کھیلے بنا ہی

چاروں شانے چت کیا ہے

پھر ایسا ہوا۔۔۔کہ کئی روز دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ارمان اپنی دنیاوی مصروفیات میں اُلجھ گیا۔ مگر۔۔۔سارہ جیمز کے ہر خالی لمحے میں وہ اس کے ذہن میں گھس آتا۔ اس کا دل اسے احساسات و کیفیات کے بدلنے کی نوید تو سناتا جبکہ ذہن کے اندر رفٹ عقیدے کی سرخ بتی اُسے انجانے خوف، ارتکاب گناہ، عمر بھر کی تپسیا کے زیاں بارے ڈرائے رکھتی۔ راہبہ کے اندر چھپی عورت آہستہ آہستہ کروٹ بدل رہی تھی۔ جب ہی تو اکثر لاشعوری طور پر اپنی یہ نظم گنگناتی رہتی:

ہے مانگتی پھرتی ہوا

مجھ سے میرا پاگل پن

بانوری! دیوانہ پن

مانگے سے ملتا ہے کیا؟

جا کہیں سے ڈھونڈ جا کر

کوئی مرے محبوب سا

اس کے تھرتھراتے، نحیف ہاتھ اس کے ارادے کا ساتھ نبھانے سے قاصر لگ رہے تھے۔ تبھی تو اس نے بارہا نمبر دبائے لیکن ہر بار ریسیور واپس رکھ دیا۔

تمہاری آواز کیوں لرز رہی ہے؟ ارمان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

اس لیے کہ میں بے حد ڈرپوک ہوں۔

اب کے وہ مزید زور سے ہنسا۔

واہ بھئی واہ۔ خدا سے محبت کے داعی۔۔۔تو بہت بہادر اور نڈر ہوا کرتے ہیں۔ اکثر سنا تو ہے مگر آج تک دیکھا نہیں۔

اور وہ ایک دم جھینپ سی گئی۔ پھر بات کو دوسرا رُخ دے کر بولی:

کہاں رہے۔۔۔تم اتنے روز؟ کوئی اطلاع دی۔۔۔ نہ میری خبرلی؟

دراصل میں عقیدے کے خوشنما پنجرے میں داخل ہو کر تمہیں اونچی پرواز کی رغبت دِلا کر تمہارے ناتواں و بربریدہ پیکر میں خوامخواہ پھڑپھڑاہٹ پیدا کرنے کا متمنی نہیں ہوں۔ تم تو ایسی بچی کی مانند ہو جسے صدیوں پنگوڑے میں لٹا کر لوریاں دیے جا رہے ہوں۔ البتہ میری اتنی سی خواہش ضرور ہے کہ اپنے اندر

چھپے تخلیقی جوہر کی آب یاری اگر تم آزاد و بے کراں فضاؤں میں کرتیں تو ایک بہت بڑی اور ممتاز و منفرد شاعرہ ہوتیں:

وہ دھیرے سے فقط اس قدر کہہ سکی:

لیکن۔۔۔میں رہبانیت کو کیسے خیر باد کہوں؟

اس کو چھوڑنے کی بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے؟ بھئی۔۔۔اندر سے تو تم۔۔۔ہو ہی نیکوکارہ۔۔۔پاکباز۔۔۔بلکہ میرے خیال میں تو ہر نیک مرد اور نیک عورت اپنے باطن میں راہب اور راہبہ ہوتے ہیں۔ان کے لیے قطعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کا مکتبی روپ بھی دھاریں۔

اس روز تیرگی معمول سے قبل ہی فضا میں محلول ہونے لگی تھی کیونکہ شمال کی جانب سے سیاہ گھٹائیں مست ہاتھیوں کے طرح جھومتی ناچتی اُمڈی آ رہی تھیں۔ہوا میں بھی سرکشی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔چرچ کے گھنٹے فضاؤں میں انقلاب کی نوید سنانے لگے۔وہ بڑی عجلت میں کلیسا کے اندر داخل ہوئی۔اس کا اندرونی اضطراب، شفاف آنکھوں سے برکھا بن کر اُبل رہا تھا کلیسا کے نیم تاریک کونے میں چوبی بنچ پر سر جھکائے، آنکھیں میچے، اپنے مقدس باپ سے تنہا ہم کلام ہو رہی تھی۔ایک طرف محبت کی کشش۔۔۔تو دوسری جانب مذہب سے بے وفائی۔ایک طرف قلبی راحت، دوسری جانب ذہنی تحفظات، ان الجھنوں میں گرفتار، خلفشار سے دوچار، نحیف و نزار پیکرِ خاک، قہر خدا سے سہمی سہمی۔اس کے غضب سے خوف زدہ، شیطانی بہکاوے میں آ جانے کا ڈر سینے کے اندر محسوس کرتے، حتمی اقدام اٹھانے سے سراسر قاصر و بے بس تھی۔فیصلہ کرنا کڑا عذاب بن گیا۔آخری قدم یوں تھا گویا مرمریں ہاتھوں اور سبک رفتار پاؤں میں آہنی کیلیں گاڑ کر نرم و نازک جسم مصلوب کر دیا گیا ہو۔

یکا یک باہر زوردار آواز میں بادل گرجے، لحہ بھر کو رعد کے کوندے نے چرچ کو منور کر ڈالا۔خوف کے مارے اس نے آنکھیں کھول دیں۔اس کو محسوس ہوا کہ مدِ مقابل دیوار پر ٹنگا حضرت مریمؑ کا مقدس مجسمہ اپنی گود میں مسیحؑ کو لیے اس سے مخاطب ہے۔

مقدس مریم بولی:

سارہ! تم نیک اور حساس خاتون ہو۔تمہارا سینہ روشن و شفاف ہے۔ تم محبت اور انسانیت ساز صفات سے معمور ہو۔اس لیے بیٹی اپنے دل کی بات سنو۔دل جس بات کی تائید کرے اسے بلا خوف و خطر قبول کرو۔فطرت نے جب خود انسان کو آزاد پیدا کیا اسے ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے ہم جنسوں کی آزادیاں سلب کرے۔جاؤ بیٹی! آزاد فضاؤں میں گھومو پھرو، خوش رنگ پرندوں، خوش الحان پنچھیوں کی طرح چہکو اور۔۔۔پھریریاں بھرو۔جاؤ۔۔۔جاؤ ڈرو مت۔آزادی تمہارا مقدر ہے۔یہی یسوع کا پیغام اور اس کا مشن تھا۔تمام بنی نوع کے لیے۔۔۔جاؤ جا کر پہلے انسانوں سے عملاً پیار کرو، وہی الفت، وہی سچی اور کھری محبت خود بخود مقدس باپ کے عشق میں مدغم ہوتی چلی جائے گی۔سارہ نے استقامت اور اطمینان کے ساتھ چرچ سے باہر قدم رکھے۔سڑک کے اس پار ارمان سگریٹ سلگائے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ہلکی ہلکی خوش گوار پھوار برس رہی تھی۔دونوں نے خوشی خوشی ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور ایک ان جانے سفر پہ چل نکلے۔

چند قدم چلنے کے بعد سارہ نے کہا:

ارمان اپنی ایک نظم سنو گے؟

کیوں نہیں ضرور سنوں گا۔تمہاری زبان سے۔

وہ پُر اعتماد اور مترنم آواز میں کہنے لگی:

ہم یک جان ہو چکے ہیں، جیسے\
کچھ پانی میں بہت سا پانی جذب ہو گیا ہو\
اس مٹی میں ساری مٹی مل گئی ہو\
اتنی ہوا میں باقی ہوا شامل ہو گئی ہو\
تھوڑی آگ سے مزید آگ بھڑک اٹھی ہو\
ہم یک جان ہو چکے ہیں تو اب\
ہمارا حجم اور وزن بڑھ گیا ہے\
ہماری مقدار اور قوت زیادہ ہو گئی ہے\
ہمارے وقار اور معیار میں اضافہ ہوا ہے\
ہماری عزت فزوں ہوئی ہے\
ہماری محبت کثیر ہو گئی ہے

سارہ جیمز نے مسکرا کر ارمان کی جانب دیکھا، جس نے فرطِ مسرت سے اپنا بازو اس کے شانے پر رکھا اور چلتے چلتے۔۔۔اپنے سینے سے لگا لیا۔

''کششِ ثقل''

مشہور مزاحیہ اداکار چارلی چپلن نے جب آسکر ایوارڈ وصول کیا تو تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر بارہ منٹ تک ان لیے تالی بجائیں۔یہ آسکر کی تاریخ کا ایسا ریکارڈ ہے جواب تک کوئی توڑ نہیں سکا۔اڈولف ہٹلر نے چارلی چپلن سے متاثر ہو کر چھوٹی مونچھیں رکھیں تھیں یاد رہے بھارت کے نامور اداکار راج کپور بھی چارلی چپلن سے متاثر ہو کر چال ، ڈھال، لباس اور اداکاری میں اُن کی کاپی کیا کرتے تھے۔چارلی دونوں جنگ عظیم کے درمیانی عرصہ میں اداکاری کر کے لوگوں کو ہنساتا رہا لیکن وہ خود بہت حساس طبیعت کا مالک تھا۔دوسری جنگ عظیم میں اسکا ایک قول بہت مشہور ہوا تھا۔وہ کہتا ہے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک سیب گرنے سے انسان کشش ثقل دریافت کر لیتا ہے لیکن لاکھوں انسان گرنے پر وہ انسانیت دریافت نہ کر سکا۔

خاموشی کا راز

محمد متین ندوی
(بھارت)

''کیوں بھئی سہیل کیا حال ہے؟ آج آپ کچھ متفکر نظر آرہے ہیں؟ کہیں بھابی سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟''

''نہیں یار سنیل۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے سہیل بھائی؟

سہیل نے کہا''یار کیا زمانہ آگیا ہے، تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا؟''

''سہیل بھائی دیکھا تو ہے، شاید آپ شاہد کے قتل کے تعلق سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ وہ تو مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ قتل اتفاق سے نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں گائے کے گوشت کا کوئی دخل تھا، سہیل بھائی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ افواہ پھیلی اور اچانک ایسا ہو گیا؟''

''یار سنیل! میری سمجھ میں نہیں آتا وہی لوگ جو صدیوں سے ایک ساتھ رہتے اور ایک دوسرے کے غموں اور خوشیوں میں برابر شریک ہوتے آئے ہیں۔ اچانک ایک دوسرے کے دشمن کیسے بن جاتے ہیں؟ ان پر کیسا جنون سوار ہو جاتا ہے، یہ گنگا جمنی تہذیب جس پر ہم سب ہندوستانیوں کو ناز تھا، دوسرے ممالک کے لوگ اس تہذیب کو رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے اور تعجب بھی کرتے تھے۔ لیکن آج اس تہذیب کی دھجیاں اڑتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ صدیوں کی تہذیب اور صدیوں کا میل ملاپ ایسے اچانک کیسے دشمنی میں بدل جاتا ہے؟''

''ارے یار سہیل بھائی! آپ تو بہت ہی سیدھے سادھے ہیں کیا آپ کو نہیں معلوم کہ بہت سے لوگوں نے حکومت کے حصول کی خاطر، بادشاہت کی چاہت میں اپنے خونی رشتہ داروں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ تو پھر دیگر رشتوں کی کیا حیثیت ہے کہ وہ آڑے آئیں۔ بھئی یہ تو دور ہی ایسا ہے کہ کرسی حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر کرسی کے بندوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ سنیل کے قتل سے ان کا ووٹ بینک بڑھ جائے گا تو وہ کسی بھی سازش کے ذریعہ ہمارے قتل سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ انھیں نہ تو دھرم سے مطلب ہے، نہ ملک سے، نہ اپنے صوبہ سے۔ انھیں تو صرف کرسی سے کام ہے اور وہ کرسی کے حصول کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کسی ایک صوبہ یا ملک کی بات نہیں بلکہ یہ ایک عام بیماری ہے۔ رہی عام لوگوں کی بات تو وہ تو بے چارے یہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ انھیں استعمال کیا جارہا ہے؟ کیا تم نے کچھ دنوں پہلے یہ خبریں نہیں پڑھیں کہ ایک بڑے شہر میں ہندی بولنے والوں کو مارا پیٹا اور قتل کیا گیا، ان مظلومین میں مسلم بھی تھے اور ہندو بھی۔ صوبائی تعصب، مذہبی تعصب، مسلکی اور ملکی تعصب ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ حقیقت صرف کرسی کی ہے۔ اس کے حصول کے لئے کوئی بھی کھیل کھیلا جاسکتا ہے۔''

''اپنے......منتری جی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' سنیل نے پوچھا:

''یار سنیل! کیا بتاؤں انھوں نے تو وزارت کا عہدہ سنبھالتے ہی نہ بولنے کا روزہ رکھ لیا ہے، شاید وہ اپنی باتوں سے کسی کا بھی دل دکھانا نہیں چاہتے۔ جبھی تو انھوں کچھ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ چاہے کسی ادیب کا قتل ہو، کسی صحافی کا ہو، کسی عام آدمی کا ہو یا پھر اظہار رائے کی آزادی کا قتل ہو حد تو یہ ہے کہ وہ اس پر بھی دھیان نہیں دیتے کہ کون کون ردعمل کے طور پر اپنے ایوارڈ واپس کر رہا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ان سب مسائل سے اوپر اٹھ کر کام کرنا چاہتے ہیں اور مسائل یا اختلافات میں خود کو الجھانا نہیں چاہتے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا کی سیر اور وعدوں کی بھرمار کے ذریعہ ہندوستان کو سپر پاور بنانے کی دھن کے سبب انھیں فرصت ہی نہ ملتی ہو؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے سیاسی آقاؤں کو ناراض کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔ اسی لئے انھوں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے لیکن ہم تو یہ جانتے ہیں کہ''سب کا ساتھ سب کا وکاس'' جیسا عظیم نعرہ بلند کرنے والا یقیناً عظیم ہی ہوگا؟ اس خاموشی میں کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا ہے۔''

سہیل کی باتیں سن کر سنیل نے کہا:

''سہیل بھائی! انتظار کیجئے، میں خود بھی اس یادگار دن کا منتظر ہوں، جس دن وہ اپنے خوابوں اور وعدوں کو.............''

''صحافت کا لمبا سفر''

تقریباً دو ہزار سال سے زائد پہلے رومیوں نے اطلاعات کی ترویج کے لیے ایکٹا سینیٹس نامی اخبار کی بنیاد رکھی۔ سن ۶۰ (قبل مسیح) شہنشاہ کالیس جولیس سیزر نے سینیٹ کی اطلاعات اور سیاسی خبروں سے عام شہر کو باخبر رکھنے کے لیے روزانہ اطلاعاتی پرچہ جاری کیا۔ (Actadiurna) کا نام دیا۔ چنانچہ اب تک جتنی معلومات حاصل کی جا چکی ہیں ان کے اعتبار سے (Actadiurna) دنیا کا سب سے پہلا عوامی، سرکاری اور دیواری اخبار تھا۔ اس کے بعد چین میں تقریباً سو سال تک جاری رہنے والے سرکاری و درباری اخبار کی پختہ روایت ملتی ہے۔ ہندوستان ایکسپریس کے مطابق حضرت عمرؓ نے کشتی کے مقابلوں کی تفصیلات معلوم کر کے اسے تحریر کیا بعدازاں وہ اس روداد کو عوامی میلوں میں پڑھ کر سنایا کرتے۔ فار ایسٹرن اکنامک اینڈ پولیٹیکل ریویو کے الفاظ میں یہ روداد انسانی تاریخ کا پہلا اسپورٹ خبر نامہ تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں صحافت کا آغاز ۱۷۸۰ء میں''ہکی بنگال گزٹ'' نامی اخبار سے ہوا۔ تب سے اب تک دو سینتیس نامور صحافی اس سفر میں شہید ہو چکے ہیں۔

''دامانِ اضطراب''

محمودالحسن

(راولپنڈی)

دل کیا ہے ایک کلبہِ احزانِ اضطراب
جاں ہے تو وہ بھی سوختہ سامانِ اضطراب

دیکھا کیا وہ بحر کی موجوں کو روز و شب
ساحل سمجھ سکا نہ مگر شانِ اضطراب

دو روزہ انبساط کی خاطر نہ جانے کیوں
اہلِ خرد ہیں در پئے درمانِ اضطراب

وہ اور ہوں گے جن کو غرض ہے نشاط سے
ہم اہلِ دل ہیں، ہم ہیں ثنا خوانِ اضطراب

حسرت بھی ہے، اُمید بھی ہے، آرزو بھی ہے
کیا کیا ہے دل کے واسطے سامانِ اضطراب

مانا کہ دلپذیر ہے آرائشِ جمال
لیکن کہاں وہ زُلفِ پریشانِ اضطراب

محمودؔ راہِ منزلِ جاناں پہ آج بھی
چلتے ہیں قافلے تہِ دامانِ اضطراب

O

شاہین

(کینیڈا)

یہ کیسا بے سبب اک بوجھ سا دل پر لیا میں نے
اُسے جانا نہیں آموختہ بس کر لیا میں نے

جہاں بھی جاؤں میرا چاند میرے ساتھ چلتا تھا
بس اتنی بات تھی جس کا بھروسا کرلیا میں نے

یہاں گنجان آبادی ہے پر ہمسائیگی کم ہے
سو اپنے دل کو روزن کی کرن سے بھر لیا میں نے

یہاں کوئی کسی کو جاننے کا دکھ نہیں سہتا
سو خود سے بھی مکر جانے کا وعدہ کرلیا میں نے

تساہل تھا مرا یا دردِ دل کی بے کرانی تھی
کہ اوروں کی انا کا بوجھ اپنے سر لیا میں نے

میں کیوں کرتا رہوں شاہین پھر قبلہ درست اپنا
کہ جب الزام سارا کج کلاہی پر لیا میں نے

O

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

ایسے بھی سربلند جہاں سے گزر گئے
مقتل میں آئے، قامت نیزہ پہ سر گئے

جرمِ وفا کیا ہے، یہ مانا مگر وہ لوگ
کیا کیا عجب ہیں تہمتیں جو ہم پہ دھر گئے

آنکھیں لگی تھیں راہ پہ سوئے نہ رات بھر
بستی میں قافلے بھی تو اترے سحر گئے

بدلی نہیں ہے صورت حالات آج تک
کسی نے کہا کہ ہمارے مقدر سنور گئے

آندھی کا زور ٹوٹا، پرندہ ہوا میں تھا
اتنے میں آشیانے کے تنکے بکھر گئے

صحرا میں تھا ٹھکانہ ہمارا کہ صبح دم
اس کی گلی میں آئے نہ پھر اپنے گھر گئے

فصلِ خزاں پہ موسمِ گل کا گماں نہیں
ایسے بھی ہیں شجر جو حسؔن بے ثمر گئے

○

غالب عرفان

(کراچی)

نذرِ فکر و نظر ہو گئے
ہم نظر سے خبر ہو گئے

کیا کسی کی نظر دیکھتے!
خود ہی صرفِ نظر ہو گئے

ہم کہانی کے کردار تھے
داستانِ دگر ہو گئے

رات کا کیا؟ گزر جائے گی
دن سہانے بسر ہو گئے

وقت کیا ہے کہاں ڈھونڈتے؟
فاصلے دربدر ہو گئے

ایک سچ کا تعاقب کیا
فتنۂ خیر و شر ہو گئے

سامنے اس کو دیکھا تو پھر
آئنے تشنہ تر ہو گئے

دُھند میں شہرِ عرفاؔں کی ہم
کھو گئے، معتبر ہو گئے

○

یونس صابر

(پشاور)

غزل زباں میں ہی نہ بات کر سکے کوئی
سُخن پہ کون بھلا کان دھر سکے کوئی

نہ ڈوبتی ہوئی ناؤ اُبھر سکے کوئی
پُلِ صراط سے کیونکر گذر سکے کوئی

محبتوں کے زمانے نہیں آویں
تو نفرتوں سے کنارہ ہی کر سکے کوئی

پرانے یار سبھی اب گذرتے جائیں
نہ جینے پائے کوئی اور نہ مر سکے کوئی

ہیں اگلے وقتوں کے یہ لوگ کچھ نہیں کہنا
بُھلا کے رنگ بھی یادوں میں بھر سکے کوئی

یہ کیا، سخن میں نئے تجزیات کرتے رہو
فُسوں گری کو حقیقت نہ کر سکے کوئی

غزل بہانے سہی کچھ تو کہہ چلو صابرؔ!
کبھی نہ ذوقِ سخن سے مُکر سکے کوئی!!

○

حیدرقریشی

(جرمنی)

آگ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی
کس قدر مہنگی اسے شعلہ بیانی پڑ گئی

صبر کو میرے جو میری بے بسی سمجھے رہا
دیکھ کیسے اُس پہ میری بے زبانی پڑ گئی

ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے
پھر مِرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی

تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی

اعتبار اک دوسرے پر کب ہمیں تھا زندگی
جھوٹی مُوٹی دوستی تھی اور نبھانی پڑ گئی

مُشک جیسی کوئی بھی شے کب چھپانے سے چھپی
آپ کو پھر کس لئے صاحب چھپانی پڑ گئی

خوب واقف تھے کسی کے پیار سے حیدرؔ مگر
آزمائی چیز پھر سے آزمانی پڑ گئی

○

کرامت بخاری

(لاہور)

جب کبھی غم کے سبب یاد آئے
تیرے وعدے تیرے ڈھب یاد آئے

جانے کیوں ماضی کو دہرایا تھا
چند لمحات عجب یاد آئے

زیست کی آس تو کھو بیٹھے تھے
رشکِ عیسیٰ تیرے لب یاد آئے

تُم جو مل جاؤ تو اِک بات کہوں
بات تو جب ہے کہ تب یاد آئے

دیکھ کر تُم کو بھر آئیں آنکھیں
دل کے ناسور بھی کب یاد آئے

تیری محفل کا تصور جو کیا
لوگ کچھ خندہ بہ لب یاد آئے

دُشمن و دوست کی تخصیص نہ تھی
وقتِ رحلت ہمیں سب یاد آئے

اِلتجا آپ سے یہ تیرے کرامتؔ کی ہے
بھول جانا اُسے جب یاد آئے

○

واصف حسین واصف

(نیویارک)

یہ جہاں۔۔۔میری عاشقی۔۔۔تو بھی
میری دشمن رہی۔۔۔ مری خو بھی

ان فضاؤں میں تیری نسبت سے
دلکشی بھی ہے۔۔۔ اور جادو بھی

میں بھی۔۔۔ پانی پلانے نکلا ہوں
کاٹے جائیں گے میرے بازو بھی

رنگ اس کے بدن کے۔۔۔کیا کہیے
اور قاتل ہے۔۔۔اس کی خوشبو بھی

ساتھ بلّھے کے میرے کمرے میں
آ کے رہنے لگا۔۔۔ باہُوؒ بھی

شہر میں آ کے۔۔۔ مر گیا اک دن
میرے اندر تھا۔۔۔ایک سادھو بھی

زہر سقراط۔۔۔ نے پیا تھا مگر
رنج سے مر گیا۔۔۔ ارسطو بھی

صرف تو ہی نہیں۔۔۔ تصور میں
پاس رہتی ہے۔۔۔ تیری خوشبو بھی

زندگی کے۔۔۔ ہزار خانوں میں
میری مانند۔۔۔ بٹ گیا تو بھی

اپنے حصے کی روشنی۔۔۔ لے کر
ہجرتیں کر رہے ہیں۔۔۔ جگنو بھی

○

ناصرہ زبیری
(کراچی)

کھُلے گا یہ چراغوں پر اچانک
بدلتی ہے ہوا تیور اچانک

گلاب آہستہ آہستہ کھِلے گا
کوئی لے جائے گا چُن کر اچانک

کبھی وہ یاد آئے گا ہے گا ہے
کبھی بے ساختہ، اکثر، اچانک

لگی ہے ضرب اس پہ قطرہ قطرہ
نہیں بکھرا مرا پیکر اچانک

کبھی حیرت، خوشی اک ساتھ دیکھوں
چلے آؤ کسی دن گھر اچانک

یہ کیسا خوف ہے دستک سے پہلے
بدل جائے نہ تیرا در اچانک

اُٹھانے میں کٹی ہے عُمر لیکن
جُدا شانوں سے ہو گا سَر اچانک

○

اشرف جاوید
(لاہور)

زندگی یاد کے پہلو میں گزاری، ہُوئی شام
تھکا ہارا ہُوا دن تھا، تھکی ہاری ہُوئی شام

جیسے باندھا گیا ہو پاؤں سے پتھر کوئی!
ایسے ٹھہری ہُوئی، بوجھل ہُوئی، بھاری ہُوئی شام

درِ مے خانہ پہ دیکھے ہیں اکٹھے تو نے!
کبھی ہارا ہُوا عاشق، کبھی ہاری ہُوئی شام

روز جاتی ہے ستاروں کا خزانہ لے کر
روز آ جاتی ہے افلاس کی ماری ہُوئی شام

جانے کیا کیا نہ ستم ڈھائے گی آگے آگے!
صبح کے ساتھ ہی اعصاب پہ طاری ہُوئی شام

اُڑتا پھرتا تھا مُنڈیروں پہ، تو دن روشن تھا
جوں ہی ماری ہے پرندے نے اُڈاری، ہُوئی شام

سانس لینا مجھے دشوار ہُوا جاتا ہے
پہلے کیا کم تھی، جواب اور بھی بھاری ہُوئی شام

کیا گھنی چھاؤں، گھنی رات میں ڈھل جاتی ہے؟
دھوپ کی شال درختوں نے اُتاری، ہُوئی شام

جھیل تک آ گیا آفاق سے خوں بہتا ہوا
دیکھتے دیکھتے سورج کی شکاری ہُوئی شام

○

''سہمے کیوں ہوانکش!''

صادقہ نواب سحر
(مہاشٹرا، بھارت)

مسز پاٹل بہت پریشان تھیں۔ شرمندہ بھی تھیں۔ اندازہ نہیں تھا کہ ان کا شریر بچہ شرارتوں میں اِس حد تک بڑھ جائے گا کہ انہیں پورے قصبہ میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔

انکش نام کا انکش یعنی بندھن تھا مگر اس پر کوئی بندھن عائد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کلاس میں ٹیچر کے پڑھاتے وقت بھی وہ بے چین بے چین سا اپنی جگہ ہلتا رہتا تھا۔ جیسے ہی ٹیچر تختہ ءسیاہ کی جانب پلٹتیں، وہ اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کھڑا ہوتا۔ یہاں تاکتا، وہاں جھانکتا۔ یا دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹر غور سے دیکھتا رہتا اور ان کی کہانیوں، نظموں کی دنیا میں کھو جاتا۔ پتہ نہیں وہ کیوں اتنی بے کلی کا شکار تھا! لیکن کل تو اس نے حد ہی کر دی۔

دوپہر کے کھانے کے وقفہ میں نیرج نے اپنی پانی کی بوتل اسے دے کر کہا تھا، ''جا کولر سے بھر کر پانی لا..''

انکش اس کا چہرا دیکھنے لگا۔

''جلدی..نہیں تو!..''، نیرج نے تیزی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹا۔

نیرج کی ''نہیں تو!'' کی حد ہی نہیں تھی۔

''اپنے رومال سے میرے جوتے صاف کر..نہیں تو!..''

''میرا بیگ اٹھالا..''، کل ہی نیرج نے انکش سے کہا تھا۔

''میں لکھ رہا ہوں نا! میرا پروجیکٹ پورا نہیں ہوا ہے۔''، انکش چڑ کر بولا تھا۔

''جا یار! تو لے آیار!'' اس نے پاس کھڑے لڑکے سے کہا تھا، ''انکش کو اپنی ٹیم سے باہر کرتے ہیں..''، وہ کلاس کی طرف مڑا، ''کلاس میں انکش کے ساتھ کون کھیلے گا؟''

''ہم کھیلیں گی۔''، لڑکیوں کی بنچوں سے دو تین آوازیں اُبھری تھیں۔

''انکش لڑکیوں کے ساتھ کھیلے گا...انکش لڑکی..لڑکی...لڑکی...''۔

لڑکے ہاتھ ہلا ہلا کر انکش کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

یہ تو روز کی بات تھی۔

انکش بادلِ ناخواستہ اٹھا۔ بیگ پرے رکھی اور کولر سے پانی بھر کر لایا۔

''بڑی پیاس لگی ہے یار!'' نیرج نے فاتحانہ نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور بوتل منہ سے لگالی۔ پہلے گھونٹ پر ہی نیرج تھوکتا ہوا واش روم کی طرف دوڑا۔ انکش ہنسنے لگا۔

نیرج واش روم سے دوڑتے ہوئے لوٹا۔ آتے ہی اس نے انکش کے منہ پر ایک گھونسہ جڑ دیا اور دونوں کی ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔

وقفہ ختم ہو گیا۔ الیکٹرک کی گھنٹی کی گھنگھناہٹ، اپنی اپنی کلاس کی طرف دوڑتے ہوئے بچوں کے شور میں ایک جان ہونے لگی لیکن نیرج نے گھونسے بازی بند نہیں کی۔ اس کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں لڑتے لڑتے کلاس کے دروازے تک آ گئے تھے۔ انکش کی ہنسی اب بند ہو چکی تھی۔ وہ اپنی شرٹ کے اوپر کے دو بٹن لگانے کی کوشش کر رہا تھا، جو دھاگے کے ساتھ لٹک گئے تھے۔ دونوں کے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔

''ٹیچر آ گئیں۔''بچّوں نے شور مچایا اور اپنی جگہوں پر پہنچتے ہوئے ایک آواز میں بولے، ''گڈ مارننگ ٹیچر''

ٹیچر نے ان کی طرف توجہ نہیں دی تو ٹیچر سے 'سِٹ ڈاؤن' سننے سے پہلے ہی اپنی بنچوں پر بیٹھ بھی گئے۔ نیرج ابھی تک انکش سے بھڑا ہوا تھا۔ ٹیچر نے دونوں کی پیٹھ پر دھپ لگائی۔ دونوں کے کان پکڑ کر کلاس کے اندر لے گئیں۔ قصہ معلوم کرنے سے پہلے تو وہ 'پھک' سے ہنس پڑیں پھر سنجیدہ ہو گئیں۔ ٹیچر نے اپنی ہری سوتی ساری کے پلّو کو کمر میں اُڑس لیا۔ پیشانی کی ہری بندی پر ان کی مانگ کا سیندور چھلک گیا تھا۔ اس وقت ان کا چہرا گلابی ہو رہا تھا۔

''تم نے ایسے کیوں کیا؟''

''وہ مجھے روز ستاتا ہے۔''

''اچھا! اسی لئے تم نے یہ کیا! مجھ سے کیوں نہیں کہا؟''

''کہا تھا، مگر آپ بولی تھیں، 'اُس کی بات سن لے ورنہ وہ تیرے ساتھ نہیں کھیلے گا۔''

''تو تم کو کھیلنے کے لئے وہی ملا!''

''وہ مجھے کسی اور کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا!''

''اچھا! پھر تو وہ اچھا لڑکا ہے نا! تمہیں اکیلا ہونے نہیں دیتا۔ ساتھ رکھتا ہے۔''

''وہ مجھے اپنی پیٹھ کھجلانے کو بھی کہتا ہے۔''

''اسے کھجلی ہوتی ہوگی۔''

''کیا وہ تمہیں ہی اپنے کام کرنے کو کہتا ہے؟ دوسرے بچوں کو نہیں؟''

''پہلے دوسروں سے بھی کہتا تھا مگر اب مجھے ہی کہتا ہے۔ میرے پیچھے ہی پڑا رہتا ہے۔''

''کیوں کہ تم منع کرتے ہو۔ ہے نا!''

انکش ٹھٹکا پھر بولا، ''ہاں!''

پھر وہ بچوں کو مخاطب ہوئیں، بولیں، ''بچو! آپ کو پتہ ہے، انکش

نے ایک گندہ کام کیا ہے۔''

''آآآآآ...'' بچے چلائے۔

''بتاؤ اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟'' بچے چپ سادھے بیٹھے رہے،

''بولو بولو۔''

سب چپ تھے۔

''اچھا! ایک کام کرتے ہیں۔ نیرج تم ادھر آؤ۔ تمہیں ڈرائنگ اچھی آتی ہے نا! بلیک بورڈ پر ڈرائنگ بناؤ انکش کی۔''

نیرج نے ڈرائنگ بنائی۔ لمبی ٹہنیوں جیسے ہاتھ پاؤں، بغیر بالوں والا گول چہرا، اس پر دو نقطے آنکھوں، ناک کی جگہ کھڑی لکیر اور متوازی لکیر منہ کی۔

''شاباش! یہ دیکھو۔ تمہاری سکنڈ اے کلاس کے آپ کے دوست بچے نے انکش کی ڈرائنگ کتنی اچھی بنائی ہے! ہے نا! نیرج کے لئے تالیاں بجاؤ!..''

بچے تالیں بجانے لگے۔

''اب ہم 'انکش انکش' کھیلیں گے...او کے انکش!''

انکش نے 'ہاں' میں گردن ہلائی۔ وہ بری طرح سہم گیا تھا۔ نہ جانے ٹیچر اسے کیا سزا دیں!

''...چلو بچو!.. نئے کھیل کے لیے تالیاں بجاؤ..''

کلاس پھر ایک بار تالیوں سے گونجنے لگی۔

''بتاؤ یہ کیا ہے؟''، ٹیچر نے پوچھا۔

''بلیک بورڈ، ٹیچر۔'' بچے ایک سُر میں چلائے۔

''اور یہ؟'' ٹیچر نے تختہء سیاہ کے قریب، ایک اسٹینڈ سے خاکی رنگ کے پُٹھّے کا ڈبہ ہاتھ میں لیا تھا اور اس میں رکھے چاک نکال کر انہیں دکھایا تھا۔

''چاک''

''اور یہ ڈرائنگ میں بچہ کون ہے، بچو؟'' ٹیچر نے پوچھا۔ بچے چپ تھے۔ ''انکش ہے نا! بولو!..کون ہے؟''

''انکش'' بچے ایک ساتھ بولے۔ ٹیچر نے تختہء سیاہ کے اوپر رکھے ہوئے ڈبے سے چاک نکالے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور تیس بچوں کی کلاس میں تقسیم کر دیے۔ پھر انھوں نے باقی چاکوں کے بھی ٹکڑے کئے اور ڈبے میں رکھ دئے۔

''بچّو! تم نے دیکھا، بلیک بورڈ کی اس ڈرائنگ میں انکش نے کپڑے پہنے نہیں ہیں نا!''

بچے چپ تھے۔

''بولو..نہیں پہنے نا!....یس یا نو؟''

''نو ٹیچر!''، بچے ایک ساتھ چلاّئے۔

''جب میں ون ٹو تھری بولوں، تو بچے بلیک بورڈ پر اِس انُکش کی ڈرائنگ کو چاک سے ماریں گے۔ کہاں ماریں گے؟...بلیک بورڈ پر نا!....ٹھیک ہے؟ یس اور نو؟... بولو یس۔''

''یس ٹیچر''، سب چلائے، ''دیکھو یہ ایک نیا گیم ہے۔ اچھا!''

''اچھا، ون..ٹو..تھری..بلیک بورڈ کے انکش کو چاک سے مارو..''

چاک دھڑا دھڑ تختہء سیاہ سے ٹکرا کر زمین پر گرنے لگے۔

''نہیں..نہیں ٹیچر..نہیں ٹیچر..'' انکش اپنے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے چلانے لگا۔ جیسے ہی بچوں کے ہاتھ کے چاک ختم ہوتے، ٹیچر ڈبہ آگے بڑھا تیں۔ بچے اس میں سے چاک نکال کر ڈرائنگ کو مارتے۔ واقعی ان کے لیے یہ انوکھا کھیل تھا۔ ادھر انکش آنکھیں پھاڑے تختہء سیاہ پر چاک مارنے والے اپنے ساتھیوں کو اور اپنی ٹیچر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے بچے کے پیچھے منہ چھپانے لگا۔

''ساری ٹیچر...ساری ٹیچر.....ساری...ساری..'' وہ لگاتار 'ساری'، 'ساری' کہے جا رہا تھا۔

ٹیچر مسکرائیں، ساری ٹیچر کو نہیں...تم نے نیرج کو ستایا ہے، ٹیچر کے تو تم اچھے بچے ہو۔ ہے نا!''

انکش نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔

''ساری مجھے نہیں، نیرج کو بولو!'' ٹیچر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ تھرّا گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ٹیچر نے اس کے سر میں سوئی چبھو دی ہو۔ جلدی سے بولا، 'ساری نیرج'

''ایسے نہیں، یہاں آؤ۔'' ٹیچر انکش کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں۔ ''اس کے پاؤں چھو کر ساری نہیں بولو گے تو وہ معاف تھوڑے ہی کرے گا..بہت گندہ کام کیا ہے تم نے اس کے ساتھ۔''

انکش کا جی چاہا کلاس سے بھاگ کھڑا ہو۔ پلٹ کر نہ دیکھے، جیسے وہ ریس میں کرتا ہے اور ہمیشہ اول رہتا ہے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کڑی لگی ہوئی تھی۔

''چلو۔''، ٹیچر کی آواز اسے دور سے سنائی دی۔ وہ نیرج کے پیروں پر جھکنے لگا۔

''اچھا، ٹھہرو...''، ٹیچر نے انکش کو روکا اور نیرج سے پوچھنے لگیں، نیرج! کیا تم نے انکش کو معاف کر دیا؟ اس نے تم کو ساری کہا ہے۔''

''نو ٹیچر!...مجھے اب بھی غصہ آرہا ہے۔''

''بچو! تم سب نے انکش کو مارا نا؟''، وہ بچوں کی طرف دیکھنے لگیں۔

''یس ٹیچر!''

''نیرج کو اب شانت ہو جانا چاہیے نا؟...ہے نا؟... بولو یس!!''

''یس ٹیچر!...'' بچے چلاّئے

''یس ٹیچر!''

''او کے ٹیچر!''، نیرج واقعی پُرسکون ہو گیا۔

''بچو! اب کھیل ختم ہوا مزا آیا نا!..اور اِس کھیل میں .نیرج جیت گیا ہے.....تالیاں بجاؤ...'' تالیاں بجیں۔ٹیچر کا دھیان بچ سے باہر نکل کر کھڑے ہوئے بچوں کی طرف گیا،''اب سب اپنی اپنی جگہ بیٹھیں گے...یس اور نو؟''

''یس ٹیچر''

''انکش اور نیرج بھی اپنی بینچ پر لوٹ جائیں گے۔''

''اور اپنی اپنی تاریخ کی کلاس ورک بک نکالیں گے؟''

''یس ٹیچر..''

ٹیچر نے دروازے کی کنڈی کھولی۔تبھی ہیڈ مسٹریس کلاس میں داخل ہوئیں۔انہیں دیکھ کر بچے کھڑے ہو گئے۔بولے،''گڈ مارننگ میڈم!'' ہیڈ مسٹریس نے بچوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔بچے''تھینک یو میڈم'' کہہ کر بیٹھ گئے۔بچوں کو ایسی ہی تربیت دی گئی تھی۔

''میں نے سنا،اس کلاس کے بچے مکے بازی کی مشق کر رہے تھے!''

''جی میڈم۔'' کلاس ٹیچر بولیں،''انکش ہی کی شرارت ہے۔''اور ہیڈ مسٹریس کو انگریزی میں انکش کی شرارت بتائی۔

''انکش! کم ہیئر!'' ہیڈ مسٹریس اسے اپنے آفس میں لے گئیں۔اس کے ماں باپ کو فون کر کے بلالیا اور اسے پندرہ دنوں کے لیے سسپنڈ کر دیا۔

دو دن گزر گئے۔''تیرے کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔نہ نہاتا ہے نہ کپڑے بدلتا ہے۔'' ممی نے صوفے پر لیٹے ہوئے انکش کو ہلکی سی دھپ لگائی اور بولیں،''چپ چپ کیوں رہتا ہے...بول تو کیا ہوا تھا؟'' وہ انکش کی شرٹ کے باقی بچے ہوئے بٹن کھولنے لگیں،جنھیں اس نے فوراً دوبارہ لگالیا۔غصے کے باوجود ممی کو پریشان،سہمے سہمے انکش پر بے تحاشہ پیار آ گیا۔اسے بے چین دیکھ کر انہوں نے تڑپ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور سینے سے لگالیا۔

''پندرہ دن کی پڑھائی...کلاس ورک،ہوم ورک،سب کیسے کور کرو گے؟؟.... بتا...بھلا کوئی ایسی شرارت بھی کرتا ہے؟؟....اچھا تو نے اسے سزا دی..تو...کوئی ایسی سزا...کیسے سوچ سکتا ہے تو؟؟''

''وہ میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔میرے ڈبے سے مٹھائی نکال کر کھا لیتا ہے۔اوپر سے وہ مجھ سے اپنے جوتے پہنانے کو کہتا ہے،ہر روز پانی....'' آج انکش کھل کر بول رہا تھا،''میں نے سزا دی نیرج کو...''انکش نے سر اٹھا کر کہا۔

''پتہ ہے،تو نے کتنی بڑی سزا دی اس کو؟''

''ہوں''انکش نے دھیرے سے بند منہ سے جواب دیا۔

''کیوں کیا تو نے ایسا؟؟... غلطی ہو گئی نا تیری!...مجھ سے کہتا...ٹیچر سے کہتا...بول!''

''ہاں ممی!غلطی ہو گئی۔''

اچانک ممی کو کچھ خیال آیا۔انکش کی بات کاٹ کر پوچھا،''انکش!...اچھا یہ بتا...مجھے تو پتہ نہیں تھا،کیا تجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ نیرج تیری ٹیچر کا بیٹا ہے؟''

''پتہ ہے۔وہ مجھے ستاتا تھا میں نے اس کو سزا دینے کے لئے اس کی واٹر بوتل میں تھوڑا سو سو کر دیا۔''

تھوڑا!!!....بہت بڑا غلط کام ہوا ہے نا تجھ سے!''ممی نے آنکھیں پھاڑیں۔

''ہاں بہت غلط کام ہوا مجھ سے..مگر ممی انہوں نے مجھے ننگا کر کے کیوں مارا؟''،انکش نے اپنا چہرا دوبارہ ماں کے آنچل میں چھپالیا۔

''وہ تو تمہاری ڈرائینگ پر چاک پھینک رہے تھے نا!...تمہیں تو چھوا بھی نہیں۔
نا بیٹا!''

''نا ئیں ممی انہوں نے مجھے مارا....انہوں نے مجھے بہت مارا..''

مسز پاٹل نے محسوس کیا،وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔

لیکن ...ممی انہوں نے مجھے ننگا کر کے کیوں مارا؟ مجھے کتنی شرم آئی تھی۔!..ہاں ممی!...بتایئے نا!.وہ مجھے کپڑوں میں بھی مار سکتے تھے نا!...انہوں نے مجھے ننگا کر کے کیوں مارا ممی؟''وہ اپنے جسم کو ماں کی ساڑی سے ڈھکنے لگا تھا۔

مسز پاٹل کا سانولا چہرہ اور سنولا گیا۔انہوں نے بیٹے کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی۔انکش ان دو دنوں میں پھپک پھپک کر پہلی بار رویا تھا۔

''شانِ پرتو''

میں نے آئینہ میں جھانکا۔ایک چھوٹی سی بڑھیا کو واپس اپنی طرف دیکھتے پایا۔ایک جھریوں زدہ دھندلی معدوم آنکھوں اور چھدرے سفید بالوں والا چہرہ مجھے واپس تک رہا تھا۔ میں نے اپنے عکس سے پوچھا۔تم اس حالت تک کیسے پہنچیں؟ تمہارا ستواں اور تندمند بدن خمیدہ اور استخوانی کیسے بن گیا؟ جبکہ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ تمہیں قدیم یادگار سے بچاسکوں میرے عکس کی آنکھوں میں ایک جگمگاہٹ سی آئی اور اس نے جواب دیا۔اصل میں تمہارے سامنے محض تحفے کا ڈبّہ ہے اس میں رکھا نگینہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔ایک انتہائی قیمتی نگینہ جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔ایک کھرّا،خالص،نایاب۔

جو کہ حقیقت میں صرف تم ہو اس پوری دنیا میں واحد تم۔۔۔

وقت اور حالات کی کڑی آزمائشوں اور مشکلات نے تحفے کی ڈبے کو خستہ حال اور برباد کر دیا لیکن اندر چھپے نگینے کی تابانی اور قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔لہٰذا ڈبّے کو بھول جاؤ۔ظاہر کو بھول جاؤ اور اپنی ساری توجہ اپنے باطن اور اپنے قلب پر کرو۔کہیں زیادہ مطمئن،مہربان اور صابر ہو جاؤ۔پہلے سے کہیں زیادہ متقی ہو جاؤ۔اس لیے کہ جب تحفے کا ڈبّہ ٹوٹ پھوٹ کر بیکار ہو گیا تو اس میں رکھا نگینہ آزاد ہو جائے گا اور ابدالآباد تک ذاتِ باری تعالیٰ کی بلند و بالا شان کا پرتو بن جائے گا۔

فرح علی (اسلام آباد)

آدھی ادھوری کہانی

اسلم جمشید پوری
(میرٹھ، بھارت)

بہت دیر سے کہانی... ہاں وہ کہانی جس کی ابھی پیدائش نہیں ہوئی کہ تانے بانے بننے میں دماغ نے کام کرنا بند کردیا ہے۔تخلیق کار نے اپنی آنکھیں بند کر کے ذہن کو کہانی کی ابتدا، درمیان، عروج اور انتہا کے لیے سوچنے کے کام پر لگادیا ہے۔ذہن منتشر خیالات، افواہوں، خبروں، وہاٹس اپ میسیجز کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔مختلف واقعات کے ٹکڑے ہیں، جن کا ایک دوسرے سے کوئی میل نہیں ہے۔دماغ کسرتیں کررہا ہے۔لیکن ہر کوشش ناکام ہو رہی ہے۔کوئی ترتیب، سلسلہ، ترکیب انہیں ایک لڑی میں پرونے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی ہے۔واقعات کے جھماکے ہو رہے ہیں

''کیا ہوا ماں......، کیوں پریشان ہو___؟''

''کچھ نہیں بیٹا تم نے سنا، پڑوس کے گاؤں میں فلاں شخص کو اس لیے ماردیا گیا کہ وہ مارنے والوں کے مذہب کا نہیں تھا۔''

''کوئی بات نہیں ماں___ ملک کے حالات بدل رہے ہیں۔تم پریشان نہ ہو۔''

''بیٹا مجھے تمہاری فکر ہے۔تم جس فیکٹری میں کام کرتے ہو، وہاں تم اکیلے ہو۔''

''ماں...تم بھی نا...سب ایک جیسے نہیں ہوتے.......

کچھ دن بعد ماں کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی۔

''چل بے.....سیٹ خالی کر.......''

شالیمار ایکسپریس نے جیسے ہی مظفر نگر پار کیا۔چار پانچ گیروا لباس والے نوجوانوں نے ایک داڑھی والے نوجوان کو سیٹ خالی کرنے کو کہا۔

''کیوں بھائی۔میں اس سیٹ پر دیوبند سے بیٹھا ہوں___''

''بھائی تجھے کائی اور بھاشا میں سمجھانا پڑے گو''

''آپ کچھ بھی کرلو....سیٹ.......''لڑکا اپنی سیٹ خالی نہ کرنے پر اڑا تھا۔لیکن ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ چاروں پانچوں نے اسے سیٹ سے اٹھا کر بے تحاشا مارنا شروع کردیا۔لڑکے کی چیخیں، کمپارٹمنٹ کے ہر کان میں چیخ رہی تھیں لیکن مدد کو کوئی آگے نہیں آیا۔لڑکے کو ادھ مرا کر کے وہ اسے کھینچتے ہوئے ڈبے کے دروازے تک لائے....اور.....ٹرین کی رفتار، آواز اور شور میں ایک آواز یوں سما گئی گویا کبھی ابھری ہی نہیں تھی۔

رات کا پچھلا پہر........

اندھیرے کی حکومت۔فون کی گھنٹی نے نیند کی چادر کو چاک کردیا۔

''ہلو.....ہلو.......آپا.....تمہارے بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ہم انہیں لے کر ضلع اسپتال جارہے ہیں۔تم لوگ بھی وہیں آجاؤ.......''

آواز میں سسکیاں، لرزش، آنسو سب شامل تھے۔پورا گھر پل بھر میں جاگ گیا تھا۔بھابھی کے فون نے سب کو لرزا دیا تھا۔جلدی جلدی تیار ہو کر گاڑی نکالی۔میاں، بیوی، چھوٹے بھائی کی دلہن، بڑی بیٹی، چھوٹا بیٹا...... پانچ لوگ دل ہی دل میں دعا کرتے علی گڑھ کی جانب گامزن تھے۔چاروں طرف پھیلی سیاہ رات، دلی، علی گڑھ ہائی وے کی چمچماتی کالی سڑک، سناٹا، خاموشی.......ایسے میں پانچ افراد کو اپنے پیٹ میں لیے سڑک کو تیزی سے کچلتے ہوئے دوڑنے والی کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی کی لرزش اندھیرے سے خوف زدہ سی لگ رہی تھی۔ اچانک ہائی وے پر پانچ چھ افراد دکھائی دیے۔وہ اشارے سے گاڑی روکنے کو کہہ رہے تھے۔کار رک گئی تھی۔وہ بھی پانچ تھے۔ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھیار تھے۔

''کون ہو؟ کہاں جارہے ہو؟''

''بھائی ہم جلدی میں ہیں۔ہمارے ایک رشتہ دار کو اٹیک ہو گیا ہے۔ہمیں جلد سے جلد علی گڑھ پہنچنا ہے...''

''گاڑی سے اترو... جلدی کرو۔ایک طرف کھڑے ہوجاؤ...''

تین عورتیں...ماں، بیٹی اور دیورانی....دو مرد... باپ اور کم عمر بیٹا...

باپ اور بیٹے کو گاڑی میں باندھ دیا گیا۔التجا، معافی، گذارش، خوشامد، آنسو کے درمیان یکے بعد دیگرے ایک چراغ کو پانچوں نے روشنی سے محروم کیا...پھر دوسرا چراغ اور پھر تیسرے ٹمٹماتے دیے کے اجالے نوچے گئے۔رات کی خاموشی کراہتی رہی مگر کسی نے اس کی آہ نہیں سنی۔پہریدار کے آنے سے قبل قیامت گذر چکی تھی۔سانپ کے گذرنے کی گواہ لکیر کو خوب پیٹا گیا۔

ذہن کے پردے پر واقعات گتھم گتھا ہو رہے تھے۔تخلیق کار، کہانی لکھنے پر بضد ہے۔واقعات کا تانا بانا، ایک دوسرے میں پیوست نہیں ہو رہا ہے۔واقعات میں تسلسل نہیں ہے۔مرکزی ہی نہیں حاشیائی کردار بھی نہیں ہے۔کہانی کیسے وجود میں آئے۔کوئی شکل نہیں بن رہی

''گجرات بنادیں گے سمجھا...''

گائے بھینسوں سے بھرے ٹرک کو بازار میں روک کر ڈرائیور کو مار مار کر ادھ مرا کرنے کے بعد بھاگتے ہوئے جوانوں نے کہا۔پولیس آچکی تھی....زخمی کو اسپتال لے جایا گیا۔

''میانمار کے مہاجروں کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے۔''سپریم کورٹ۔

''ہم ان مہاجرین کو ہندوستان میں جگہ نہیں دے سکتے۔ان کی ہماری سرحدوں پر موجودگی ہمارے لیے، ملک کے لیے خطرہ ہے۔''ایک سرکاری ترجمان نے ٹی وی پر کہا۔

ملک کے معروف سنت کو جب جج نے 20 سال کی سزا سنائی تو سنت کے عقیدت مندوں نے ملک کے ایک بڑے حصے کی زندگی کو مفلوج بنادیا۔

سنہرا مستقبل

شیخ بشیر احمد (سری نگر، کشمیر)

جیسے ہی کریم بخش کے کانوں میں اس کی شیر جیسی دہاڑ سنائی دی۔ اُس کے اوسان خطا ہوگئے۔ پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور چہرے پر ہوا ئیاں اڑنے لگیں۔ ہاتھ میں جو تیز دھار والی کلہاڑی پکڑی تھی۔ اچانک چھوٹ کر زمین پر گئی تھی اور اُسے یوں اچانک اپنے سامنے آتے دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔

ہوا یوں کہ جلال الدین نے درخت کی اوٹ سے اُسے ٹہنیاں توڑتے دیکھ لیا تھا۔ وہ غصے میں درختوں کے جھنڈ سے نکلا اور آگ بگولا ہو کر کھری کھری سناتا تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ اس کے دماغ میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی تھی اور سرسراتی ہوئی سارے شریر میں دوڑی۔ پاس پہنچا تو اس نے اپنا داہنا پاؤں اس لکڑی کے ڈھیر پر رکھا جو تھوڑی دیر پہلے کریم بخش نے اپنا خون پسینہ بہاتے ہوئے ٹہنیوں کو توڑ توڑ کر اکھٹا کر رکھا تھا۔ طیش میں آکر اس نے اور بھی اول فول بکا جس سے اس کی حالت غیر ہوگئی اور وہ خاموش بت بنا کھڑا سنتا رہا۔ مانو اس کے جسم سے روح نکل گئی ہو۔

پھر جلال الدین گرجدار آواز میں للکارتے ہوئے بولا۔

''کریم بخش! تم جانتے ہو کہ یہاں آنے پر پابندی ہے اور کوئی بھی بنا اجازت نامہ لئے یہاں داخل نہیں ہوسکتا نہ کسی پیڑ پودے کو چھو سکتا ہے۔ پھر بھی تم نے دانستہ جرأت کی اور جرم کا مرتکب بن بیٹھے۔

پل بھر کیلئے وہ خاموش رہا پھر دوبارہ غضب ناک ہو کر بولا۔

''تجھے کیا معلوم نہیں کہ اس کیلئے متعلقہ محکمہ کا اجازت نامہ ہونا چاہیئے۔ بتا تیرے پاس ہے......؟''

کریم بخش سر جھکائے اس کی جھڑکی سنتا رہا۔ مارے خوف و شرمندگی کے اس کے چہرے کا رنگ زرد پتے کی طرح پیلا پڑ گیا۔

''غلطی ہوگئی جناب، اس بار معاف کریں۔ آئندہ شکایت نہ ہوگی۔'' آخر لرزتے کانپتے ہونٹوں سے کریم بخش نے جواب دیا۔

تُو ہر بار یہی جھوٹ بکتا ہے۔ کبھی ایک بہانہ کرتا ہے کبھی دوسرا...... پچھلی بار بھی تجھے تیرے بیمار بچے پر ترس کھا کر چھوڑا تھا۔ مگر آج خبر لینی پڑے گی۔''

یہ سنتے ہی کریم بخش بوکھلا گیا اور اس کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

''نہیں صاحب، ایسا نہ کیجئے۔ میں غلطی سے یہاں آگیا ہوں۔ مجھے اس اجازت نامے کا خیال نہیں رہا'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔ بار بار ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔

لیکن جلال الدین چپ رہنے والوں میں سے کہاں تھا کہ اُسے یوں ہی بنا کوئی سزا دیئے چھوڑ دیتا۔ نفرت و غصہ سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

''تم نے اس جنگل کو اپنے باپ کا جنگل سمجھ رکھا ہے۔ جب چاہا۔ بے دھڑک چوری چھپے لکڑیاں توڑنے کے لئے چلے آئے۔''

پھر کچھ توقف کے بعد جلال الدین نے اس کی بات کی ہو بہو نقل اتار کر تھوک نگلتے ہوئے پوپلے انداز میں کہا......

''بڑا آیا۔ اس کا خیال نہ رہا کہنے والا......''

چونکہ معاملہ چوری کا تھا اور اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ یعنی اُس نے ایک چور کی طرح چپکے سے اس علاقے کی حدود میں داخل ہو کر آس پاس کے پیڑ پودوں کی ٹہنیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ جس کی نگرانی اور رکھ رکھاؤ اس کے ذمہ تھا۔ لہٰذا اس کے خلاف کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ضروری ہوگیا تھا۔

کچھ ساعتیں یوں ہی گزر گئیں......وہ خاموش رہا۔ تو آہستہ آہستہ جلال الدین کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے اس کے آپے سراپے کا جائزہ لیا اور جانے کس بات پر مسکرا دیا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں ایک نامعلوم زہر بھرا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اُسے کسی بھی وقت الجھن میں ڈال سکتا ہے۔

کریم بخش برسوں سے جنگل کی قریبی بستی میں رہا کرتا تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی چالیس برس کی رہی ہوگی۔ لیکن مصیبتوں اور پریشانیوں نے اُسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ گاہے گاہے وہ جنگل میں جا کر لکڑیاں توڑا کرتا اور پھر بستی میں لا کر بیچ دیتا تھا۔ ورنہ عام طور پر وہ بستی میں ہی محنت و مزدوری کیا کرتا۔ غرض کسی نہ کسی طرح روکھی سوکھی کھا کر اپنا گزارہ کر رہا تھا۔

آج اچانک اُسے اس وقت ایک ایسے سرکاری اہلکار سے سامنا ہوگیا۔ جس نے اُسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ چونکہ یہ سرکاری املاک کا غبن والا معاملہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ایک ایسے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جہاں سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یوں تو دیکھنے میں جلال الدین بظاہر شریف النفس اور قد کاٹھ سے دبلا پتلا دکھائی دیتا تھا مگر کانوں تک پھیلی ہوئی مونچھیں اور شیر کی مانند دکھائی دینے والا اس کا خونخوار چہرہ دیکھ کر ہی جسم کانپ اٹھتا تھا۔ خاکی وردی میں ملبوس ہو کر وہ اکثر گشت لگایا کرتا تھا۔ برسوں پہلے وہ اس جنگل کے پیڑ پودوں اور درختوں کی نگہداشت کے لئے تعینات کیا گیا تھا۔ اس لئے وہ خود کو جنگل کا راجہ سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ ایک ادنیٰ معمولی سا ملازم (گارڈ) Guard تھا مگر اپنی چالاکی اور پھرتی سے اس علاقے کے لوگوں پر اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھے ہوئے تھا۔ لوگ بھی اُسے دیکھ کر خوف کھاتے تھے۔ البتہ اس کی کمزوری صرف یہ تھی کہ اُسے ایک عرصہ سے پینے کی لت پڑ چکی تھی۔ حالانکہ کبھی کبھی یہ عادت ایک بھلے آدمی کو ابلیس کا چیلا بنا دیتی ہے۔

کچھ سمے کے بعد جب کریم بخش نے بچنے کے تمام راستے مسدود پائے تو اس نے کسی طرح لفظوں کو اکھٹا کر کے جھوٹ کا سہارا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر بڑی انکساری سے کہا۔

''صاحب جی۔!اس سلسلے میں، میں کل ہی شہر جانے والا ہوں۔''

اس کی بات سے جلال الدین کے تیور پر کوئی اثر نہ پڑا۔ کہتے ہیں نا۔تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔وہ اس کی شاطرانہ بات کوفوراً سمجھ گیا اورغراتے ہوئے بولا۔

''کل کی چھوڑ۔فی الحال آج کی بات کر۔جب دو تین راتیں جیل کی ہوا کھانے پڑیں گی،تب تمہارے ہوش خود بخود ٹھکانے آجائیں گے۔بعد میں شہر جانے کا فیصلہ کرلینا۔''

جیسے ہی کریم بخش کے کانوں میں جیل کی بات پڑی۔اس کے چہرے کا رنگ ایک دم پیلا ہوگیا......اس لئے کہ وہ اس سے پہلے بھی دو تین راتیں اس وقت جیل کی کال کوٹھری میں کاٹ چکا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں سہہ چکا تھا جب ایک بار بستی میں بچوں کے مزاحمتی عمل کے دوران پولیس نے اُسے حراست میں لیا تھا۔

ہوا یوں کہ ایک گرم افواہ پر بستی کے کچھ بچے کسی لیڈر کی گرفتاری کے خلاف پولیس پر سنگ بازی کررہے تھے۔جوابی حملے میں پولیس نے فوراً حرکت میں آکر لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی۔اتفاق سے اس وقت کریم بخش کہیں جارہا تھا۔اچانک لوگوں کی کھلبلی سے وہ بھی ان کی پکڑ میں آگیا تھا۔

ابھی کریم بخش اسی ادھیڑ بن میں تھا۔اس کے سامنے زندگی کا ایک ایک واقعہ گھوم رہا تھا کہ اچانک جلال الدین کا ہاتھ ہوا میں لہرا اٹھا اور دیکھتے ہی اس کے گال پر ایسا ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا جس سے کریم بخش کا سر چکرانے لگا اور دن میں تارے نظر آنے لگے۔تھوڑی دیر بعد جب اس نے خود کو سنبھالا تو اس کی جانب بھیگی بلی کی مانند دیکھتا رہ گیا۔

اُسے یاد آیا۔ ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا جب جلال الدین نے رشوت کے طور پر پچاس پچاس کے دو کرکرارے نوٹ اُس سے اڑس لیے تھے اور اجازت نامہ کے لئے رینجر کے نام پر صاف اور اصلی گھی کا ڈبہ منگوالیا تھا۔مگر آج اس کا رویہ دیکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔سوچتے سوچتے جب ایک مقام پر اس کی سوچ میں ٹھہراؤ سا آگیا تو اُسے اپنی کم فہمی پر غصہ آنے لگا۔اس نے اٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی انکساری وعاجزی سے کہا۔

''حضور!میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''اب آگیا سالا صحیح رستہ پر''۔وہ زیرلب بڑبڑایا اور پھر اُسے خوش رکھنے کے لئے اونچی آواز میں بولا۔

''خواہ مخواہ میرا اتنا وقت کیوں ضائع کیا۔ایسے موقعوں پر دوسروں کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔''

یہ سن کر کریم بخش اس کا منہ تکنے لگا۔غالباً اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا تھا۔ایک لمحے کے لئے اُسے شک ہوا کہ کیا یہ وہی جلال الدین ہے جو بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔پھر جب اس کے بھدے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دیکھی تو اس نے جھٹ سے اپنے پرانے جاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔اور بیس بیس کے پانچ پرانے میلے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

''ویسے اس کی ضرورت نہ تھی۔اب جب کہ دے رہے ہو تو لینا پڑے گا۔''نوٹ اڑس کر وہ فخر سے بولا:

کریم بخش نے فوراً کمر سے بندھی ہوئی رسی کھول دی۔پھر سامنے پڑی لکڑیوں کو اکٹھا کرکے اس رسی سے گٹھا باندھ لیا۔گٹھا کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھا۔پاس کھڑا جلال الدین جو ایک ٹہنی سے تیلی کاٹ کر بےفکری کے ساتھ اپنے دانت کا میل صاف کررہا تھا۔تب تک خاموش بغور اس کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا۔جب تک وہ گھر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔نہ جانے کریم بخش کو کیا سوجھی کہ اس نے اپنی دل کی بات بتائی۔

''بڑے بابو کے نام ایک سفارشی چھٹی لکھ دیتے تو میرا کام آسان بن جاتا۔''

''ہاں!ہاں!کیوں نہیں ابھی لکھ دیتا ہوں مگر کب تک ان سفارشی چھٹیوں کے پیچھے پڑے رہو گے۔میری مانو تو زندگی بھر عیش کرو گے۔''

جال میں پھنسا جانور دیکھ کر جلال الدین کے اندر چھپا گدھ جاگ اٹھا۔اس نے بڑی معصومیت اور لگاوٹ کے ساتھ اُسے اپنے شیشے میں اتارنے کے لئے کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اس کی بات کا انکار نہ کرسکا۔''مجھے کیا کرنا چاہیئے؟......کریم بخش نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔

''وہی جو سلام الدین،علی چوپان اور قادر کو چھ کررہے ہیں۔ دیکھتے نہیں کتنی خوش حال زندگی بسر کررہے ہیں۔وہ آگے بڑھتے ہیں اور ان کے پیچھے دولت دوڑتی ہے۔ایک تم ہو لکیر کے فقیر بنے تل تل مررہے ہو۔تمہیں تمہارا سنہرا مستقبل آوازیں دے رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی کریم بخش اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ایک لمحے کے لئے اُسے شک ہوا کہ شاید یہ وہ جلال الدین نہیں ہے جو پہلے ہوا کرتا تھا۔یہ ایک دم کیسے بدل گیا۔یہ تو چوری چھپے لکڑیاں توڑنے پر میری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دیتا تھا اور جیل لے جانے کی دھمکیاں دیتا تھا مگر اب ایسا بدل گیا کہ جائز اور ناجائز کا امتیاز نہیں کرسکتا اور مجھے اس کام کے لئے اُکسا رہا ہے......

''اگر اسی میں بھلا ہے تو جیسا کہو گے میں ہر کام کے لئے تیار رہوں گا۔''گھر کی حالت یاد کرکے کریم بخش نے شکست خوردہ سپاہی کی طرح جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔لیکن میری بات کو گانٹھ میں سنبھال کر باندھ لو کبھی نہ کبھی کسی مشکل وقت میں کام آئے گی۔اگلے پل کے متعلق بالکل سوچنا نہیں کہ وہ کیسا ہوگا۔جینا ہے تو کچھ کرکے دکھانا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے جلال الدین نے جیب سے قلم و کاغذ کی پرچی نکالی اور اس پر کچھ لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھمادی پھر جاتے وقت مسکرانے کے انداز میں وداع چاہی۔

قبل اس کے وہ دونوں الگ الگ ہو کر اپنی راہ لیتے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ کریم بخش کے چہرے پر ایک نامعلوم تجسس کی لکیریں اُبھر آئیں جبکہ جلال الدین خوش تھا۔

راہ میں چلتے چلتے کریم بخش خیالات میں کھویا کھویا سا ڈوبا رہا۔ کبھی وہ جلال الدین کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ اس کے لئے سنہرا مستقبل کیسے دلا سکتا ہے۔ کبھی اپنی خوش آئندہ زندگی کے متعلق شیخ چلی کہاوت کی مانند خوابوں کے تانے بانے جوڑتا رہا۔ رہ رہ کر اس کے کانوں میں جلال الدین کی بات گشت کرتی رہی۔

''اگلے پل کے متعلق بالکل سوچنا نہیں کہ وہ کیسا ہوگا۔ جینا ہے تو کچھ کر کے دکھانا ہے۔''

کچھ دیر تک چلتے ہوئے جب وہ بلند قامت درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا تو دفعتاً اُس نے دور سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا۔ لیکن اُسے دور تک کسی کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔ چاروں جانب ایک بھیانک سناٹا پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی پیڑ پودے کی ٹہنیوں سے مرجھائے پتوں کے گر جانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

تھوڑی دور جا کر کریم بخش اس جگہ پر پہنچ گیا۔ جہاں سے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی اس ندی تک جاتی تھی۔ وہاں ایک لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ جو لوگوں کو بستی سے جنگل عبور و مرور کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ کچھ دیر ٹھہر کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ آسمان کی جانب دیکھا۔ اُسے دور دور تک کھلا کھلا نیلا آسمان کا رنگ نظر آیا۔ البتہ اسکے مغربی کنارے پر ایک سفید اور سیاہ بادل کا ٹکڑا اس طرح گڈ مڈ تیرتا ہوا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی شیر کسی ہرن کے کمر پر چھلانگ لگا رہا ہو۔

پھر جب پہاڑی کی دوسری جانب نظر ڈالی تو کچھ نامعلوم آدمیوں کو بڑی عجلت میں اترتے ہوئے دیکھا۔ کون تھے؟ اور کتنے؟ اس کی جانب اس کا دھیان نہ رہا۔ سورج ڈھلنے کو تھا۔ موسم سرد تھا اور ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ اسی اثنا میں ہلکی سی بوندا باندی شروع ہوئی۔ یہ دیکھ کر اس نے چلنے کی رفتار اور بڑھا دی۔

ابھی کریم بخش ندی کے اس پار تھا اور اپنا پہلا قدم پل پر نہ رکھا تھا۔ دفعتاً پیچھے سے کسی کے بھاری بھرکم بوٹوں کی صدا سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب اس نے اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں تو سامنے گشتی پولیس کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی کھڑی دیکھی۔ اس پر گویا حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور وہ ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔

اچانک ان میں سے ایک سپاہی نے اپنے بندوق کے دستے سے اس کی کمر پر اس قدر زور سے مارا کہ اس کے منہ سے درد بھری چیخ نکلی اور وہ شدت درد سے کراہ کر ڈگمگایا اور توازن کھو کر کٹے تنے کی طرح نیچے گر پڑا۔ لکڑیوں کا گٹھا بھی چھوٹ کر ایک طرف جا گرا۔ دوسری جانب تیز دھار والی کلہاڑی بھی گر پڑی۔

اتنے میں پاس کھڑے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر پاؤں رکھا اور اس کی جانب نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے غرایا۔

''کیا خبر لایا سالے! کتنے دہشت گرد تھے وہاں؟''

اس کی تائید کرتے ہوئے دوسرا سپاہی بولا۔ لگتا ہے بڑا چالاک اور مکار مخبر ہے۔ اپنے کام کے ساتھ ساتھ مخبری بھی کرتا ہے۔''

''ایسے ہی داڑھی والے لوگ اُن کے لئے کام کرتے ہیں۔'' دوسری طرف کسی اور کی آواز سنائی دی۔

سپاہیوں کی ملی جلی آوازیں سن کر اس پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا اور پھر اس کے پاس ان کی گالیاں سننے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟

تھوڑی سی دیر کے بعد آخر اُس نے بڑی مشکل سے ہمت بٹورتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں صاحب! میں نے کسی کو نہیں دیکھا اور میں مخبر بھی نہیں ہوں۔ میں تو جنگل میں لکڑی کاٹ رہا تھا۔''

کریم بخش نے لیٹے لیٹے ہاتھ جوڑتے ہوئے منت سماجت کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے جیسے انہوں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔

اچانک پاس کھڑا ایک تنومند جوان جو دیر سے اُسے گھور رہا تھا۔ لگتا تھا شاید ان کا آفیسر ہے طیش میں بولا۔

''اصل میں یہ آدمی لکڑیوں کے بہانے سے آتنک وادیوں سے ملتا رہتا ہے۔ سچ بتاؤ کس تنظیم کے لئے کام کر رہے ہو اور پھر تمہاری شکل و صورت سے لگتا ہے کہ تم بڑے خطرناک آدمی ہو۔''

ایک اکیلی جان کئی دشمن! ایسے میں وہ کس کس کے سوال کا جواب دیتا۔ وہ سہما سہما رحم طلب نگاہوں سے ایک ایک کو دیکھتا رہا۔ لیکن کسی کو اس پر ترس نہ آیا۔ پھر جب آفیسر کو لگا کہ وہ اس کے منہ سے راز اگلوانے میں ناکام ہو گیا ہے تو اس نے ایک دبلے پتلے سپاہی کو حکم دیا۔

''اس کی جیبوں کی تلاشی لو۔''

یہ سنتے ہی اس سپاہی نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ تلاشی کے دوران اس کی جیبوں سے ایک چھوٹا سا چاقو اور پرچی برآمد ہوئی جو اُسے جلال الدین نے دی تھی۔ رہا چاقو! اس کی مدد سے بدن کے چبھے کانٹے کو نکال دیتا تھا۔

''سر! اس کی جیب سے یہ پرچی نکلی ہے۔ لگتا ہے کہ آتنک وادیوں کا کوئی پیغام......'' یہ کہہ کر اس نے پرچی آفیسر کی جانب بڑھا دی اور مشکوک نظروں سے کریم بخش کی طرف دیکھا۔

پرچی لیتے ہی آفیسر نے کھول کر اس کی تحریر پڑھی کہ اس کی آنکھوں میں جیسے ایک دم چنگاریاں سلگ اٹھیں اور شعلے برسنے لگے۔ غصہ سے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کنپٹی کی رگیں تن گئیں۔ وہ منہ ہی منہ میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بڑبڑاتا رہا۔

''آدمی کام کا ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا کام ہو جانا چاہیے۔''

خط کے نیچے جلال الدین لکھا ہوا تھا مگر شومئی قسمت ٹیڑھی میڑھی لکیروں کے کھینچنے سے اصلی نام کی بجائے کمال الدین دکھائی دیا۔ جسے پڑھ کر آفیسر کے چہرے کا رنگ اور بگڑ گیا اور دہاڑتا ہوا بولا۔

''سالے! تو کمال الدین آتنک وادی کے لئے کام کر رہا ہے۔ بتا اس کا مطلب کیا ہے؟''

''نہیں صاحب! یہ چھٹی جمال الدین جنگل گارڈ نے مجھے اجازت نامہ بنوانے کے لئے دی ہے۔''

لیکن اس سے پہلے کریم بخش اپنی ساری روداد سناتا۔ اس کی آواز نقارہ خانے کے طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ سارے سپاہی مل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ لاتوں، گھونسوں اور بندوق کے دستوں سے اُسے اتنا زدوکوب کیا کہ اس کا سارا جسم خون سے لت پت ہو گیا۔ منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے شکنجے میں محسوس کر رہا تھا۔ جہاں سے نہ تو بھاگ سکتا اور نہ ہی ٹھہر سکتا تھا۔

ادھر ہلکی سی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی اور تیز تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔

اُسے یاد آیا۔ وہ دن بھی ایسا ہی تھا۔ جب بستی میں پولیس نے شک کی بنیاد پر دو نوجوانوں کو حراست میں لے لیا تھا۔ ان پر یہی الزام لگایا گیا کہ وہ مجاہدین سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے لئے کام کر رہے ہیں۔ شاید کسی بین الاقوامی اسلامی تنظیم کے رکن بھی ہیں۔ کئی دنوں تک ان کی رہائی کے لئے ہمہ گیر ایجی ٹیشن کے بعد جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو معاملہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ دس دن کے بعد ان میں سے ایک کی لاش ندی کے کنارے پر پائی گئی تھی جبکہ دوسرے کو زندان خانے میں اتنا ٹارچر کیا گیا۔ اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ وہاں سے نکل کر چلنے پھرنے کے قابل ہی نہ رہا اور تھوڑے عرصے کے بعد گردے کی شکایت میں دم توڑ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد کریم بخش شدید مار پیٹ سے بے حال ہو گیا۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے لئے اٹھ کر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب اس کی زندگی داؤ پر لگ گئی ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھی۔ جانے وہ نمی درد کی شدت سے یا بارش کے قطروں کی تھی۔ ایسے میں اس کے کانوں میں جلال الدین کی بات بازگشت کرتی سنائی دینے لگی۔

''اگلے پل کے متعلق بالکل سوچنا نہیں کہ وہ کیسا ہوگا۔ جینا ہے تو کچھ کر کے دکھانا ہے۔''

اچانک آسمان پر بجلی کڑکنے کے ساتھ ہی کریم بخش کے جسم میں ایک برقی قوت جیسی لہر دوڑ گئی اور اس نے اپنے ادھ مرے وجود میں ایک نئی جولانی محسوس کی۔ پھر جب ہاتھ پاؤں ہلاتے اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اب اٹھ کر کھڑا رہ سکتا ہے۔ تو اپنی بوجھل بھیگی پلکیں اٹھا کر باری باری ان سبھوں کی جانب دیکھا جو اس کی حالت زار پر بے تحاشہ قہقہے لگا کر موٹی موٹی گالیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

پھر جب اس کی آخری نگاہ آفیسر کی چھاتی سے ہٹ کر سامنے پڑی تیز دھار والی کلہاڑی پر پڑی تو اس کے اندر ایک نامعلوم ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جوش نے سر اُبھارا......!!!

- بقیہ -

آدھی ادھوری کہانی

''تاج محل..ہماری تہذیب کا آئینہ نہیں ہے۔'' صوبے کے کھیا کا بیان۔

پورے صوبے میں تاج محل کو لے کر بحث ہو رہی ہے۔ ایک فرقہ اسے نفرت کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ دوسرا فرقہ اسے ملک کی شان بتا رہا ہے۔

''دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک ہے تاج محل....''

بھیم آرمی کے چیف کی گرفتاری سے پورے علاقے میں سراسیمگی پسری ہے۔ علاقے کے دلت اور پسماندہ خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ بھیم آرمی نے ان کے اندر تحفظ کا زبردست احساس جگایا تھا۔ لیکن ان بے چاروں کو کیا پتہ بھیم آرمی نے کن کن کے اندر عدم تحفظ کا احساس جگا دیا ہے۔

ایک خاتون صحافی کا قتل... ہر طرف خاموشی اور سناٹا ہے۔ جمہوریت سسک رہی ہے۔ صدائے احتجاج بھی بلند ہونے سے قبل خاموش ہو گئی ہے۔

کہانی کار کی ناکامی، جھنجھلاہٹ میں بدلنے لگی ہے۔ واقعات، خبروں، مسیجز کے آنے کی بیپ مستقل بج رہی ہے...مظلوموں کا اژدہام دماغ کے دور تک پھیلے صحرا میں جمع ہو چکا ہے۔ اخبارات کی سرخیاں۔ عصمت دری، قتل و غارت گری، لوٹ مار، فرقہ پرستی جیسے ہزاروں مسائل جمع ہو گئے ہیں۔ کہانی کا جنم نہیں ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں پیدائش کا وقفہ ابھی پورا نہ ہوا ہو۔ ابھی بچے کی شکل و صورت کی تشکیل نہ ہوئی ہو۔

تخلیق کار غصے میں اپنے سر کے بال نوچنے لگتا ہے۔ اس کی کاوشیں بے کار ثابت ہو رہی ہیں۔ غصے اور طیش میں اس کا سر پھٹنے کو ہے کہ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں کوندتا ہے۔

''ہر کہانی کی پیدائش ضروری تو نہیں۔''

اس نے غصے میں، تحریر کردہ آدھے، ادھورے واقعات اور خبروں کے تراشوں سے سیاہ، کاغذات کو پھاڑ کر اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا ہے۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے دیکھا ڈسٹ بین میں پڑے آدھے ادھورے واقعات آپس میں گلے مل رہے تھے۔

ریت گھروندا

نکہت یاسمین (اٹک)

اُس روز میں سیکنڈ ایئر کا فرسٹ پیریڈ اٹینڈ کر کے کلاس رُوم سے نکلا ہی تھا کہ وہ میرا راستہ روک کے کھڑی ہوگئی۔

سر! آج آپ کلاس میں اتنی دیر سے کیوں آئے تھے؟ میں Tense ہو جاتی ہوں۔سر پلیز وقت پہ آیا کریں نا۔

اڑی اڑی رنگت۔۔۔ التجا بھرا لہجہ۔۔۔ رو دینے کے قریب کیفیت۔۔۔

میں نے ایک نظر اُسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

عجب خبطی لڑکی ہے۔۔۔ دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔

اب تو یہ اکثر ہونے لگا میں لائبریری میں نوٹس وغیرہ تیار کر رہا ہوتا تو وہ آدھمکتی۔

سر! مجھے بتائیں میں آپ کی کچھ Help کر دوں۔اسی طرح فری پیریڈ میں جب بھی مجھے تنہا پاتی فوراً آموجود ہوتی۔

اپنی طرف سے تو میں بہت محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھا مگر اس سے پہلے کہ کوئی سکینڈل وغیرہ بنتا میں نے استعفیٰ دے دیا۔جلد ہی مجھے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب مل گئی۔

چند دن ہی بمشکل گزرے تھے کہ اُس کا فون آ گیا۔

سر! آپ کیوں چلے گئے مجھے بتائے بنا۔۔۔ بہت دل شکستہ اور اُداس لگ رہی تھی۔اس نے معذرت کر کے ٹرپ والا دن میرے ذہن میں گھوم گیا۔

ٹرپ کا پروگرام طے ہو رہا تھا۔سب اسٹوڈنٹس نے اپنے اپنے لیکچررز سے اپنی مسز کو لانے کی فرمائش کی تھی۔

سر! آپ بھی اپنی مسز کو لائیں گے نا۔وہ پُر اشتیاق نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔میں خاموش رہا پتہ نہیں اُسے کیا دلچسپی ہے۔

ٹرپ کے روز تقریباً سبھی لیکچررز اپنی اپنی مسز کے ساتھ آئے تھے میں کچھ دیر اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔پھر وہ سب اِدھر اُدھر گھومنے نکل گئے۔میں ایک جگہ تنہا بیٹھا تھا۔۔۔ سوچوں میں گم سُم کہ اچانک وہ آ گئی۔

سر! آپ نہیں لائے نا اپنی مسز کو۔

ہو تو لاؤں نا۔۔۔ میں نے جل کر جواب دیا۔۔۔ یکدم وہ الجھ سی گئی۔

سر! آپ بہت اداس لگ رہے ہیں۔سر! آپ مجھ سے شادی کر لیں۔

کتنی سہولت سے وہ اپنے دل کی بات کہہ گئی۔

Age Difference دیکھا ہے۔تم Teen Agers ہو اور میں فورٹی کی دہائی کے قریب پہنچ رہا ہوں۔

سر! کوئی فرق نہیں پڑتا اس سے Understanding ہونی چاہیے اور بس۔۔۔

تمہیں نہیں پتہ نا۔۔۔ میں جانتا ہوں ایسی شادیوں کے بھیانک نتائج۔۔۔

مگر ہم جس عظیم ہستی کی امت ہیں،ہم ان کی مثال کیوں نہیں سامنے رکھتے۔آپؐ کی ساری زندگی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے آپؐ کی کئی ازواجِ مطہرات آپ سے عمر میں کافی چھوٹی تھیں۔یہ تو جانتے ہیں نا آپ۔

You are right but میں شاید اس معاشرے سے خوفزدہ ہوں یا شاید ضمیر کی خلش سے۔ہم اچھے دوستوں کی طرح بھی تو رہ سکتے ہیں نا۔وہ خاموشی سے اُٹھ کے چلی گئی۔

میرے سب بہن بھائی شادی کے بعد بیرون ملک ہی رہائش پذیر تھے۔والدین کے بعد میں تنہا رہ گیا۔کسی کو میرے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔سب اپنی اپنی زندگی کی گھا گھمیوں میں الجھے ہوئے تھے۔

شکر ہے کہ اچھے دوستوں کی وجہ سے خوب نبھ رہی تھی۔وہ روزانہ مجھے ڈوز پلاتے۔

یار سعد! کسی میچور ڈسی خاتون سے شادی کر لو۔گھر آباد کر و یوں تنہا زندگی گذارو گے۔آخر انہوں نے مجھے قائل کر ہی لیا۔

ایک دن میرا ایک دوست مجھے میرج سنٹر لے گیا۔وہاں صائمہ نامی ایک خاتون سے میری ملاقات کرائی گئی۔جس نے شوہر کی بدسلوکی کی وجہ سے طلاق لے لی تھی۔اس کے ساتھ دو ننھی منی بچیاں بھی تھیں۔اس نے بتایا کہ وہ اکیلی ہے اور ان بچیوں کے سوا دنیا میں کوئی اس کا اپنا نہیں۔میرا دل ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔یوں بھی وہ کافی خوبصورت اور سمارٹ تھی۔کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اسے Reject کرتا۔تھوڑی سی بات چیت کے بعد معاملہ طے پا گیا۔

معاملہ طے پانے کے بعد وہ بے تکلفی سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

سعدی! جیولری اور شادی کے ملبوسات میں اپنی چوائس کے لوں گی۔کل آپ مجھے چھٹی کے بعد شاپنگ کے لیے لے چلئے گا۔

اتنا عرصہ تنہا رہتے رہتے میں حساس ہو گیا تھا۔یوں بھی ایک پیاری سی خاتون کی ملکیت اور اُسے اپنانے کا احساس ہی اتنا نشہ آور ہوتا ہے کہ میں انکار نہ کر سکا۔

اُس نے بیش قیمت عروسی لباس کے علاوہ کئی قیمتی جوڑے۔۔۔ تین تولے کا گولڈ سیٹ اور ہزاروں روپے کا میک اَپ کا سامان خریدا۔کپڑوں اور زیور کی خریداری کا چونکہ مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

چند دوستوں کی موجودگی میں نکاح اور شادی کی رسمیں ادا ہوئیں۔سارا انتظام دوستوں کے مشورے پر ہوٹل میں کیا گیا۔

شادی سے پہلے میں نے گھر کو نئے سرے سے فرنشڈ کیا۔لان میں خوبصورت ایور گرین پودے لگوائے۔

کیسالگا گھر۔۔۔؟

پہلے روز صائمہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے سرشار سے لہجے میں پوچھا۔

Very Nice بہت باذوق معلوم ہوتے ہیں آپ۔۔۔وہ مسکرائی۔

اُس کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ کافی سگھڑ اور سلیقہ شعار خاتون ہے۔گھر کو صاف ستھرا رکھتی۔۔۔روزانہ تازہ پھولوں کا گلدستہ بیڈروم میں سجاتی۔۔۔ایئرفریشنر سے ہمہ وقت کمرے کو مہکائے رکھتی۔خوب بنی سنوری رہتی۔بچیوں کو بھی ڈریس اَپ رکھتی۔۔۔روزانہ نئی نئی ڈشز تیار کر کے بڑے اشتیاق سے مجھے کھلاتی۔کالج جاتے سمے روزانہ دروازے تک مجھے چھوڑنے آتی۔۔۔گھر آتا تو ایک دلکش سی مسکراہٹ اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر سجی ہوتی۔کبھی کبھی ذہن کے کسی گوشے سے انیلا کی یاد آتی تو میں سوچتا کہ صائمہ سے شادی کر کے میں نے بروقت اچھا فیصلہ کیا تھا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں صائمہ سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی فراغت ملی ہم ہنی مون منانے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔دن یونہی گذرتے رہے مگر اس اللہ کی بندی نے نہ تو مجھے وعدہ یاد دلایا نہ گلا شکوہ کیا۔سارا دن کام میں مصروف رہتی بات کرو تو چونک سی جاتی۔

ایک دن میں نے خود ہی پہل کی۔

صائمہ! دیکھو ہماری شادی کو تین ماہ ہو گئے۔کالج سے میں نے چار چھٹیاں لی ہیں،کیا خیال ہے کہیں گھومنے چلیں۔

وہ چپ رہی۔۔۔

مری ٹھیک رہے گا۔۔۔کیوں؟

اوہ! مری My Favourite Picnic Spot وہ یکدم کھلکھلا کے ہنس پڑی۔اور پھر ہنستی رہی۔میں نے پہلی بار اُسے ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

صبح سات بجے روانہ ہونے کا پروگرام تھا۔رات بھر میں خوابوں میں صائمہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مری کی نشیلی فضاؤں میں بادلوں کے سنگ تیرتا رہا۔۔۔چار بجے اچانک میری آنکھ کھلی۔۔۔دیکھا تو صائمہ بیڈ پہ موجود نہیں تھی۔میں آنکھیں ملتا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔میں نے سوچا کچن میں ہوگی۔پکنک کے لیے پکوان وغیرہ تیار کر رہی ہوگی۔مگر وہ وہاں نہیں تھی۔میں نے کمرہ کمرہ اُسے تلاش کیا۔گھر کونہ کونہ چھان مارا وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

دونوں بچیاں چہروں پہ فرشتوں کی سی معصومیت سجائے پُرسکون سو رہی تھیں۔

شاید کسی اور سے محبت کرتی تھی وہ۔۔۔اس لیے کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔شاید اُس نے اپنی محبت کو پانے اور ان بچیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔

قیمتی ملبوسات اور زیورات ہتھیانے کے لیے ڈاکہ زنی کا نیا تجربہ۔۔۔

کبھی اخباروں میں پڑھی تھیں ایسی خبریں۔۔۔کہ کوئی خاتون اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی۔مگر اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔۔۔؟ یہ سب میری جلد بازی اور انکوائری نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔میں انہی سوچوں میں گُم تھا کہ بچیاں جاگ پڑیں۔

پاپا! مما کہاں ہیں؟

اپنے پاپا ماما کے گھر گئی ہیں آ جائیں گی ابھی۔۔۔

چلو! جلدی سے سکول جانے کی تیاری کرو۔سات بج رہے ہیں۔

جیسے تیسے میں نے ناشتہ تیار کیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے جلدی سے انہیں سکول پہنچایا۔اگلے روز میں نے انہیں سکول ہاسٹل میں داخل کرا دیا۔یہ تو وقتی حل تھا۔مجھے ان بچیوں کے لیے ایک مستقل خاتونِ خانہ کی ضرورت تھی۔سو میں نے ایک مؤقر اخبار کے شعبہ اشتہارات کے دفتر میں ایک مختصر سا اشتہار جمع کر دیا۔

''18 گریڈ کے ایک شریف نوجوان کو ایک ایسی ہمدرد صفت خاتون کی ضرورت ہے جو دو ننھی منی بچیوں کو حقیقی ماں کا پیار دے سکے۔''

اشتہار دے کر جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا۔ایئرفریشنر سے مہکا مہکا سجا سجایا کمرہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔

- بقیہ -

''کسک میرے دل میں رہے گی''

ہم نے امرتا پریتم کے لیے ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے Life time achievement award، ۲۰۰۳ء کا اعلان کیا۔اگرچہ انہیں کسی ایوارڈ کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم نے ایک Jesture دیا۔ہم نے ان کے لیے ایک شیلڈ بنائی۔ ہمارے ادیبوں،شاعروں اور دانشوروں نے امرتا جی پر ایک ڈاکو منٹری فلم جو کہ باسو بھٹہ چاریہ نے بنائی تھی دکھائی گئی۔اس تقریب کی بڑی ستائش ہوئی کہ انڈو پاک بلکہ اس وقت دنیا بھر کی سب سے بڑی پنجابی ادبی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

مجھے ایک حسرت رہی کہ وہ پاکستان نہیں آسکیں۔میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان آئیں اور ان کا اتنا بڑا استقبال ہو کہ سارے لوگ یاد رکھیں کہ جتنی مہان ادیبہ،شاعرہ ہیں اتنا ہی بڑا ان کا استقبال ہو، لیکن میرے بار بار اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی لاہور آنے کا وعدہ نہیں کیا۔وہ ہمیشہ کہتیں اچھا میں دیکھ لوں گی۔میں ٹھیک ہوئی تو آؤں گی،لیکن وہ لاہور نہیں آئیں۔بس یہ کسک ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔

آخری چوری

طاہرنواز (اسلام آباد)

یہ اس کی آخری چوری تھی۔

اس نے پہلی چوری کب، کہاں اور کیسے کی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کوئی نامور یا پیشہ ور چور نہیں تھا۔ لیکن اسے اتنا یاد ہے کہ بچپن میں اپنے ابے کے لیے کھیتوں میں کھانا لے جاتے ہوئے دیسی مکھن میں چپڑی ہوئی روٹی کو وہ ٹکڑا ٹکڑا کر کے کھاتا جاتا۔ جو اس کی بھوک کو اشتہا دیتی کہ گھر میں مکھن سے چپڑی ہوئی روٹی اماں صرف ابے کے لیے ہی بھجواتی تھی جو کہ چوہدری کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ کھیتوں تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک روٹی کھا جاتا۔ اس کی یادداشت کے مطابق یہی اس کی پہلی چوری تھی جس کا کبھی ابے اور اماں کو پتہ نہ چلا تھا۔

یا پھر کبھی کبھی وہ اماں کے مٹی کے گھڑولے میں رکھے ہوئے پیسوں میں سے پانچ یا دس پیسے کا سکہ اچک لیتا۔ وہ دن اس کی عیاشی کا ہوتا اور مولوی صاحب کی ہٹی سے پیٹ بھر کر شکر پارے کھاتا۔ مٹی کے گھڑولے سے پیسے چرانے پر وہ دو بار پکڑا بھی گیا تھا جس پر اماں نے اس کی خوب سرزنش کی تھی۔ پر ابے سے وہ اس بات کو چھپا گئی تھی۔ اس کے لیے ابے کا محض ڈراوا ہی کافی ثابت ہوا تھا۔ اگرچہ ابے نے اسے کبھی مارا پیٹا نہیں تھا۔ اسے کبھی برا بھلا نہیں کہا تھا لیکن وہ اس سے ڈرتا تھا۔ اس کی پہلی چوری کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں لیکن بہر حال یہ اس کی آخری چوری تھی۔

اس کا نام بدرالدین تھا۔ گاؤں میں سب لوگ اسے بدرو کہتے تھے۔ باپ کی وفات پر وہ چوہدری اکرم کی زمینوں پر کام کرنے لگا تھا۔ گاؤں میں مزدوری کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور خاص کام نہ تھا۔۔ ویسے بھی گاؤں کے باسی کھیتوں میں کام کرنے کو دیگر محنت مزدوری کے کاموں سے بہتر جانتے تھے۔

چوہدری اکرم کی زمین پر کام کرنے والے اکثر مزارعے اس کے قرضدار تھے۔ زمینوں پر کام کی اجرت انہیں اتنی ملتی تھی کہ بمشکل پیٹ بھرتا تھا۔ غمی و خوشی کے موقع پر انہیں چاروناچار چوہدری کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ فراخدلی سے دی جانے والی رقم ان کے کھاتے میں درج کروا دیتا جس کا واپس کرنا ان مزارعوں کے بس میں نہ تھا۔ تو وہ نسل در نسل چوہدری کے خاندان کے کھیتوں میں کام کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں سرکشی کی جرات نہ تھی۔ اگر کوئی ایک ایسی جرات کرتا تو اس سے قرض کی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا جاتا جس کو ادا کرنا اس کے بس میں نہ ہوتا۔ یا پھر چوہدری کے وفادار ملازم اسے اتنا مارتے کہ اس میں پھر تاب نہ رہتی۔ تو ایسے کسی ایک مزارعے کی سرکشی جو کسی لاوے کی طرح ابھرتی تھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی۔ ایسے لوگوں کے لیے چوہدری دو الفاظ استعمال کرتا تھا لعنتی اور خنزیر۔

بدرو دوسرے مزارعوں سے مختلف تھا۔ وہ بہت کم گو تھا۔ صرف اپنے کام سے مطلب رکھتا تھا۔ اس کی کم گوئی پر دوسرے مزارعے اکثر اس کا مذاق اڑاتے لیکن وہ اس بات کا کوئی اثر نہ لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختصر عرصے میں چوہدری اکرم کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چوہدری اکرم جو اپنے مزارعوں پر اعتماد نہ کرتا تھا لیکن بدرو تھا جس کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا۔ تو یہ صرف اس کی کم گوئی اور ان تھک محنت کی وجہ سے تھا۔ وہ کھیتوں میں ایک جانور کی طرح کام کرتا تھا پر تھکتا نہ تھا۔

بدرو کی شادی اس کا والد اپنی حیاتی میں ہی کر گیا تھا۔ وگرنہ اس کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ یہ عذر بھی گوارا نہ کرتا۔ اور اپنی زندگی شادی کے بغیر ہی گزار دیتا۔ رشیداں جو کہ اس کی بیوی تھی اس کی سادہ لوحی پر اسے ٹوکتی لیکن بدرو کی طبیعت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

پوری بستی میں بدرو اگر کسی سے ہنس بول لیتا تھا تو وہ اس کی بیٹی تھی۔ صرف ریشماں تھی جس کے ساتھ اس کی بنتی تھی۔ ریشماں کے بچپن میں وہ اسے کندھے پر اٹھائے پھرتا رہتا۔ کھیتوں میں کام کے علاوہ سارا فارغ وقت وہ اسی کے ساتھ گزار دیتا۔ اس کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید کر لاتا جن کو دیکھ کر وہ خوش ہو جاتی۔ اس کی وجہ سے وہ رشیداں کو بھی ڈانٹ دیتا۔ یوں ریشماں اس کی لاڈلی تھی۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔

بیٹیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ ریشماں کے جوان ہو جانے پر بدرو سوچتا۔ اب اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ ریشماں کی جلدی سے شادی کر دی جائے۔ بیٹی کی شادی کا فرض وہ جلدی سے ادا کرنا چاہتا تھا پر گاؤں میں ان کا کوئی ددھیالی رشتہ دار نہ تھا۔ صرف ریشماں کا ننھیال موجود تھا۔ پر ریشماں کے مامے کا لڑکا اس کے ساتھ شادی پر تیار نہ تھا۔

ویسے بھی ریشماں اتنی خوبصورت نہ تھی کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے لیے رشتوں کا تانتا بندھ جاتا۔ اس کے حسن کو دیکھتے ہوئے کوئی ایک جوان اس پر عاشق ہو جاتا اور وہ گھر والوں کو مجبور کر کے اس کے لیے رشتہ بھجوا دیتا۔ یا پھر بدرو کا کوئی بیلی دوست ہوتا جو دوستی کے رشتے کو نبھاتے ہوئے ریشماں کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ پیش کرتا لیکن بدرو کی طبیعت ایسی تھی کہ اس کا اس عمر تک پہنچ جانے پر بھی کسی کے ساتھ ایسا یارانہ قائم نہ ہوا تھا۔ اوپر سے ریشماں بھی ایک عام سی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔

نہ ہی بدرو امیر تھا کہ اس سے جہیز ملنے کی لوگوں کو توقع ہوتی۔ تو وہ جو بیٹی کے جوان ہو جانے پر رشتہ آنے کی امید تھی بدرو کی وہ امید پوری نہ ہوئی۔

شروع میں تو ایک آس اور امید تھی لیکن جوں جوں ریشماں کی عمر بڑھتی جا رہی تھی رشیداں اور بدرو کی فکر بھی بڑھنے لگی تھی۔ ریشماں بھی اب ان سے کچھ کچھی رہتی تھی حتیٰ کہ اپنے باپ بدرو سے بھی۔ بدرو بھی اب ریشماں سے شرمندہ شرمندہ سا رہنے لگا تھا۔

ان ہی دنوں میں چوہدری اکرم کی حویلی میں کام کرنے والا خاص ملازم برکت فوت ہو گیا۔ بدرو جو کہ اپنی کم گوئی اور کام سے مطلب رکھنے کی وجہ سے چوہدری اکرم کا اعتبار حاصل کر چکا تھا۔ جس کا حویلی میں بھی آنا جانا تھا۔ اسے کھیتوں کے کام سے ہٹا کر مستقل حویلی کے کاموں پر لگا دیا گیا تھا۔ اب حویلی کے اندر کے کام بدرو ہی کرتا تھا۔

حویلی کے اندر جانے سے بدرو کے گھر کے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔ حویلی میں بچا کچھا سالن یا پھر کوئی استعمال شدہ چیز اکثر بدرو کو مل جاتی جسے وہ گھر لے آتا۔ گو وہ اب پہلے سے خوش دکھائی دیتا تھا لیکن ریشماں کی شادی نہ ہونے کی کسک اسے اندر ہی اندر پریشان کیے رکھتی۔ وہ پہلے ہی کم گو تھا لیکن اب تو اکثر چپ رہنے لگا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے وہ سوچوں میں گم ہو جاتا۔ ایسا اس دن بھی ہوا تھا جس کا احساس بدرو کو پہلی بار شدید طور پر ہوا تھا جب رضیاں جو کہ چوہدری کی حویلی میں کھانے پکانے کا کام کرتی تھی اور وہی بدرو کو بچا کچھا کھانا باقی ملازموں کو بچا کر دے دیتی تھی۔ ایسا وہ کسی غلط نظر کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف بدرو کی سادہ لوحی اور صاف فطرت کی وجہ سے کرتی تھی۔ بدرو رضیاں کے ساتھ کچن میں موجود تھا اور اس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ رضیاں قریب بیس منٹ تک جب لگا تار بولتی چلی گئی اور اور جب ایک بات کی تصدیق کے لیے اس نے بدرو کی رائے چاہی۔ اس وقت اسے بدرو کے خاموش ہو جانے کا احساس ہوا تو وہ بھی اپنی گفتگو کو روک کر بدرو کو دیکھنے لگی جو اپنے کام کو روک کر کسی بات کو سوچنے بیٹھا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ رضیاں جو اتنی دیر سے باتیں کر رہی تھی تو اس نے اس کی ایک بات بھی نہ سنی تھی۔ وہ بدرو کو آوازیں دیتی رہی لیکن بدرو اس کی جانب تب متوجہ ہوا جب رضیاں نے آوازیں دینے کے بعد اسے جا کر کندھے سے جھنجھوڑا۔ تو اس کے بعد اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ بیٹھے بٹھائے کہیں سوچوں میں گم ہو جاتا تھا۔

بدرو کی سادہ لوحی کو دیکھتے ہوئے چوہدرانی بھی اس پر اعتماد کرنے لگی تھی۔ حویلی سے باہر کوئی چیز بھیجنی ہو تو بدرو کے ہاتھ ہی بھیجی جاتی تھی۔ پیسوں کے لین دین کے معاملے میں بھی وہ دوسرے ملازموں سے زیادہ قابلِ بھروسہ تھا کیونکہ اکثر دوسرے ملازم تھوڑی بہت رقم سامان لاتے ہوئے دائیں بائیں کر لیتے تھے۔ لیکن بدرو ایسا نہ تھا۔ اس نے ساز و سامان لاتے ہوئے کبھی پیسوں میں ہیر پھیر نہ کی تھی۔

بدرو اس دن خوش تھا جب ساتھ کے گاؤں سے ریشماں کے لیے رشتہ آیا تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں ریشماں سے دس سال بڑا تھا لیکن اس طویل انتظار نے جہاں انہیں مایوسی کی حد تک پہنچا دیا تھا تو وہ اب اس موقع کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ رشتہ لے کے آنے والی ماسی کو رشیداں اور بدرو نے ہاں کر دی تھی۔ یوں دونوں گھروں میں بات پکی ہو گئی۔ لیکن اس خوشی میں رخنہ اس وقت پڑ گیا جب دولہے والوں نے یعنی ریشماں کی ساس نے پچاس ہزار کی شرط رکھ دی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر پچاس ہزار جہیز میں ملے گا تو بارات اس صحن میں آئے گی ورنہ وہ اپنے بیٹے کے لیے کوئی دوسری لڑکی تلاش کر لے گی جو اسے اتنا جہیز دے گی۔

سنگھار میز پر پڑے ہوئے روپوں کے بنڈل نے بدرو کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ بدرو کی نظر جب کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ان روپوں پر پڑی تو ایک دم ٹھہر گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا لیکن اس نے شدت سے اسے جھٹک دیا۔ یہ روپے دراصل چوہدرانی نے نکال کر رکھے ہوئے تھے۔ چوہدرانی کی بچپن کی سہیلی کی شادی تھی۔ آج اس نے اپنی سہیلی کے ساتھ شہر میں زیور پسند کرنے جانا تھا۔ سہیلی کو شادی پر بڑا تحفہ دینے کے لیے اس نے پچاس ہزار نکال کر سنگھار میز پر رکھے تھے۔ جب وہ اپنی تیاریوں میں مصروف تھی تو اسے ایک کام سے باہر صحن میں جانا پڑا۔ پیسوں اور دیگر زیورات جو کہ سنگھار میز پر پڑے ہوئے تھے کے غائب ہو جانے کی اسے کوئی فکر نہ تھی کہ ایسا پہلے کبھی نہ تو ہوا تھا اور نہ ہی ان کے وہم و گمان میں تھا جو اس دن ہو گیا تھا۔

جب چوہدرانی ایک کام سے متعلق رائے لینے کے لیے باہر صحن میں چوہدری کے پاس آئی تو اسی وقت بدرو کمرے کی صفائی کے لیے اندر داخل ہوا تھا جہاں اس نے سنگھار میز پر روپے پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ اپنے اس خیال کو جو بار بار اس کے ذہن میں آ رہا تھا اس نے جھٹکنے کی کوشش کی اور تیزی سے چیزوں کو صاف کرنے لگا۔ لیکن اس تیزی سے صفائی کے دوران بھی وہ کنکھیوں سے پڑے ہوئے روپوں کو دیکھتا۔ اسی وقت چوہدرانی کے سنگھار میز پر پڑے ہوئے زیورات پہنے ہوئے اس نے اپنی بیٹی کو خیال کیا۔ اس نے دیکھا کہ ریشماں سرخ جوڑے میں ملبوس اس کے صحن سے رخصت ہو رہی ہے۔ سنگھار میز کے آئینے میں یہ منظر اسے واضح طور پر دکھائی دیا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ سنگھار میز کے قریب گیا اور کپڑا پھیر کر اس کی صفائی کرنے لگا۔ صفائی کے دوران اس نے روپوں کو ایک مرتبہ ہاتھ میں لیا اور پھر ڈر کے مارے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ بدرو نے روپوں کو وہیں رکھ دیا۔ وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ دور کچن سے رضیاں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ تیزی سے اندر مڑا اور سنگھار میز کی طرف بڑھا۔ اس نے روپوں کا وہ بنڈل اٹھایا اور انہیں اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ اسی جلدی میں پھر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ گاؤں کے کچے راستے پر دوڑا چلا جا رہا تھا۔ چوہدرانی سے اجازت لینے کے بعد کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور گھر جانا چاہتا ہے وہ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ ویسے بھی چوہدرانی شہر جا رہی تھی تو اس نے بدرو کو چھٹی دے دی تھی۔ بھاگتے ہوئے وہ نیفے میں اڑسے ہوئے روپوں کو ہاتھ لگا کر دیکھ لیتا کہ وہ وہاں پر موجود ہیں۔ کہیں گر نہ گئے ہوں۔۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو اتنی جلدی میں دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر بند کیا کہ ریشماں اور رشیداں کو اس کی اس حرکت پر شدید حیرت ہوئی۔ وہ ان دونوں کو پکڑ کر اندر کمرے میں لے گیا۔ اس نے اپنے بے ربط

ہوتے سانس کو بحال کیا اور ان دونوں کے سامنے روپے نکال کر رکھ دیے۔ایسا کرتا ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔خوشی اس کے چہرے پر صاف دیکھی جا سکتی تھی۔اسی خوشی میں اس نے ریشماں کی طرف دیکھا اور محبت میں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا ساتھ ہی حمیداں کو کہا:

"ان روپوں کو جلدی سے کہیں چھپا دے اور خبردار ان کے بارے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کرنا۔"

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فضلو بدرالدین کو بلانے کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔دروازے میں کھڑے کھڑے ہی اس نے بدرو کو چوہدری کا حکم سنایا کہ چوہدری صاحب کہے رہے ہیں کہ بدرو کو ساتھ لے کر آنا۔یہ بات سن کر ایک رنگ تھا جو بدرو کے چہرے پر سے گزر گیا۔

چوہدری نے مار مار کر بدرو کی چمڑی ادھیڑ دی لیکن اس نے زبان نہ کھولی تھی۔چوہدرانی بھی اس وقت شدید غصے میں تھی۔اسی غصے میں وہ رک کر بدرو کو کھری کھری سناتی اور پھر ٹہلنے لگتی۔چوہدرانی کے گم ہو جانے والے روپوں سے متعلق رضیاں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ ان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔اپنی اس بات کی گواہی کے لیے وہ قران پر ہاتھ رکھنے پر بھی تیار تھی۔اور یہ کہ اس نے چوہدرانی صاحبہ کے کمرے سے بدرو کو جلدی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ویسے بھی حویلی کے اندر اس وقت اس کے ساتھ صرف بدرو ہی تھا۔اس لیے سارا شک بدرو پر ہی کیا جا رہا تھا لیکن اتنی مار کھانے کے باوجود بدرو کچھ بتانے کے لیے تیار نہ تھا۔

کمر پر پڑھنے والی بید کی چھڑی اس کے وجود پر نیل ڈال دیتی۔اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی لیکن وہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور کچھ بولتا نہ تھا۔نہ ہی اس درد سے اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو نکلا تھا۔چوہدری کی انتہائی کوشش کے باوجود بھی جب بدرو نے زبان نہ کھولی تو چوہدری غصے میں اٹھا اور بدرو کو بری طرح مارنا شروع کر دیا۔اس وقت اسے اس بات کی کچھ خبر پروا نہ تھی کہ چوٹ بدرو کو کہاں لگتی ہے۔اس کی بلا سے بدرو مر جائے۔لیکن بدرو کی ڈھٹائی پر چوہدری حیران تھا اور اسی حیرانی میں وہ غصے میں آ گیا تھا اور بدرو کو مارنے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دیتا جاتا تھا۔

بس کریں چوہدری صاحب مر جائے گا۔چوہدرانی نے آگے بڑھ کر چوہدری کا ہاتھ تھام لیا۔

چوہدری نے ہاتھ روکتے ہوئے غصے میں بدرو کو ایک زوردار لات رسید کی جس سے وہ پیچھے گر پڑا۔یہ لعنتی، خنزیر ایسے نہیں مانے گا یہ کہہ کر اس نے فضلو کو آواز دی کہ جلدی سے تھانیدار کو بلوا لائے۔

تھانیدار نے بھی اپنی سی پوری کوشش کی لیکن بدرو کچھ نہیں بولا۔نہ جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔چوہدری کے کہنے پر وہ بدرو کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اسے حوالات میں بند کر دیا تھا۔ان کا خیال تھا کا بدرو تھانے میں رہے گا تو سب کچھ اگل دے گا۔

جب ریشماں اور رشیداں اسے ملنے آئیں تو اسے حوالات میں دوسرا دن تھا۔اس نے تھانیدار کو کچھ نہیں بتایا تھا۔تھانیدار کے ہر سوال پر وہ خاموش رہتا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے اس ساری مار پر اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو یا پھر وہ ایسا دِکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

ریشماں اور رشیداں ڈری ڈری جب حوالات کی سلاخوں کے پاس پہنچیں تو انہیں دیکھ کر بدرو بمشکل اٹھا۔اس کی نظریں دوپٹے میں لپٹی ہوئی ریشماں پر ٹھہریں ہوئی تھیں۔اٹھتے ہوئے پہلی بار اسے درد کی شدید ٹیس محسوس ہوئی۔لیکن وہ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلاخوں کے پاس پہنچا۔ریشماں اور رشیداں دونوں رو رہی تھیں۔

سلاخوں کی دوسری طرف سے اس نے ریشماں کو سینے سے لگانے کی کوشش کی۔اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔اس نے اتنے دنوں سے آنسوؤں کے سامنے جو بند باندھ رکھا تھا ریشماں کو سینے سے لگاتے ہی ٹوٹ گیا تھا۔

- بقیہ -

واہ جائے خوب است

میاں حضرات کا رویہ کرائے کے سپاہیوں کا سا ہوتا۔جو جنگ میں کسی دشمنی یا اصول کی بنا پر نہیں بلکہ محض اس وجہ سے حصہ لیتے ہیں کہ انہیں پیٹ نے مجبور کیا ہوتا ہے۔چنانچہ روز روز کی لڑائی میں مرد خاموش اور بے تیغ سپاہی کی طرح ہوتا۔۔۔تیغ عورت کے ہاتھ میں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ گھر والی کے دل میں ڈھول سپاہی کے خلاف دشمنی سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ ہوتا تھا۔یہ رشتہ واہ کے مرد وزن میں پوری مضبوطی سے قائم تھا۔اس رشتے کی بنیاد مردوں کے احساسِ شکست پر تھا۔ویسے ہی جیسے ہارے ہوئے جواری ایک دوسرے کے غم کو آپس کی ہمدردی میں گھول کر پی لیتے ہیں۔مردوں کا عمومی رویہ یہی ہوتا تھا۔ایک عجیب سا احساسِ شکست جس کا تمغہ واہ میں مرد کے سینے پر آویزاں نظر آتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم یہ احساسِ شکست جہانگیر کی شخصیت کا پرتو تھا نہیں! لیکن جس انداز سے نور جہاں، شہنشاہ جہانگیر کے دل میں دھڑکن بن کر اتری اور اس کے دل پر چھا گئی تھی۔نور جہاں، شہنشاہ ہند جہانگیر کی ملکہ کیا بنی کہ اس نے ہندوستان کی حکومت سنبھال لی اور عملاً یہ تھا کہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ حکم کا درجہ رکھتے تھے۔

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے احساسِ شکست کو تسلیم کر کے تا عمر ''شادکام'' رہا۔مگر وہ بادشاہ تھا۔اپنے رتبے اور جلال والے لباس فاخرہ میں اس احساس کو چھپائے رکھتا تھا۔شکست خوردہ پورس کی طرح واہ کے مردوں نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔

افسانچے

محمدابرارالحق

(رانچی، بھارت)

خیمہ

پپّو! ٹیپ بند کردو۔اذان ہورہی ہے۔''ممی نے کچن سے ہانک لگائی۔

لیکن پپو بدستور گانا سنتا رہا۔

''ارے سنتے کیوں نہیں؟ بہرے ہو گئے ہو کیا؟ کہا نا کہ اذان ہو رہی ہے۔بند کرو یہ گانا وانا۔''

غصّے میں تمتماتی ممی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''یہ تو اہلِ حدیث کی اذان ہے ممی۔'' معصوم پپو کا جواب سن کر ممی ٹھگی سی کھڑی رہ گئیں۔

خطرہ

''کیوں جی انور! سنا ہے تم آج کل خوب شراب پینے لگے ہو۔یہ اچھی بات نہیں ہے۔قران میں اس کی سخت ممانعت ہے اور پھر یہ تمہارے لیے تو اور بھی مضر ہے۔''

''میرے لیے؟ وہ کیسے؟''

''تمہیں دو لڑکوں کے علاوہ ایک خوبصورت لڑکی بھی ہے!!!''

دیرآید

''یہ رسالہ تمہیں کیسا لگا؟''

''بہت ہی معیاری ہے یار!''

تعجب ہے! تم نے حسبِ معمول اب تک اسے پڑھنے کے لیے نہیں مانگا؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے کہ میں اب رسالے خرید کر پڑھتا ہوں۔''

''واہ! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔لیکن یار! یہ تو بتاؤ تم میں یہ تغیر آیا کیسے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پرزہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

پرزے میں کسی میگزین کے تعلق سے آمدنی اور خرچ کی تفصیل کے ساتھ پانچ سو اکتیس اعزازی کاپیاں بھیجنے اور بیوی کے سونے کا ہار بیچنے کا تذکرہ بھی درج تھا۔

معصوم سوال

''انکل! میں یہ چاکلیٹ نہیں لوں گی'' پانچ سالہ شبنم نے اپنے گھر آئے مہمان سے کہا۔اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔

''بھلا کیوں بیٹی؟''مہمان کو سخت تعجب ہوا۔چاکلیٹ ابھی تک اُسی کے ہاتھ میں تھا۔

''انکل! ممی بتاتی ہیں کہ ماں، باپ، بھائی بہن جیسے سگے رشتے داروں کے علاوہ دوسروں سے مٹھائی لینے سے لڑکی زخمی ہو کر ہوسپٹل چلی جاتی ہے۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ممّی یہ نہیں بتاتی ہیں۔آپ بتائیے نا انکل؟شبنم کا سوال اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگا۔اس ننھی سی جان کو وہ کیا جواب دیتے؟ بس خاموشی اُن کی مدد کو آ گئی!!

ڈنک

نو آموز کہانی کار اپنے پڑوس کے ایک نامور افسانہ نگار کے تنقیدی رویے سے بے حد نالاں تھا۔وہ ہمیشہ اُن کی تحریروں میں خامیاں نکال کر اُس کی حوصلہ شکنی کیا کرتا تھا۔ایک دن بڑی احتیاط سے اُس نے ایک کہانی تیار کی اور اُسے لے کر اُن کے پاس جا پہنچا۔

''نہایت بکواس لکھتے ہو تم، یہ بھی کوئی کہانی ہے؟'' کہانی کو غور سے پڑھنے کے بعد وہ اُس پر برس پڑے۔''کہانی لکھنا تمہارے بس کی بات نہیں...سمجھے!!!'' پھر قدرے نرم لہجے میں گویا ہوئے''کیوں اپنا اور میرا قیمتی وقت برباد کرتے ہو؟''

لیکن اس بار وہ نو آموز کہانی کار بالکل نروس نہیں ہوا اور نہایت مضبوط اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

''سر! یہ آپ کی ہی کہانی ہے جو''بیسویں صدی'' کے جنوری ۱۹۷۰ء کے شمارے میں''منزل ابھی دور ہے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔میں نے تو صرف عنوان اور کرداروں کے نام ہی تبدیل کیے ہیں...!!!''

اتحاد

ریاض کی ایک بہت بڑی امریکن آئل ریفائنری کمپنی کے ایم ڈی مسٹر آئی ایل وِنسن کا چہرہ ایئر کنڈیشن کے باوجود پسینے کی ننھّی ننھی بوندوں سے بھر گیا جب انھوں نے دیکھا کہ مزدوروں کا ایک مشتعل ہجوم اُن کے چیمبر کے سامنے کمپنی کے خلاف نعرہ لگا رہا ہے۔ بڑی سے بڑی بھیڑ کے پیچیدہ معاملوں کو سلجھانے اور اُن کے غم وغصّے کو چٹکیوں میں دور کرنے میں ماہر وِنسن کا اس بار خوف زدہ ہونا لازمی تھا کیوں کہ اُن کی تجربہ کار آنکھوں نے پہلی بار وہاں پر ایک ساتھ موجود ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی مزدوروں کو پہچان لیا تھا۔

شریعت کا پابند

''دینی مزاج کے خوبصورت، دراز قد، انجینئر لڑکے کے لئے، دنیاوی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم یافتہ، روزہ نماز وحجاب کی پابند لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔جہیز کی ضرورت نہیں، برادری کی کوئی قید نہیں، شادی نہایت سادگی کے ساتھ مسجد میں انجام پائے گی۔تقریب بینڈ باجے، آتش بازی، آرکیسٹرا، قوّالی و ناچ گانے جیسی لغویات سے پاک ہوگی۔لڑکی کے والدین شریعت کے پابند ہوں اور شادی کے دو ماہ کے اندر اپنی تمام تر جائداد سے لڑکی کا شرعی حصّہ اُس کے نام منتقل کر دیں''اشتہار کا آخری جملہ پڑھتے ہی الحاج حافظ منظور حسین کا منہ لٹک گیا۔

☆

''نئے سال میں''

تبسم انوار
(کینیڈا)

جہاں ہر نفس کو امان ہو نئے سال میں
بڑا پُر سکون جہان ہو نئے سال میں
ہو وہ آسمان کی وسعتوں سے بھی ماورا
مری سوچ کی جو اڑان ہو نئے سال میں
دے بشارتیں وہ نئی سحر کے طلوع کی
دمِ فجر کی جو اذان ہو نئے سال میں
جو بھلا کے سب مجھے سال بھر رکھے مبتلا
کوئی درد ایسا جوان ہو نئے سال میں
ہوں رہ جنوں کی مسافتیں جو کٹھن تو ہوں
مرا عزم مثلِ چٹان ہو نئے سال میں
بھری بزم میں مرے درد کا جو سفیر ہو
میرا ایسا طرزِ بیان ہو نئے سال میں
مرے یار تھے وہ جو آستینوں کے مار تھے
اے الٰہی ان سے امان ہو نئے سال میں
جو محبتوں کے خمیر سے ہو گندھی ہوئی
وہی ہر بشر کی زبان ہو نئے سال میں
مرے دل میں تم ہی بسے ہو تم کو یقین ہو
نہ کسی کو پر یہ گمان ہو نئے سال میں
رہیں جس کو آپ کے التفات کی حسرتیں
وہ تبسم آپ کی جان ہو نئے سال میں

○

جاوید صدیق بھٹی
(لاہور)

اے ہوا اُس پہ یوں اثر کرنا
سردِ جذبات کو شرر کرنا
سنگ پگھلا تو یہ کھلا مجھ پر
کتنا مشکل ہے دل میں گھر کرنا
اُس مسیحا کو بھی نہیں آیا
زخمِ دل پر مرے نظر کرنا
یہ ہے توہین آدمیت کی
کسی ظالم کو چارہ گر کرنا
رات کاٹو کسی تمنا میں
تم کو آ جائے گا سحر کرنا
کیسے جاوید ہم کریں منزل
اپنی قسمت میں ہے سفر کرنا

○

فیاض احسن
(مہاراشٹر، بھارت)

رات نے کیسے مرا سارا بدن گرما دیا
میں نے سورج کو اشارہ دے کے سب سمجھا دیا
زندگی لازم نہیں ہے زندگی کے واسطے
کل مجھے سوکھے ہوئے اک پھول نے مہکا دیا
چھین لینا چاہتا تھا میرا مشکیزہ مگر
میں نے کوزے میں سمندر ہی اس دکھلا دیا
قبر کی مٹی مرا کنکال تک کھا جائیگی
زندگی تو نے مجھے لاکر کہاں پہنچا دیا
شاعری اس کا تقاضہ تو نہیں کرتی مگر
میر جی کو ایک لونڈے نے بہت بہکا دیا

○

وشال کھلّر

(لدھیانہ، بھارت)

ہیں چراغوں کو اجالوں سے ملانے والے
لوگ یہ تیری شبستاں میں سمانے والے

کب پرستار ہوئے گل کے، گلستانوں کے
تیری پابند زمینوں کو جلانے والے

اب کے ویران سے کھنڈر میں ہیں تنہا تنہا
دل کی محفل کو ترا نام بتانے والے

بہتا دریا نہ رہا میں وہ روانی نہ رہی
اب کہاں ہیں وہ مرا ساتھ نبھانے والے

زرد کے شہر میں آرام طلب ہیں کھلّر
تھے جو مشتاق بہاروں کے کمانے والے

○

عارف شفیق

(کراچی)

گھر سے چیخیں اٹھ رہی تھیں اور میں جاگا نہ تھا
اتنی گہری نیند تو پہلے کبھی سویا نہ تھا

دکھ قیامت کا ہوا تھا اس کے کٹنے پر مجھے
جس شجر کے سائے میں دم بھر کو بھی بیٹھا نہ تھا

اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں اپنی لاش
ساتھ میرے باپ کے کیوں مجھ کو دفنایا نہ تھا

میرے خدوخال میں روشن تھے اُس کے خدوخال
آئینے میں اس کا چہرہ تھا مرا چہرہ نہ تھا

اپنے بچوں میں بہت مصروف رہتا ہوں مگر
ایک پل بھی باپ کو اپنے کبھی بھولا نہ تھا

نشۂ آوارگی جب کم ہوا تو یہ کھلا
کوئی بھی رستہ میرے گھر کی طرف جاتا نہ تھا

کیا گلہ اک دوسرے سے بے وفائی کا کریں
ہم نے ہی اک دوسرے کو ٹھیک سے سمجھا نہ تھا

گل نہ تھے جس میں وہ گلشن بھی تھا جنگل کی طرح
گھر وہ قبرستان تھا جس میں کوئی بچہ نہ تھا

آسماں پر تھا خدا تنہا مگر عارف شفیق
اس زمیں پر کوئی بھی میری طرح تنہا نہ تھا

○

سبیلہ انعام صدیقی

(کراچی)

ہیرے کو کِیا سنگ جو دنیا کے ستم نے
یہ دل کا تقاضا ہے کہ اپنا لیا ہم نے

برسات میں دو پل وہ مرے پاس تو بیٹھے
احسان بہت مجھ پہ کِیا ابرِ کرم نے

وہ بنتے گئے رات کے آنچل پہ ستارے
موتی جو گرائے شبِ غم دیدہ ءِ نم نے

خود کو ہی بھلا بیٹھے تری یاد میں جاناں
کیا حال کِیا دیکھ ترے ہجر و الم نے

مدت سے لگا رکھا ہے سینے میں سجا کر
''پالا ہے ترے غم کو بڑے لاڈ سے ہم نے''

ہر فکر سے آزاد ہوئے بیٹھے ہیں ایسے
جس طرح صدا دی ہو ابھی ملکِ عدم نے

تقلید میں مغرب کی ہے گمراہ زمانہ
برباد کِیا سب کو اسی نقشِ قدم نے

اخلاص و محبت کی ہے الفاظ میں خوشبو
برسائے ہیں یہ پھول سبیلہ کے قلم نے

○

شریف شیوہ
(لاہور)

نوکری کرنا مجھے آیا نہیں — میں کسی کو اس لیے بھایا نہیں
لیکے جاؤں میں کہاں کچّا مکان — کالا بادل کس جگہ چھایا نہیں؟
دستِ شفقت لیکے اُس بچے کو ڈھونڈ — جس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں
میں نہیں بہکا تو ہے میرا کمال! — ورنہ کس نے مجھکو بہکایا نہیں!
دل دیا تھا ٹانک کرزخموں کے پھول — ان کو یہ تحفہ پسند آیا نہیں
ایک بھائی سو رہا ہے بھر کے پیٹ — دوسرے نے آج کچھ کھایا نہیں!!
میں ہوں زخمی لوگ لائے ہیں نمک — ایک کے بھی ہاتھ میں پھایا نہیں
چھاؤں شیوہ ڈھونڈیئے زیرِ زمیں — اب زمیں پر تو کہیں سایہ نہیں!

○

کرشن پرویز
(کھرار، مشرقی پنجاب)

جو دل پہ گذرتی ہے بتائی نہیں جاتی — یہ درد کی دولت ہے لٹائی نہیں جاتی
احباب عجب ڈھنگ سے بنتے ہیں مسیحا — باتوں سے لگی دل کی بجھائی نہیں جاتی
تم کو نہ سہی ہم کو تو ہے پاس وفا کا — جھوٹی تو قسم آپ کی کھائی نہیں جاتی
نالوں نے مرے عرشِ بریں کو بھی ہلایا — تم سے تو زباں تک بھی ہلائی نہیں جاتی
پتھر کا جگر لائیں گے پرویز کہاں سے — آگ اپنے نشیمن کو لگائی نہیں جاتی

○

احسان قادر
(لاہور)

کوئی جس لحظہ گل افشانی میں رہتا ہوگا — بلبل اُس وقت پریشانی میں رہتا ہوگا
عشق ہی سرکشِ عالم ہے سنا ہے جب سے — حسن کیفیتِ ہیجانی میں رہتا ہوگا
میرے دکھ درد پہ یوں خوشیاں منانے والے — خود بھی تو کیا کسی آسانی میں رہتا ہوگا
جس نے بھی عالمِ امکاں کی حقیقت سمجھی — وہ ہی کیفیتِ رندانی میں رہتا ہو گا
زندگی ہم نے گزاری ہے قیامت جیسی — کوئی خوش فہم تن آسانی میں رہتا ہو گا
جس نے بھی آنکھوں سے رحمت کا نظارہ دیکھا — وہ بھی کیا شوکتِ سلطانی میں رہتا ہو گا
ہمیں قدرت نے ہے ادراک کی دولت بخشی — تو کسی اور ہی حیرانی میں رہتا ہو گا
حسن بھی حسنِ کمالات کو حاصل کر کے — تیری صورت کی نگہبانی میں رہتا ہو گا
اپنی بے طرح جدائی پہ ہیں نادم ہم بھی — تو بھی اے دوست پشیمانی میں رہتا ہوگا

○

حبیب الرحمٰن چوہان
(میرپورخاص)

چاند مدھم اداس تارے ہیں — سب ترے ہجر کے اشارے ہیں
پھول کھلنے کی رت نہیں کوئی — آپ آجائیں، سب نظارے ہیں
ترے ہونٹوں پہ تل کا یہ مطلب — دیکھ کتنے جوان مارے ہیں
بات کرتے ہو کس جدائی کی — تم کو لگتا ہے ہم تمہارے ہیں؟
تم اِسے اپنی داستاں کہدو — درد لیکن یہ سب ہمارے ہیں

○

عزیزاللہ عابد
(حیدرآباد)

محبتوں کے سفر میں نزاکتیں کیسی — قدم قدم پہ ہیں کانٹے شکایتیں کیسی
ترا سلوک ہماری سمجھ سے بالا تر — نہیں ہے ساتھ جو دینا وضاحتیں کیسی
پڑھوں تو خون یہ فوراً ہی کھول اٹھتا ہے — کہانیوں میں چھپی ہیں صداقتیں کیسی
ترا خیال مجھے ہی ہمیشہ رکھنا ہے — وفا کا تاج ہے سر پر عداوتیں کیسی
تمہارے پیار میں دردر کی ٹھوکریں کھائیں — کہی ہے بات یہ سچی بجھارتیں کیسی
بڑی طویل مسافت کے بعد ناکامی — اب ایسے عشق کی خاطر فراغتیں کیسی
اسے نہیں ہے اٹھانا جو بار چاہت کا — زباں پہ بات وہ لائے قباحتیں کیسی
جسے تھا ناز اکیلے مزے سے رہنے کا — پڑی ہیں اس کو اچانک ضرورتیں کیسی
وہ جس کی یاد بھی تکلیف کا سبب ٹھہرے — دل و دماغ میں اس کی شباہتیں کیسی
بڑا ردھم ہے قدم سے قدم ملانے میں — بھری ہوئی ہیں دلوں میں کدورتیں کیسی
سبھی کو سب سے لگن تھی خیال تھا سب کا — گئے دنوں کی تھی عابدؔ محبتیں کیسی

○

انجم جاوید
(کراچی)

سب رنگ عرش وفرش کے اس نے بھرے تصویر میں — پھر لکھ دیا یہ خواب قدرت نے میری تقدیر میں
ہم توڑنا چاہیں کوئی رشتہ یہ ممکن ہی نہیں — جکڑے ہوئے ہیں سب کے سب اک اجنبی زنجیر میں
انساں کے بس میں کچھ نہیں یاسب کچھ اس کے بس میں ہے — کچھ فرق تو رہنے ہی دیں تقدیر اور تدبیر میں
کیوں حرف اپنی معرفت کھونے لگے ہیں ان دنوں — کیوں تشنگی محسوس ہوتی ہے ہر اک تحریر میں
کس کو نہیں ہوتا میاں ارمان خود بینی یہاں — کھویا رہا وہ دیر تک آج اپنی ہی تصویر میں

○

شگفتہ نازلی
(لاہور)

مسلک ہو گر ثواب تو رکھنا حساب کیا — ازبر ہو سب کلام، تو رکھنا کتاب کیا
مستور رہنا دوستی کی شرط تو نہیں — جب طے ہو چکا تو پھر رکھنا حجاب کیا
گُل سی شبیہہ کا لطف و کرم ساتھ گر رہے — تو پاس رکھی میز پر رکھنا گلاب کیا
جانے کبھی کتاب کو کھولیں گے یا نہیں — پھر درمیاں وہ شعر کا رکھنا شتاب کیا
غیض وغضب میں ہوش کہاں، کس کو رہتا ہے — کہنا تھا جو ہیں کہہ چکے رکھنا عتاب کیا
سیدھے سبھاؤ بھی کبھی کہہ سُن لیا کریں — ہر بات پر ہے آپ کو رکھنا جناب کیا
کتنے سوال کیجیے گا ، ہر اک سوال میں — مخفی ہے خود جواب بھی، رکھنا جواب کیا!

○

نسرین نقش
(سری نگر)

کوئی بھی دیکھنے والا نہ تھا کسی کی طرف — رواں تھا قافلہ دلدل میں تیرگی کی طرف
یہی سبب ہے جو بے نور ہوگئیں آنکھیں — کہ ہم نے دیکھا تھا اک بار روشنی کی طرف
وہ دیوتا تھے گریبان میں جھانکتے کیسے — سبھی کی انگلیاں اُٹھیں میری کمی کی طرف
ہوئے جو عشق ستم آج تو خیال آیا — کہ ہم نے پھینکے تھے پتھر کسی ولی کی طرف
بس ایکبار ہی دیکھا تھا تجھکو غیر کے ساتھ — پلٹ کے پھر نہیں دیکھا تیری گلی کی طرف
کہاں کہاں میں بچاتی نشیمن ہستی — ہزاروں برق تھیں رقصاں میری خوشی کی طرف
فدا ہے جس پہ مری جاں میرا دل نسرین — نہ دیکھا اُس نے کبھی میری سادگی کی طرف

○

خالد راہی
(کراچی)

بہتان بن کر بھلا کیسے جیا جاسکتا ہے — پیالہ زہر کا خود سے کیسے پیا جاسکتا ہے
بہت ہوتے ہیں اپنے سے اپنے — جن کے بنا بھی جیا جاسکتا ہے
مختصر ہے مگر تکلیف دہ ہے بہت — بدل لیجیے رستہ بھٹکایا جاسکتا ہے
میں لکھ رہا ہوں کسی بھی ڈھب میں — ویسے تو زبانی بھی سمجھایا جاسکتا ہے
روح کو ڈھونڈ رہا ہوں زندوں میں راہی — ورنہ مردوں کو تو دفنایا جا سکتا ہے

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۱۲

میرے قدموں میں پنچی کے سینکڑوں ناگ ایسے بیٹھے تھے جیسے شکست خوردہ فوجیں فاتحین کے سامنے ہتھیار ڈال کر بیٹھتی ہیں۔ سانپوں کے اوپر پھولوں کی پتیاں اور روپے پڑے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میری بین بجانے کے دوران پجاری پتیاں نچھاور کر کے اور روپے دان کر کے اپنی مرادیں مانگتے رہے ہوں۔ سانپوں کے پیچھے سپیرے، سنت، شمان، جوگی، منتری اور پجاری میرے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے جبکہ میرا ذہن بالکل خالی تھا۔ جس سپیرے سے بین کرائے پر لے کر میں نے بجائی تھی وہ میرے قدموں پر ہاتھ دھرے کسی خوفزدہ بچے کی طرح بلبلا رہا تھا۔ کھڑا ہونا چاہا تو مجھے احساس ہوا کہ نیتو نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھا تھا اور اس کا بازو میری کمر کے گرد گھیرا کیے ہوئے تھا۔ میرے ہلنے سے وہ بھی جاگ گئی۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے سے اٹھا کر میری جانب دیکھا تو مجمع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا یہ سب کیسے ہوا نیتو؟ تو وہ کسی زندہ لاش کے انداز میں بولی ''راموجی پہلے یہاں سے نکل چلیں پھر بتاؤں گی۔''

کھڑا ہوا تو نیتو بھی میرے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے راستے میں بیٹھے ہوئے سانپوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا قدم بڑھایا تو سانپ ہمارے راستے سے ایسے ہٹنے لگے جیسے کوئی غیر مرئی قوت انہیں میرے راستے سے ہٹا رہی ہو۔ ہم سانپوں کی بھیڑ سے نکل کر انسانوں کی بھیڑ تک آئے تو وہاں پر کھڑے ہوئے لوگوں نے ہمارے لیے راستہ بناتے ہوئے پھول کی پتیاں نچھاور کرنا شروع کر دیں۔ کچھ نے جھک کر میرے قدم چھونے کی کوشش بھی کی۔ کچھ نے اپنا سر ہمارے راستے میں بچھایا، کسی نے میرے جسم کے کسی حصے کو چھونے کی کوشش کی لیکن ہمیں روکنے کی جرأت یا کوشش کسی نے نہیں کی۔ بین بجانا بند کرنے اور اٹھنے تک ماحول میں جو سکتہ طاری تھا وہ ہولے ہولے ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ ایسے میں مجھے احساس ہوا کہ بین ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ پیچھے مڑا اور اپنا بازو لمبا کر کے بین بلبلاتے ہوئے سپیرے کے حوالے کی۔ اس نے میرے ہاتھ سے لے کر روتے ہوئے بین کو بے تحاشہ چومنا شروع کر دیا۔ ہمارے راستے میں کھڑے ہوئے لوگ اب بھی ہمارے قدموں میں پھول کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ بھیڑ جیسے جیسے کم ہوتی گئی ہمارے قدم تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم بھیڑ کو بہت پیچھے چھوڑ آئے۔

نیتو مجھ سے چمٹ کر ایسے چل رہی تھی جیسے اسے خطرہ ہو کہ مجھ سے جدا ہوتے ہی وہ کہیں کھو جائے گی۔ پولو گراؤنڈ سے نکل کر ہم اپنی گاڑی کی جانب بڑھے۔ اس دوران ہم دونوں نے ایک لمحے کو بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ کہیں کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ جس بات کا امکان تھا ضرور لیکن کم تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے انگریزی میں نیتو سے کہا، میں ڈرائیور کی وجہ سے آپ سے انگریزی میں بات کر رہا ہوں۔ میری آپ سے ایک بنتی ہے کہ فلحال پنچی کے اس واقعے کو اپنے تک رکھیں۔ اس نے انگریزی میں پوچھا، کیوں؟ میں نے جواب دیا، مجھے تو خود بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ سب کیا تھا اور کس لیے ہوا تھا۔ اگر کوئی پوچھے تو میں کیا جواب دوں گا؟ ہاں اب آپ مجھے بتائیں کہ یہ سب کیسے ہوا۔ نیتو کہنے لگی سب سے پہلے تو میرا من آپ کی بین کی سریلی لے سے ڈولنے لگا۔ پھر ہمارے آگے سپیرے کی پٹاری میں رکھا ہوا سانپ پٹاری سے نکل کر آپ کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد پنچی میں آپ کی بین کی آواز کے علاوہ باقی بینوں کی آوازیں آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئیں۔ ساری پنچی میں صرف آپ کی بین کی جادوئی آواز باقی تھی اور پنچی کے تمام سانپ آپ کی بین کی آواز سے یا بین کے جادو سے آپ کے قدموں میں ایسے آ کر بیٹھنا شروع ہو گئے جیسے کوئی طاقتور مقناطیسی قوت انہیں آپ کی بین کی آواز کی جانب کھینچ رہی ہو۔ سانپوں کے پیچھے ان کے سپیرے اور سپیروں کے پیچھے شمان، منتری، سنت، پجاری اور سب آہستہ آہستہ آ کر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ میں نے آپ کا کندھا ہلانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا تمام جسم شل ہو گیا ہے۔ جیسے کوئی طاقت آپ کو بین بجاتے ہوئے سننا چاہتی ہو۔ جب میں اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دے سکی تو میں نے اپنا سر آپ کے کندھوں پر رکھ دیا۔ لیکن ایک بات ہے مجھ جیسی ایک معمولی سی چھپکلی سے ڈر جانے والی لڑکی آج پہلی بار آپ کی موجودگی میں سینکڑوں سانپوں کے درمیان ایک پل کے لیے بھی خوفزدہ نہیں ہوئی۔ راموجی اتنے سارے سانپ اور اتنے سارے لوگ آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر ایسے کھڑے تھے جیسے پجاری مندروں میں دیوتاؤں کے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا مجھے سچ سچ بتاؤ راموجی کہ تم حقیقتاً کیا ہو اور یہ سب کیا تھا؟ نیتو نے آپ کا لبادہ اتار کر مجھے تم سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ تم جہاں جاتے ہو لوگوں کے دلوں پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہو۔ سب سے پہلے تم مجھے جھیل پر متاثر کر گئے۔ پھر تمہارے بارے میں ہمارے پرنسپل مسٹر سمتھ نے مجھے حیرت میں ڈالا۔ میری ممی اور پاپا بھی تمہارے گُن گاتے ہیں۔ انسان تو انسان، سانپ جیسے موذی جانور بھی تمہارے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں۔ ابھی پنچی میں یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم کوئی مہان ہستی ہو جو انسانوں کا روپ دھار کر ہمارے درمیان موجود ہو۔ لوگ خواہ مخواہ کسی کے آگے پیچھے نہیں پھرتے، کچھ دیکھ کر ہی پھرتے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں کوئی ڈھنڈورا بھی نہیں پیٹتے پھر رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بین بھی تم نے میری خواہش پر مجھے خوش کرنے کے لیے بجائی تھی کسی اور کو سنانے یا دکھانے کے لیے نہیں بجائی تھی۔ لیکن ایک بات صاف کہوں گی جس وقت اتنے سارے سانپ اور اتنے سارے لوگ غلاموں کی طرح تمہارے سامنے بیٹھے تھے، مجھے تمہارا ساتھی ہونے پر مان ہو رہا تھا۔ جس وقت ہم لوگوں کے برسائے ہوئے پھولوں کی بارش میں چل رہے تھے، میں خود کو

شہزادی سمجھ رہی تھی۔ اور مجھے یہ شہزادگی صرف اور صرف تمہارے کارن ملی تھی۔ رامو جی، مجھے تو یہ سب کچھ ایک جادو نگری کی کہانی معلوم ہوتی تھی اور تم میرے جادوگر سپیرے ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

میں خود بھی اس واقعے پر اتنا ہی حیران ہوں جتنی تم ہو۔ میں نے بھی اسے آپ کی بجائے تم سے مخاطب کرتے ہوئے کہا، میرے ساتھ اس سے ملتا جلتا حادثہ آج سے دو ڈھائی برس پہلے بھی ہو چکا ہے۔ نہ میں اس وقت تیار تھا اور نہ ہی میں آج تیار تھا۔ اگر مجھے کبھی اس کی وجہ معلوم ہوئی تو یقین کرو سب سے پہلے اس کی خبر تمہیں کروں گا۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں یہ سب کچھ اپنے تک محدود رکھنے کو کہا ہے۔ ایسے میں گاڑی کارخانے میں داخل ہوئی تو میں نے اپنے کپڑوں سے پھولوں کی پتیاں جھاڑیں اور پھر نیتو کے جسم سے پتیاں جھاڑ کر کوٹ اور ٹائی پہن لی۔ گاڑی رکی تو نیتو نے اپنا دوپٹہ اٹھایا اور ہم گاڑی سے نکل کر فیکٹری میں داخل ہو گئے۔

ہم دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے کئی برآمدے طے کرنے کے بعد ایک کمرے میں پہنچے جہاں ایک چھوٹے قد اور ادھیڑ عمر کے چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے پختہ رنگ کے آدمی کو دیکھ کر نیتو بازو پھیلائے دینو چاچا کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ دینا ناتھ نے نیتو کو گلے لگاتے ہوئے کہا، میں تم سے روٹھا ہوا ہوں۔ تم دو بار پہلے کلکتہ آنے کے باوجود مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ تمہارے گھر اور میرے دفتر کے درمیان سو گز سے کم کا فاصلہ ہے اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اپنے بوڑھے چاچے کو اپنی پیاری صورت دکھا جاؤ۔ نیتو بولی، اچھا اس بار معاف کر دیں میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ ہر بار آپ سے ملنے آیا کروں گی۔ تم ہر بار یہی وعدہ کرتی ہو اور ہر بار وعدہ توڑتی ہو، دینا ناتھ شکایتی لہجے میں بولا۔ وعدہ توڑنے کے لیے ہی تو کرتی ہوں، چاچا، نیتو ہنس کر بولی۔ ہے شریر کہیں کی، دینا ناتھ ہنستا ہوا بولا۔ نیتو سے مل کر دینا ناتھ میری جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ زہے نصیب، ہاں تو یہ ہے تمہارا رامو جی۔ ہاں چاچا یہی میرا رامو ہے؟ نیتو نے مسکرا کر دینا ناتھ کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ دینا ناتھ کہہ رہا تھا تمہارے پاپا اور ممی مجھے اب تک نہ جانے کتنی بار اس کے بارے میں ہدایات جاری کر چکے ہیں۔ جی ہاں، یہی وہ رامو ہے چاچا دینو، میں نے مسکرا کر اپنا ہاتھ انکی جانب بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

دینا ناتھ نے ہنستے ہوئے میرا ہاتھ تھامنے کی بجائے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا، کاکا جاٹ ہاتھ نہیں دل ملایا کرتے ہیں۔ مجھے گلے لگانے کے بعد اس نے مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے نیتو سے کہا، تمہیں پسند آئے یا نہ آئے بھئی، ہمیں تو یہ نوجوان بہت بھایا ہے۔ مجھے بھی یہ نوجوان بہت پسند ہے چاچا، نیتو نے میری طرف دیکھتے ہوئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کے ساتھ دینا ناتھ نے اپنی میز کی دراز کھول کر کئی فارم نکال کر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا، میں نے سب کچھ خود ہی بھر لیا ہے تم بس ان فارموں پر اپنا مکمل نام، تاریخ پیدائش اور جسم کا کوئی شناختی نشان والے خانہ پر کر کے آخر میں دستخط کر دو۔ تمہارا کام ختم اور ہمارا کام شروع ہو جائے گا۔ میں نے ایسے ہی کیا۔ دینا ناتھ نے پُر کئے ہوئے فارم مجھ سے لے کر پڑھے اور پھر بولا تمہاری اور میری تاریخ پیدائش ایک ہے۔ اگر سالوں کو نہ گنا جائے تو تم میرے ہم عمر ہو۔ میں نے کہا، اور سالوں کو گنتا ہی کون ہے۔ دینا ناتھ ہنس کر کہنے لگا بھئی عرصہ ہوا ہم نے اپنی عمر کے سال گننا ترک کر دئے ہیں۔ نیتو نے دینا ناتھ سے پوچھا ممی اور پاپا کہاں ہیں چاچا؟ پاپا ایک کاروباری میٹنگ میں گئے ہیں اور تمہاری ممی شان جی کے ساتھ کارخانے میں ہیں۔ تمہاری ممی کہہ گئی ہیں کہ تم رامو کو یہاں سے ان کے پاس کارخانے کے پوربی حصے میں لے جاؤ۔

وہاں سے نکل کر ہم کارخانے کے پوربی حصے میں گئے جہاں باپو کئی لوگوں کے جھرمٹ میں ایک میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے انہوں نے شراب کا نسخہ ایک فارم پر تیار کر لیا تھا اور تمام لوگ اس شراب کو مارکیٹ کرنے کے طریقے پر غور کر رہے تھے۔ اپنے تعارف کے بعد سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہوئے میں باپو کے قریب بیٹھ گیا۔ نیتو اپنی ممی کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھی۔ نیتو کی ایماء پر سب نے اس شراب کا مارکیٹ نعرہ۔ رانی۔۔۔ فخرِ ہند۔۔۔ تجویز کیا۔ حکومتِ ہند سے میرے نام کے حقوق حاصل کرنے کے لیے نسخے کے فارم پر میرے دستخط کرائے گئے۔ اگلے دو دنوں میں پانچ سو گھڑوں میں شراب کی پہلی کھیپ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ نسخے کے مطابق پانچ سو گھڑوں کا خام مال منگوانے کی ذمہ داری پرتھوی راج کو سونپی گئی۔ اس کے علاوہ باپو نے یہ سب کچھ اپنی نگرانی میں کروانے کی حامی بھری۔ میں نے باپو کا ہاتھ بٹانے کی خواہش ظاہر کی جو سب نے بخوشی منظور کی۔ میں نے محسوس کیا کہ نیتو اپنی ماں کی طرح اپنے باپ کی کاروباری گفتگو میں نہ صرف حصہ لے رہی تھی بلکہ کسی حد تک ذہنی اور جسمانی طور پر بھی شامل تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کو اتنے بڑے کاروباری ذہن والے لوگوں کے درمیان بوریت سے بیٹھے نہیں دیکھا۔ دن ڈھلے ہم دوسرے روز کے لیے سب تیاریاں کر کے گھر لوٹے۔ میں نے باپو کو پنچھی والا واقعہ اپنے گھر واپس جا کر بتانے کا فیصلہ کیا۔

لانی گھر آ کر کھانا تیار کروانے میں مشغول ہو گئیں۔ ایسے میں وکرم بھی آ گئے۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس گھر کا ہر فرد نہ صرف اپنا اپنا کردار جانتا ہے بلکہ بغیر کہے اپنا کام بھی انجام دیتا ہے۔ کھانے کی میز پر وکرم نے لانی کو اور لانی نے وکرم کو اپنی اپنی مصروفیات کی کارگزاری سنائی۔ پھر نیتو نے انہیں فوٹو کھنچوانے کی تفصیل بتائی اس نے پنچھی کا واقعہ شاید میری ہدایت پر اس میں شامل نہ کیا۔ اگلے دو روز لانی کی سرکردگی میں نیتو اور میں نے باپو کے ساتھ پندرہ مزدوروں کی مدد سے پانچ سو گھڑوں میں باپو کے نسخے کے مطابق تمام اجزاء ترکیبی ڈال کر گھڑوں کا منہ بند کر کے نیم کھلی جگہ رکھ دیا۔ لانی نے حساب لگاتے ہوئے ہمیں بتایا کہ ایک گھڑے میں شراب بنانے کی ہماری لاگت تین چار روپے کے درمیان آئی ہے۔ اگر ایک گھڑے سے کم از کم ایک گیلن شراب بھی کشید کی جائے تو ہمیں ایک روپے لاگت پر سو روپیہ منافع ہوگا۔ پچھلے تین دنوں سے باپو کے ساتھ کام کرنے کے دوران لانی، باپو سے کچھ اس قدر متاثر ہو کر ان کے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس نے باپو کو شان جی کی بجائے باپو کہنا شروع کر دیا تھا۔ جو باپو کو اچھا لگتا تھا۔ لانی کی دیکھا دیکھی وکرم

اور نیتو نے بھی انہیں باپو کہنا شروع کر دیا۔ باپو بھی لانی کو ہمیشہ بیٹیا کہنے لگے تھے۔

تیسرے روز اپنے کام سے فرصت کے بعد باپو نے واپسی کی اجازت چاہی تو لانی نے باپو سے کہا آپ کی موجودگی میں مجھے ایک عجیب قسم کا نروان محسوس ہوتا ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے اپنے بابا میرے پاس ہوں۔ اس لیے آپ کچھ اور روز رُک جائیں۔ باپو بولے تم بالکل اپنی بیٹیا جیسی ہو۔ لانی نے کہا اگر ایسا ہے تو آپ ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس کلکتہ کیوں نہیں رہ جاتے؟ وہاں پر کون آپ کا منتظر ہے؟ یہاں آپ کی بیٹیا ہر وقت آپ کے پاس ہوگی۔ جب وکرم کاروباری سفر پر جاتے ہیں تو میں گھر میں بالکل تنہا ہوتی ہوں، اگر ہم دونوں کاروباری سفر پر جائیں تو گھر بالکل سونا ہوتا ہے۔ آپ کی موجودگی سے کم از کم میری تنہائی اور تمام گھر کی تنہائی دور ہو جائے گی۔ باپو نے جواب دیا، تم فکر نہ کرو، اب میں اپنی بیٹیا کے پاس کثرت سے آیا کروں گا۔ لانی بولی، اچھا تو اب جب بھی وکرم باہر جائیں گے یا میں خود کو تنہا محسوس کروں گی تو ڈرائیور بھیج کر آپ کو بلواؤں گی۔ باپو بولے ٹھیک ہے میرا وعدہ ہے کہ تم جب بھی ڈرائیور بھجواؤ گی میں آ جاؤں گا۔ لانی نے کہا، آپ چند دن اور رک جائیں آخر جانے کی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ رامو کا کالج تو ابھی دو ہفتے بعد کھلے گا۔ باپو بولے، دراصل اس بار میرا آنا جلدی میں ہوا تھا اس لیے ذہنی تیاری کر کے نہیں آیا تھا۔ اگلی بار تیار ہو کر آؤں گا اور اتنے تک تمہارے ہاں رہوں گا جب تک تم مجھ سے تنگ نہ آ جاؤ گی۔ لانی بولی آپ کیسی باتیں کرتے ہیں باپو، آپ کی بیٹیا آپ سے کبھی تنگ نہیں آئے گی۔ آخر کار ہمیں دوسرے روز جانے کی اجازت مل گئی۔

اگلی صبح ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں باپو بہت خوش تھے۔ انہوں نے مجھے کہا رامو بیٹے تمہارے سوا میں نے کبھی کسی کے لیے اتنی اپنائیت محسوس نہیں کی تھی جتنی وکرم بابو اور ان کے پریوار کے لیے کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پچھلے جنم میں لانی میری ہی بیٹیا تھی۔ اور وکرم بابو تو میرے آگے پیچھے کچھ یوں پھرتے ہیں جیسے میں اس کے کاروبار کا سارا بوجھ سنبھالے ہوئے ہوں۔ اور ہاں نیتو بیٹیا تمہیں اتنا چاہتی ہے کہ وہ تمہارے لیے اپنی جان بھی وارنے سے نہیں کترائے گی۔ باپو تمام راستے نیتو کے پریوار کے گن گاتے رہے۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ کم از کم باپو کو میرے علاوہ کچھ اور پیار کرنے والے لوگ مل گئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے اس بھری دنیا میں ان کا میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ گھر پہنچے تو میں نے کالی کو دروازے پر ٹہلتے ہوئے پایا۔ ہماری آہٹ سن ہماری جانب دوڑی اور بے ساختہ ہمارے پاؤں سے لپٹ گئی۔

کالی کو اکیلا دیکھ کر مجھے چترے کے بارے میں تشویش ہوئی۔ میں نے کالی کو اٹھا کر چترے کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر ایک جانب بڑھی میں نے اس کے پیچھے جا کر دیکھا تو ایک پگڈنڈی کے قریب چترے کے باقیات پڑے تھے۔ لگتا تھا وہ کسی جنگلی جانور کی خوراک بن گیا ہے۔ کسی کے مرنے کے بعد ان کے محبت کرنے والوں کو تسلی ہی تو دی جاتی ہے۔ چترے کے ایسے جانے کا مجھے اور باپو کو افسوس ہوا۔ ہم نے کالی کو تسلی دی۔ کچھ دیر سکون کا سانس لینے کے بعد میں نے باپو کو ناگ پنچمی والا واقعہ بتایا تو وہ کہنے لگے تم نے یہ سب کچھ اور کس کس کو بتایا ہے؟ میں نے جواب دیا کسی کو نہیں۔ بلکہ میں نے نیتو کو بھی یہ بات پھیلانے سے منع کر دیا تھا۔ باپو بولے تم نے اچھا ہی کیا ہے۔ پھر لاپروائی سے بولے اور تم بھی اس واقعے کو بالکل بھول جاؤ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ باپو کی ایک بات مجھے بڑی پسند تھی کہ وہ میرے دماغ کے کسی گوشے میں غرور کا غبارہ محسوس کرنے کے بعد اس کے پھولنے سے پہلے اس میں لاپروائی کی سوئی چبھو کر اس کی ہوا خارج کر دیتے تھے۔ اس لیے میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں پنچمی والے واقعے پر اگر غرور کی تھوڑی سی باس تھی بھی تو وہ باپو کے اس رویے سے سمندر کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

اگلے چند روز میں نے کالی کا غم غلط کرنے اور باپو کے ساتھ کاٹے۔

کالج کھلنے سے ایک دن پہلے سہ پہر کے وقت مجھے جیپ نے لینے آنا تھا۔ دوپہر کے وقت میں جھونپڑی کے اندر لیٹا تھا اور باپو باہر بیٹھے تھے کہ اچانک باہر سے نیتو کی آواز سنائی دی۔ وہ باپو سے مخاطب تھی۔ میں تجسس کے عالم میں باہر نکلا تو نیتو کو باپو سے مخاطب پایا۔ نیتو کے ساتھ مونا بھی تھی۔ نیتو باپو سے کہہ رہی تھی، پاپا کل کاروباری سلسلے میں ایک ماہ کے لیے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ ممی نے مجھے آپ کو بلانے کو بھیجا ہے۔ باپو نے مسکراتے ہوئے نیتو کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے کہا، ابھی ایک ہفتہ پہلے تو میں آیا ہوں بیٹیا۔ نیتو ہاتھ اٹھا کر بولی، مجھے معلوم نہیں باپو، ممی نے مجھے بولا تھا کہ آپ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ گاڑی بھجوائیں گی آپ ان کے پاس جائیں گے۔ تو گاڑی آ گئی ہے اور آپ تیاری کریں۔ ہاں وعدہ تو بجا کیا تھا، باپو نے تسلیم کرتے ہوئے کہا، اور اب زبان دے چکا ہوں تو جاؤں گا۔ نیتو خوش ہو کر بولی، گڈ، تو پھر تیار ہو جائیں۔ اور ہاں ممی کہہ رہی تھیں اس بار ایک ماہ سے اوپر رہنے کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ ٹھیک ہے بیٹیا، ٹھیک ہے۔ میں تیاری کرتا ہوں باپو یہ کہہ کر جھونپڑی میں چلے گئے۔

اور تم بھی تو تیار ہو جاؤ، تم نے کالج نہیں جانا؟ ڈرائیور ہمیں کالج چھوڑ کر باپو کو کلکتہ لے جائے گا، اس نے میری جانب رخ کر کے کہا۔ تم کاہے کو بچاری مونا کو اپنے ساتھ گھسیٹتی پھر رہی ہو؟ میں نے مونا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نیتو سے پوچھا۔ کیا کہا، میں گھسیٹتی پھر رہی ہوں؟ ذرا پوچھو تو اس سے؟ نیتو نے ہنستے ہوئے کہا، اسے میری کسی بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے مونا کی جانب دیکھا۔ اس نے میری نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا، نیتو ٹھیک کہتی ہے۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ آپ دونوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں اور آپ کلکتہ میں ان کے ہاں گئے بھی تھے، تو سچ پوچھیں مجھے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا، نیتو نے آپ سے سچ کہا ہے۔ جی ہاں، وہ تو میں نے یہاں آتے ہی محسوس کر لیا تھا۔ میری سہیلی سچی تھی اس نے نیتو کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ایسے میں باپو اپنی گٹھڑی اٹھائے باہر نکلے تو میں نے باپو سے کہا، آپ اپنا سامان کالے بیگ میں ڈال کر لے جائیں۔

جھونپڑی میں آ کر میں نے باپو کی گٹھڑی کھول کر ان کا سامان بیگ

میں رکھا اور بیگ ان کے حوالے کر دیا۔ پھر میں نے نیتو سے کہا، کالج کی گاڑی مجھے ایک دو گھنٹے میں لینے آئے گی میں نہیں چاہتا کہ وہ آئے اور میں اسے یہاں پر نہ ملوں۔ نیتو بولی، ابھی وقت ہے ہم وہاں جا کر اسے روک لیں گے۔ میں نے ضد کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے حامی بھر لی۔ چند منٹ میں تیار ہو کر ہم چاروں گاڑی میں بیٹھ کر کالج کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں مونا نے مجھ سے سارہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتایا، جی ہاں آپ کی ہونے والی بھابھی سارہ میری منہ بولی باجی ہیں۔ آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟ مونا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، اس کے پیچھے ایک مار دھاڑ سے بھر پور کہانی ہے جو آپ اپنی ہونے والی بھابھی سے سنیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

کالج پہنچ کر ہم گاڑی سے اتر کر ایک دوسرے سے پھر ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کو چل دیئے اور باپو ڈرائیور کے ہمراہ گاڑی پر کلکتہ کو سدھارے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں کالج کے ڈرائیور کو اپنی آمد کے بارے میں بتانا نہیں بھولا۔ آج پہلی بار مجھے باپو کے بارے میں اطمینان تھا کہ وہ کم از کم اکیلے نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد لانی کے کہنے پر باپو مجھ سے ہاسٹل کے فون پر ہر ہفتے بات کیا کرتے تھے۔ وہ کلکتے میں خوش تھے۔ میں نے انہیں وہاں مستقل قیام کے لیے کہا تو باپو بولے، بنوں بی بی کے ڈیرے میں بڑے بابا سے بات کر کے اپنی جھونپڑی میں نئے شان کا تقرر کروانے کے بعد میں اس بارے میں سوچوں گا۔ اس روز مجھے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ سندر بن میں سب سے بڑے شان کو بڑے بابا کے لقب سے جانا جاتا ہے اور دنیا کے سارے شان ان کے مرید اور تابع ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں شانوں کا تقرر بھی وہی کرتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے اولیاء کرام اپنے مریدوں میں علاقے بانٹ کر انہیں بھجواتے ہیں۔ نئے بڑے بابا کا تقرر مرنے والا بڑے بابا بسترِ مرگ پر کر کے جاتے ہیں۔ سندر بن میں بڑے بابا خود بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ لوگ دُور دُور سے ان کی زیارت کرنے آتے ہیں۔ بڑے بابا کو سانپوں کا جیتا جاگتا دیوتا سمجھا جاتا ہے اور وہ بنوں بی بی کے ڈیرے پر رہتے ہیں جہاں ان کے آس پاس دنیا بھر کے سانپ کسی پالتو جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔ باپو کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ کم از کم وہ اپنی جھونپڑی کو مستقل طور پر خیر باد کہنے کو تیار ہونے کے علاوہ اپنی نئی زندگی سے خوش تھے۔

ہماری بارہویں کی کلاسیں شروع ہو گئیں۔ کالج میں گزرا ہوا ہر دن کسی بھی گزرے ہوئے دن جیسا ہی ہوتا ہے۔ یعنی کتابیں ہوتی ہیں، پڑھائی ہوتی ہے، ٹیسٹ ہوتے ہیں، امتحانات ہوتے ہیں اور اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو کھیل ہوتے ہیں۔ بارہویں کا سال میرے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے میرے روزانہ کا معمول ایک بار پھر کمرہ، لائبریری اور امر کے ساتھ چائے پینے تک محدود ہو گیا۔ اس دوران میں نیتو سے کبھی ہفتہ میں ایک یا دو بار آدھے گھنٹے کے لیے جھیل کے کنارے ملنے چلا جاتا اور کبھی کبھار وہ کچھ دیر کے لیے میرے پاس لائبریری میں آ جاتی۔ ہماری ملاقاتیں ہفتے میں دو تین دن اور ایک آدھ گھنٹے کی ایک ملاقات ہوتی تھی۔ ہمارے درمیان باتیں بھی کالج، کتابوں اور روزمرہ کی گپ شپ کی حد تک ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود کہ ہمیں ایک دوسرے کی رفاقت اچھی لگتی تھی، ہم نے ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو کر ہیر ارانجھا بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے نیتو کی یہی بات پسند تھی کہ اس نے میرے ساتھ چمٹے رہنے کی بجائے ہمیشہ اپنی تعلیم کو فوقیت دی تھی۔ وہ ہمارے کالج کی مانی ہوئی مقررہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذہین طالبہ بھی تھی۔ ایک سال ایسے ہی گزر گیا۔

ارون ہماری سیاحت کا پروگرام بھی بناتا رہا۔ آخر کار یہ پروگرام بارہویں کے سالانہ امتحان دینے کے بعد تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ امتحانات کے بعد ہم ایک دوسرے سے معلوم نہیں پھر کب مل پائیں گے۔ امتحان سے چند ماہ پہلے ہی ارون نے ہماری سیاحت کے تمام پروگرام بڑے جوش و خروش سے ترتیب دینے شروع کر دیئے تھے۔ وہ ہر روز ہمیں اپنے پروگرام کے بارے یاد دہانی کراتا تھا کہ امر نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا امر اسے چھیڑتے ہوئے بتاتا اس پروگرام کے مطابق ہم تینوں دوست سب سے پہلے ارون کے ہاں بمبئی جائیں گے۔ وہاں سے ایک ہفتے کے لیے کشمیر جائیں گے اور کشمیر سے ایک ہفتے کے لیے شملہ جائیں گے جہاں پر ہمارا قیام امر کے ہاں ہوگا۔ امر کو اس کے گھر چھوڑ کر ہم لوگ واپس بمبئی جائیں گے، جہاں سے راموا پنے گھر واپس جائے گا، ہے ناں۔ اور جواب میں ارون صرف ہنس دیتا۔ ارون ہر روز مجھے کہتا تھا کہ اگر بھگوان نے چاہا تو اس بار تم میرے ساتھ ضرور چلو گے۔

پاپا ہیرالہ کانونٹ کالج بارہویں تک تھا اس لیے سالانہ امتحان کے بعد ہم نے کالج واپس نہیں آنا تھا۔ آج کل باپو کا زیادہ وقت کلکتہ میں اپنی بیٹیا کے ہاں گزرتا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ بارہویں کے نتیجے کے بعد میرے جیون کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ مجھے ہاسٹل میں اپنا کمرہ بھی خالی کر کے جانا تھا اس لیے میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں بھی کالج سے اپنا کل اثاثہ نیتو کے ذریعے باپو کے پاس کلکتہ بھجوا دوں۔ اور میرا کل اثاثہ بھی کیا تھا چند کپڑے اور کتابیں ۔ میں نے اب تک اپنا جیون بڑے سادہ انداز میں گزارا تھا اور اپنے لیے کوئی اثاثہ جمع نہیں کیا تھا۔ کالج میں بنک کا اکاؤنٹ بند کروانے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ میرے اکاؤنٹ میں پچھلے دو سال سے تیس ہزار روپے پڑے تھے۔ ٹام میرے اکاؤنٹ میں مسلسل رقم جمع کرواتے رہتے تھے جبکہ میرے اخراجات محدود تھے۔ میں وہ رقم بنک سے نکلوا کر رچرڈ کے حوالے کرنے گیا تو اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا، یہ رقم ٹام نے تمہیں دی تھی اور یہ اب تمہاری ہے۔ اپنے پاس سفر کے لیے کچھ رقم رکھی اور باقی نیتو کے حوالے کرنے کے بعد میں نے کالج سے اپنا کمرہ خالی کر کے اپنا سامان بھی نیتو کے ہاتھ بھجواتے ہوئے اسے اپنی سیاحت کے سارے پروگرام کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ سیر کرنے کے بعد سیدھا کلکتہ آؤں گا۔

بارہویں کے سالانہ امتحان کے بعد ہم تینوں دوست واقعی سب سے پہلے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ مجھے اپنی خوشی سے زیادہ اپنے دوستوں کی خوشی

عزیز تھی۔ارون ہم سب سے زیادہ خوش تھا۔اس کی خوشی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے انکل انیل کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ اکلوتا بچہ ہونے اور ماں نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں نوکروں کے علاوہ اس کے ساتھ کوئی اور بات کرنے والا تک نہیں ہوتا تھا۔انکل انیل نے ہم تینوں کے لیے سفر کے تمام انتظامات کچھ اس انداز میں کیے تھے کہ ہمیں اپنے تمام سفر کے دوران کسی کوتاہی یا کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ پہلے تین دن ہمارا قیام بمبئی میں ارون کی کوٹھی پر رہا۔ انکل سے ہماری ملاقات حسبِ توقع کم ہوتی تھی اس کے باوجود ہمارے آنے جانے اور کھل کر کھیلنے کی اجازت تھی۔ ہمارا کھل کر کھیلنا اِدھر اُدھر بے مقصد گھومنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ صبح دیر سے اٹھنا اور راتوں کو دیر تک جاگ کر ایک دوسرے کو چھیڑتے رہنے کا نام کھل کر کھیلنا تھا۔

یہ سفر میری زندگی کا عجیب اور خوشگوار تجربہ تھا اور تعلیم سے فراغت نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ میں نے اس دوران اپنے اندر کے سپیرے کو سلا دیا تھا۔انیس سالہ جیون میں پہلی بار میرے آس پاس سانپ نہیں تھے۔اس بار کالی بھی میرے ساتھ نہیں آئی تھی۔میرے سوٹ کیس میں منکے، رات کی رانی کی پھول پتی اور بین رکھی تھیں لیکن میں نے ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔بمبئی سے ہم لوگ کشمیر گئے جہاں ہمارا قیام گلمرگ اور سرینگر کے ہوٹل لداخ اور گرینڈ پیلس کے وی آئی پی سوئیٹ میں تھا۔اپنے سفر کے تجربات کسی دوسرے موقع پر آپ کی نظر کروں گا۔ یہاں بس اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ کشمیر کی وادی خوبصورت ہے اور لوگ زیادہ تر غریب لیکن خوب سیرت ہیں۔وہاں سے ہم امر کے گھر شملہ پہنچے۔شملہ اپنے اندر فطرت کے کئی حسین مناظر کا مجموعہ ہے۔امر کی والدہ سے میں پہلے مل چکا تھا۔ یہاں امر کے باقی اہلِ خانہ سے ملاقات ہوئی۔ان لوگوں نے ہمیں شملہ سے کفری تک کے علاقوں میں گھمانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔امر کی ماں بار بار ہمارا ایسے شکریہ ادا کر رہی تھیں جیسے وہ نہیں ہم ان کے میزبان ہوں۔ان دو ہفتوں کے دوران گویا وقت کو پر لگ گئے تھے۔امر کو شملہ چھوڑنے کے بعد ہم دونوں واپس بمبئی سدھارے۔ارون بھی خاصا خوش اور مطمئن تھا کہ اسے دوستوں کے ساتھ وقت سرف کرنے کا موقع ملا تھا۔شملہ سے بمبئی تک سارے راستے ارون مجھے اپنے ہاں چند دن اور رکنے کو کہتا رہا۔ میں نے بھی کلکتہ میں کچھ نہیں کرنا تھا اس لیے میں اس کے پاس چند دن اور ٹھہرنے پر راضی ہو گیا اور اسے کہا، تمہارے گھر سے کلکتہ فون کر کے اپنے دیر سے آنے کی اطلاع کر دوں گا پھر نتیجہ آنے تک کے باقی دن تمہارے پاس رہوں گا۔

بمبئی میں ارون کی کوٹھی پر ہم تقریباً سہ پہر کے وقت پہنچے۔ میں اور ارون کچھ دیر سفر کی تھکان دور کرنے کے لیے ایک کمرے میں سفر کے کپڑوں میں ہی ستانے کے لیے لیٹ گئے۔ مجھے ابھی لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انکل انیل میرے کمرے میں آئے۔ مجھے سوتا جان کر وہ واپسی کے لیے مڑے ہی تھے کہ میں نے اٹھ کر انہیں آواز دی۔میری جانب گھوم کر انہوں نے کہا، اگر تم سفر سے زیادہ تھکے ہوئے نہیں ہو تو باہر لان میں آ جاؤ۔وہاں کچھ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔چلیں میں کہتا ہوا ان کے پیچھے ہو لیا۔کوٹھی کے لان میں کرسیاں بچھی تھیں۔جہاں پر تقریباً ستر سالہ پتلی کاٹھ کے سفید کرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ان کے برابر کی کرسی پر کالے سوٹ اور نیلی ٹائی میں ملبوس ایک پکی عمر کے مرد بیٹھے تھے۔انکل انیل نے سوٹ والے صاحب کا تعارف کرواتے ہوئے مجھ سے کہا یہ میرے دوست اجیت ورما ہیں۔ میں نے مسٹر ورما کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔اور یہ مسٹر ورما کے ماموں مہاراج پرکاش ہیں،انہوں نے بزرگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے مہاراج کے سامنے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔اور یہ ہیں مسٹر رامو شان،انہوں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مجھے حیرت ہوئی جب دونوں نے کھڑے ہو کر باری باری مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ہندوستان میں دو اجنبی ایک دوسرے سے پہلی بار متعارف ہوتے ہوئے صرف ہاتھ جوڑ کر ایک دوسرے کو دُور سے نمستے کہتے ہیں۔ ہاتھ صرف دوستوں،عزیزوں اور جانکاروں سے ملائے جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی مہاراج نے اپنے بھانجے کی جانب دیکھ کر اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا، بالکل وہی ہے۔میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انکل انیل کی جانب دیکھا۔

انکل انیل نے شاید میری نگاہوں کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔اس لیے انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، مہاراج کان پور سے خصوصی طور پر تم سے ملنے کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں۔اجیت کو میں نے ارون والا واقعہ بتایا تو انہوں نے یہ واقعہ مہاراج کو بتایا تھا۔مہاراج پرکاش نے مہاراج امرناتھ سے ان کی حویلی والا واقعہ بھی سنا ہے۔اور پھر نواب ادریس نے کلکتہ سے واپسی پر انہیں اپنی جاگیر والا واقعہ بھی مجھے بتایا تھا۔ان تمام واقعات میں تمہارا ذکر ایک خصوصی اہمیت کا حامل تھا اس لیے مہاراج پرکاش تم سے کافی دنوں سے ملنا چاہتے تھے لیکن کوئی موقع نہیں بن رہا تھا۔ جب ارون نے مجھے تمہارے پروگرام کی اطلاع دی تو میں نے اجیت کو دو ہفتے قبل تمہارے بمبئی آنے کی اطلاع دی تھی۔تم لوگوں کی کشمیر اور شملہ کی سیر کے دوران اجیت نے مہاراج کو اپنے پاس بلوایا تھا۔کل میں نے انہیں بتایا تھا کہ تم شملہ سے واپس آنے والے ہو تو انہوں نے مجھے تم سے ملوانے کو کہا۔

مسٹر ورما نے بات شروع کرتے ہوئے کہا ہماری ننھیال پچھلے اٹھارہ برس سے ایک عجیب مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ مصیبت کسی نہ کسی سانپوں سے جڑی ہے۔اگر میں یہ کہوں کہ تقریباً پچھلے اٹھارہ سال سے سارے کا سارا پرکاش بھون اَن دیکھے سانپوں کی گرفت میں ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔میرا خیال ہے ماموں جان اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے زیادہ تفصیل سے بتا سکیں گے۔ورما کے خاموش ہونے پر مہاراج پرکاش نے اپنی بات شروع کی،ان کی آواز کمزور تھی اور ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی کوئیں سے بول رہے ہوں۔انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، یہ آج سے سترہ سال سے اوپر کی بات ہے جب ایک صبح میرا صحتمند بیٹا کیلاش نیند سے جاگا تو اسے ہر سو سانپ ہی سانپ نظر آنے لگے تھے۔اس روز سے پہلے اسے کسی قسم کی کوئی بھی بیماری نہیں تھی۔جسمانی مرض کو چھوڑیں کسی نفسیاتی الجھن میں بھی مبتلا نہیں ہوا تھا۔اس سے اگلے دو سال میرے کیلاش پر کتنے بھاری تھے

اس کا اندازہ یوں کریں کہ وہ اچانک بیٹھے بیٹھے سانپ سانپ چیخنا شروع کر دیتا اور زور زور سے اپنے کپڑے ایسے جھاڑتا جیسے اس کے جسم پر سانپ رینگ رہے ہوں یا جیسے اس کے کپڑوں میں سانپ گھس گئے ہوں۔

اس کا دن تو جیسے تیسے گزر جاتا اس کی رات گزرنا مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا اس کو بھون میں انسانوں سے زیادہ سانپ پھنکارتے ہوئے اپنی جانب بڑھتے نظر آتے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسے انسان نظر آنا بند ہو گئے۔ صرف اور صرف سانپ ہی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی جانب کسی بڑھتے ہوئے انسان سے دور بھاگتے ہوئے کہتا، اس سانپ کو مجھ سے دور کرو۔ ہم نے اس کو کئی ماہر نفسیات کو دکھایا۔ اس کا علاج کرنے کے لیے اسے ولایت لے گئے جہاں اسے ولایت کے نفسیاتی ہسپتال میں رکھا لیکن سانپوں کے خیال نے اس کا کہیں پیچھا نہ چھوڑا۔ عمر کے آخری دنوں میں اسے کھانے کی پلیٹوں اور پانی کے گلاسوں میں سانپ دِکھنے لگے۔ مرنے سے ایک ہفتہ بیشتر اسے درختوں سے لٹکتے ہوئے پتے تک سانپ دِکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اسے ہر چلتی ہوئی چیز سانپ کی طرح رینگتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے آتم ہتیا کر لی۔ یہاں پہنچ کر بوڑھے پرکاش کی آواز بالکل جواب دے گئی۔

انکل انیل نے انہیں پانی کا آدھا بھرا ہوا گلاس دیا۔ مہاراج اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں گلاس لے کر کچھ دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے تو مسٹر ورما نے مجھے کہا، ہم معافی چاہتے ہیں کہ ماموں جان اس واقعے کو سنانے کی تاب نہیں رکھتے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مہاراج کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، جب تک کیلاش بھائی زندہ رہے ہم اس مسئلے کو اس کی ذاتی اور نفسیاتی بیماری سمجھتے رہے۔ اس کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ سارے بھون میں ان کے علاوہ سانپ کسی اور کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اگر یہ کیلاش کی کوئی نفسیاتی بیماری ہوتی تو اس کے ساتھ مر کھپ گئی ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بوڑھا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے ہاتھ سے مسٹر ورما کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ایک بار پھر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح مجھ سے مخاطب ہو کر بولا، رامو بابو، کیلاش کے بعد سے اب تک ہمارے بھون میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جنہوں نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ میرا بیٹا کیلاش کسی نفسیاتی مرض کا شکار نہیں تھا بلکہ اسے واقعی سانپ نظر آتے تھے اور یہ کہ ہمارا بھون کسی طور سانپ بھوتوں کا یا سانپ آسیبوں کا مسکن ہے۔

میں آپ کو چند واقعات بتاتا ہوں۔ ایک بار میں اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ سب مہمانوں کے سامنے ایک بڑا سفید سانپ دروازے سے اندر داخل ہو کر ہمارے دیکھتے دیکھتے کمرے کے کونے میں پڑے ہوئے ایک صندوق میں جا گھسا۔ میں نے خادموں کو بلوا کر صندوق کو کمرے سے باہر اٹھوا کر بڑی احتیاط سے کھلوایا تو سانپ وہاں پر موجود نہیں تھا۔ اس واقعے کے میرے علاوہ میرے تمام مہمان گواہ ہیں۔ پھر ایک بار میرے خدام نے ایک سانپ پکڑ کر ایک بیگ میں ڈال کر ایک سپیرے کے حوالے کیا۔ سپیرے نے بیگ کھولا تو اسے خالی پایا۔ اس واقعے کے بھی کم از کم چھ سات لوگ گواہ ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میرے خدام کو بھون کے کئی حصوں میں دن کے وقت سانپ نظر آئے ہیں۔ وہ جوں ہی انہیں مارنے کو دوڑتے ہیں، سانپ کسی بھوت کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم پر سانپ رینگ رہے ہوں۔ مجھے دن کو اپنے کمرے میں سانپ نظر آتے ہیں۔ اور یہ میرا وہم نہیں ہے کہ جس کمرے میں سوتا ہوں وہاں رات بھر مجھے سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں اب تک دس بار سونے کے کمرے تبدیل کر چکا ہوں۔ عمر کے ساتھ میرے سننے کی حس بھی ماند پڑ چکی ہے۔ اس کے باوجود مجھے اپنے کمرے میں رات کے وقت سانپوں کی پھنکاریں صاف سنائی دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا، رامو بابو، کیلاش کے حادثے کے بعد سے اب تک ہمیں سانپوں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی لیکن اس کے باوجود ہمارا جینا صرف اس خیال سے دوبھر ہو گیا ہے کہ ہمارے بھون پر سانپ آسیبوں کا بسیرا ہے۔

میرے خیال میں آپ کے مسئلے کا حل منتریوں کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ لوگ اپنے منتروں سے لوگوں اور عمارتوں کا آسیب دور کرتے ہیں۔ میں ایک معمولی سپیرے کی حیثیت سے آپ کے کسی کام کا نہیں ہوں۔ میں نے صاف الفاظ میں انہیں بتایا۔ مہاراج نے میرے صاف انکار کے باوجود اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، رامو بابو پچھلے سترہ برس میں ہم نے منتریوں، جوگیوں، سپیروں اور شمانوں میں سے کوئی بھی نہیں چھوڑا۔ نہ صرف آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ کئی منتری اور شمان ایک رات سے زیادہ ہمارے بھون میں نہیں ٹک سکے۔ جن راتوں کو یہ لوگ ہمارے بھون میں ہوتے ہیں ان راتوں کو سانپوں کی کارروائیاں کم ہونے کی بجائے زور پکڑ لیتی ہیں۔ آٹھ برس پہلے میں ناگ بھون سے ایک بھکشی کو اپنے بھون لایا تھا۔ وہ پہلی ہی رات سانپ کے آسیبوں سے ایسا ڈرا کہ صبح تڑکے بھون سے نکل بھاگا۔ جاتے جاتے اس نے اتنا کہا کہ اس پریوار کے کسی فرد نے ناگ دیوتا کی پھٹکار مول لی تھی۔ اس کی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں ایک بار پھر ناگ بھون گیا اور وہاں کے مہا بھکشی سے ملا۔ ان کو اپنی بپتا سنانے کے بعد ان سے بنتی کری کہ اگر نادانستگی میں ہمارے پریوار کے کسی فرد نے ناگ دیوتا کی ناراضگی مول لی ہے تو ہم اس کا اتارہ دینے کو تیار ہیں۔ آپ صرف ہمیں بتائیں کہ ہم ناگ دیوتا کے چرنوں میں کیا بھینٹ چڑھائیں کہ ہمارے پچھلے پاپ دُھل جائیں اور دیوتا ہمیں اپنی آشیرباد دیں۔ مہا بھکشی نے مجھے کہا کہ وہ ناگ دیوتا کے لیے ساتا (جس طرح چلّہ چالیس روز کے مراقبے کو کہتے ہیں اسی طرح ساتا ایک ہفتہ کے مراقبے کو کہتے ہیں) کاٹ کر دیوتا سے پوچھیں گے اس لیے انہوں نے مجھے آٹھ روز بعد دوبارہ آنے کو کہا۔

آٹھویں روز مہا بھکشی نے مجھ سے میرے بیٹے کیلاش کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے اسے کیلاش پر گزرنے والے واقعات بتائے تو اس نے

کہا کہ تمہارے بیٹے نے بنوں بی بی کی نگری میں ناگ دیوتا اور مناسہ دیوی کا قہر مول لیا تھا جس کا کرمہ اس نے بھوگا تھا۔ میں نے ان سے بنتی کری کہ وہ مجھے بتائیں کہ کیلاش کے بعد میں اپنے بیٹے کے پاپ کا اتارہ کیسے کرسکتا ہوں؟ انہوں نے مجھے سندر بن میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر بڑے بابا کے پاس جانے کو کہا۔ اس عمر میں سندر بن کا سفر کیا اور بڑے بابا کی سرکار میں گیا۔ بڑے بابا کی جھونپڑی کے باہر سانپوں کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان تک اس وقت تک رسائی ناممکن ہوتی ہے جب تک وہ خود باہر نہ آئیں۔ بڑے بابا ہفتے کے سات دنوں میں صرف شنیوار کے روز جھونپڑی سے باہر نکل کر اپنے چیلوں اور پجاریوں کے پاس آتے تھے۔ تین روز تک انتظار کے بعد بڑے بابا جھونپڑی سے باہر نکلے۔ ان کے جسم پر لباس کی بجائے سانپ رینگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے مقناطیسی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ان کا چہرہ اتنا بارُعب تھا کہ انکی جانب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ جھونپڑی سے نکل کر وہ سیدھا میری جانب آئے اور مجھ سے کچھ پوچھے بنا صرف اتنا کہا گھر جاکر سمے آنے کا انتظار کر پرکاش، سمے کا انتظار کر۔

میں وہاں سے واپس آگیا اور سات برس سے اوپر کی بات ہے اور میں اب تک اس سمے کی آس لگائے اپنا جیون ختم ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ نہ جانے وہ سمے کب آئے گا۔ اور اگر آئے گا بھی تو کیا میرے جیون میں آئے گا؟ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے نحیف جسم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، اب ان ہڈیوں میں یہ سب کچھ سہنے کا گودہ نہیں رہا، رامو بابو، گودہ نہیں رہا۔ اس کے ساتھ ان کی موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لمبی لکیر نکل کر ان کے سفید دامن میں جذب ہوگئی۔ انہوں نے اپنے آنسو پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور ان کی آواز ایک بار پھر ڈوبنے لگی۔ میرے علاوہ انکل انیل کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے۔

کسی کی غمگین بپتا سن کر آنسو بہانا اپنی جگہ ہے۔ اس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ میں ان کے کسی کام کا نہیں ہوں اور یہ کہ میں ان کے دکھ میں چند آنسو بہا کر انہیں تسلی کے چند بول دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی آنکھیں اپنی قمیص کی آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا، مہاراج مجھے آپ کی بپتا سن کر بڑا دکھ ہوا ہے۔ اس کے باوجود میں آپ کے سلسلے میں خود کو بالکل معذور سمجھتا ہوں۔ نہ میں منتری ہوں اور نہ مہا بھکشی اور نہ ہی شمان ہوں۔ جہاں ناگ دیوتا کے چرنوں میں اپنی عمر تیاگنے والے مہا بھکشی، منتری اور شمان آپ کے کسی کام نہ آسکے وہاں میری کیا حیثیت ہے۔ اپنی زندگی کے چند برس چند سانپوں میں گزارنے سے شمان تو کیا میں سپیرا بھی نہیں ہوں۔ اگر آپ نے میرے بارے میں مہاراج امرناتھ، نواب ادریس اور انکل انیل سے کچھ سنا ہے تو یہ ان کی ذاتی بڑائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ بھی ان کے لیے کیا ہے کوئی ایک معمولی سپیرا بھی کرسکتا تھا۔

بوڑھا بولا آپ کی بات بجا ہے، رامو بابو۔ مہاراج امرناتھ نے نواب ادریس نے اور انیل بابو نے مجھے یہ واقعات کافی عرصہ پہلے بتائے تھے۔ اس کے باوجود میرے من میں کبھی یہ نہیں آیا تھا کہ آپ میرے کسی کام آسکتے ہیں۔ اور تو اور میں تو آپ کا نام تک بھول گیا تھا اور مجھے یہ نام کبھی یاد نہ رہتا اگر میں نے ایک سپنا نہ دیکھا ہوتا۔ یہ پنچمی کے دنوں کی بات ہے۔ گروار کے روز دوپہر کا سمے تھا۔ کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی۔ سپنے میں دیکھا کہ میں پنچمی کے میلے میں ہوں۔ جہاں سانپ، شمان، جوگی، پجاری کسی بین کی آواز کا پیچھا کرتے ہوئے ایک سمت کو جارہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ آگے جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لڑکا اپنی آنکھیں موندے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا بین بجا رہا ہے اس کے پاس ایک حسین لڑکی آنکھیں موندے اپنا سر لڑکے کے کندھوں پر رکھے بیٹھی ہے۔ بین کی آواز کے جادو سے سارے کا سارا پنچمی ان کی اور کھچا جارہا ہے۔ پجاری ان پر پھولوں کی پتیاں اور نوٹ نچھاور کررہے ہیں۔ سانپ ان کے چرنوں میں ایسے بیٹھے ہیں جیسے مندر میں پجاری دیوتا کے چرنوں میں بیٹھتے ہیں۔ بڑے بڑے شمان منتری اور سپیرے ان کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔

ایسے میں اس نے یک لخت بین بجانا بند کرکے اپنی آنکھیں کھولیں اور کھڑا ہونا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ لڑکی نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھا تھا اور اس کا بازو لڑکے کی کمر کے گرد گھیرا کئے ہوئے تھا۔ لڑکے نے مجمع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا یہ سب کیسے ہوا نیتو؟ لڑکی کسی زندہ لاش کے انداز میں بولی، رامو جی پہلے یہاں سے نکل چلیں پھر بتاؤنگی۔ دونوں کھڑے ہو کر اپنے راستے میں بیٹھے ہوئے سانپوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک جانب بڑھے تو سانپ ان کے راستے سے ایسے ہٹنے لگے جیسے انہیں کوئی غیر مرئی قوت راستے سے ہٹا رہی ہو۔ وہ سانپوں کی بھیڑ سے نکل کر انسانوں کی بھیڑ تک آئے تو وہاں پر کھڑے ہوئے لوگوں نے ان کے لیے راستہ بناتے ہوئے راستے پر پھول کی پتیاں نچھاور کرنا شروع کردیں۔ کئی ایک نے جھک کر لڑکے کے قدم چھونے کی کوشش بھی کی۔ کچھ نے اپنا سر اس کی راہ میں بچھایا، کسی نے اس کے جسم کے کسی حصے کو چھونے کی کوشش کی لیکن روکنے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔ بین بجانا بند کرنے اور اٹھنے تک ماحول میں جو سکتہ طاری تھا وہ ہولے ہولے ٹوٹنا شروع ہوگیا۔ ایسے میں لڑکے کو احساس ہوا کہ بین ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر اپنا بازو لمبا کرکے بین بلبلاتے ہوئے سپیرے کے حوالے کی۔ سپیرے نے لڑکے کے ہاتھ سے بین لے کر بین کو بے تحاشا چومنا شروع کردیا۔ بھیڑ جیسے جیسے کم ہوتی گئی ان کے قدم تیز سے تیز تر ہوگئے۔

اچانک مجھے بڑے بابا نظر آئے اور انہوں نے میرے سامنے آکر لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا، تمہارا سمے آگیا ہے پرکاش۔ یہ لڑکا تمہارے درد کا دارو ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں کسی انجانی خوشبو میں نہا گیا، سپنا ٹوٹ گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا رامو بابو، سپنے میں آپ نے بالکل یہی کپڑے پہنے تھے۔ میں نے اپنے پہنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو حیرت میں ڈوب گیا، واقعی میں نے آج وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو پنچمی کے روز بین بجاتے ہوئے پہنے تھے۔

محبت زندہ رہتی ہے

(دینا مولوک ۱۸۷۵ء لندن)

ترجمہ: ابوحماد

(یوایس اے)

سردیوں کی رات تھی، انگلینڈ میں سردیوں کا موسم سخت ویرانی لئے ہوتا ہے، شام چار بجے اندھیرا ہوجاتا ہے اور برف میں ملے جلے بارش کے قطرے بند کھڑکیوں سے اس طرح ٹکراتے ہیں جیسے کوئی دستک دے رہا ہو۔ ملک کے مغربی حصے میں اونچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں جن پر گھنے جنگلات ہیں۔ دیہی آبادیوں میں اس موسم کی مناسبت اور ویرانی اور سناٹے کے حوالے سے کئی پراسرار کہانیاں مشہور ہیں۔ ایسے میں چھوٹی چھوٹی بستیوں کے رہنے والے جلد ہی اپنے کاٹج نما گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہیں کھڑکیوں کو بند کر کے ان پر دبیز پردے ڈال دیتے ہیں اور بڑی بڑی موم بتیاں جلا لیتے ہیں موم بتیوں کی لرزتی لو دیواروں پر انجانے سائے اور خاکے کھینچ دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک شام میں بھی اپنی دادی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آتش دان میں آگ کے شعلے رقصاں تھے اور باہر تیز ہوا کے جھکڑ سیٹیاں بجا رہے تھے۔

وہ بہت بوڑھی تھیں، انکا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا، سر کے بال چھدرے ہو گئے تھے اگرچہ انکی بینائی اب بھی قدرے بہتر تھی مگر انکی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ وہ نہایت انہماک سے سوئیٹر بن رہی تھیں، میں نے ان سے کہا دادی آپ نے تو ایک بڑا زمانہ دیکھا ہے آپ کوئی ایسی کہانی سنائیں جو یہ شام کاٹنے میں میرا دل بہلا سکے۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، پھر سوئیٹر اور سلائیوں کو قریبی تپائی پر رکھ کر کہنے لگیں، کیا سناؤں، اس عمر میں انسان کو گذرے زمانے کا خیال آتا ہے اور کچھ ایسے واقعات یاد آتے ہیں، جن کی کوئی عقلی یا سائنسی دلیل یا توجیہ نہیں ہوتی، اتنا وقت گزر گیا ہے کبھی کبھی تو خیال آتا ہے کہ کیا یہ سب خیالوں کے سراب تھے یا ہماری سوچ نے یہ قصے گڑھ لئے ہیں مگر نہیں، کچھ واقعات اس عمر میں بھی ذہن میں اس قدر تازہ اور واضح ہوتے ہیں کہ لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ابھی ہمارے سامنے ہوا ہے۔

مجھے بھی ایسا لگا جیسے ان کے دل میں کوئی ایسی کہانی چھپی ہے جسے سنا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کچھ مچل کر کہا ''تو پھر دادی سنایئے نا۔'' وہ کچھ دیر چپ رہیں جیسے اپنی یادداشت کو تازہ کر رہی ہوں پھر کہنے لگیں۔ میگی، یہ اتنی پرانی بات ہے کہ شاید تم سمجھو کہ میں نے یہ کہانی گڑھ لی ہو مگر مجھے تو اس کہانی کا ایک ایک پل یاد ہے اس لئے کہ میں نوجوان تھی، زندگی کی رنگینیوں اور نوجوانی کے پرمسرت دور سے نئی نئی آگاہ ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں محبت کے سرور میں مدہوش تھی مجھے محبت ہو گئی تھی۔ پہلی پہلی محبت''۔ وہ پھر مسکرائیں اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگیں ''مجھے معلوم ہے کہ شائد تم دل ہی دل میں ہنس رہی ہو کہ یہ بڑھیا بھی کبھی جوان تھی یا اسکو بھی محبت کے نشے نے مدہوش کر رکھا تھا، تو بٹیا ایسا ہوتا ہے۔ سب اسی دور انہی جذبات سے گذرتے ہیں، تو مجھ پر بھی محبت کا نشہ طاری تھا۔'' کیا میرے دادا مسٹر میک آرتھر؟؟''

''نہیں میگی، مسٹر میک آرتھر نہیں۔۔'' میرے لئے یہ بات اس قدر حیران کن تھی کہ کچھ لمحوں کے لئے میری سانس رک گئی۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، نہیں آرتھر نہیں۔ مسٹر ایوریسٹ۔ وہ ایک بہت خوبرو، نہایت مہذب اور اعلیٰ خاندان کا نوجوان تھا۔ پھر کچھ شرمائی سی مسکراہٹ سے کہنے لگیں، اگرچہ اب تمارے لئے یہ یقین کرنے والی بات نہ ہو مگر میں اپنی جوانی میں نہایت حسین تھی اور محفلوں میں میری جانب نگاہیں اٹھ جایا کرتی تھیں۔'' تو دادی کیا آپ کو اسکی روح سے کبھی واسطہ پڑا'' وہ جلدی سے بولیں ''نہیں نہیں وہ تو خدا کے فضل سے اب بھی زندہ ہے اور اب بھی کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کی طرح بہت ادب و عزت سے مجھ سے سلام دعا کر لیتا ہے، مجھے یہ سوچ کر کہ ہماری نانی دادیاں بھی جوانی میں ان تجربات سے گذری ہیں عجیب لذت کا احساس ہوا۔ مگر دادی کی پراسرار کہانی کا کیا ہوا؟ میں نے کہا دادی آپ تو کوئی پراسرار اور بھوتوں کی کہانی سنانے جارہی تھیں۔ انہیں میرے یہ کہنے پر اعتراض ہوا وہ کہنے لگیں نہیں تم اسے بھوتوں کی کہانی نہ کہو کیوں کہ اس سے ایسا لگتا ہے کہ میں کوئی من گھڑت کہانی سانے جارہی ہوں۔۔۔ جب کہ یہ سچ ہے حرف حرف سچ اور میں اسکی گواہ ہوں اس لئے کہ یہ میرے سامنے ہوا ہے اور اسی لئے مجھے یہ ایسے یاد ہے جیسے کل کی بات ہو''

انہوں نے کہنا شروع کیا ''میری عمر اسوقت اٹھارہ سال تھی اور ہم لندن سے بہت دور ایک شہر باتھ میں رہتے تھے۔ ہم لندن گھومنے آئے ہوئے تھے، میرے والد کو کچھ کاروباری کام تھا۔ وہ ہمیشہ میری والدہ کو اپنے ساتھ لیکر جاتے تھے۔ میں نے اپنے والدین میں ایک دوسرے کے لئے جیسی محبت دیکھی ایسی محبت کہیں اور نہ دیکھی۔ اگرچہ میری والدہ اس زمانے میں بہت نحیف تھیں اور اور انکی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ وہ چند قدم چل کر ہانپنے لگتی تھیں، پھر چند دنوں بعد ہی ہمارے یہاں ایک اور بھائی یا بہن کی آمد آمد تھی مگر میرے والد نے کہا کہ لندن کی رونقوں میں انکا دل بہل جائے گا۔ انہیں دنوں ایوریسٹ کو بھی کسی کالج میں داخلے کے لئے لندن جانا تھا اس لئے اس نے میرے والد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ ہم سب یعنی میں، ایوریسٹ، میرے والد اور میری والدہ سب لندن چلیں اور کام کے ساتھ ساتھ لندن کی تقریبات سے لطف اٹھائیں۔ میں نے اس وقت تک لندن دیکھا بھی نہیں تھا، میرے والد کو یہ سب بہت اچھا لگا کیونکہ وہ بغیر میری والدہ کے جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے لندن پہنچ کر ایک فلیٹ ٹیمپل اسٹریٹ میں کرائے پر لے لیا۔ میگی!۔۔ اب تو لندن میں بہت بھیڑ ہو گئی ہے مگر اس زمانے میں صرف چند بگھیوں اور کچھ ٹھیلوں کے علاوہ زیادہ لوگ نہیں ہوتے تھے۔ ہماری خواب گاہ کی کھڑکی سے دریائے ٹیمز نظر آتا تھا۔ پھر ٹیمپل اسٹریٹ کی اپنی خوبصورتی تھی سڑک کے دونوں جانب اونچے اور سبز پتوں سے ڈھکے درخت تھے۔ چار دن لندن کی گہما گہمی، عجائب خانوں، تھیٹروں، باغیچوں، محلات اور کشتیوں کی سیر میں گذرے، میں تو سمجھو ساتویں آسمان پر تھی، خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی ایک تو لندن کی خوبصورتی اور پھر ایوریسٹ کا ساتھ۔ مگر میری والدہ ان سب سے بری طرح تھک گئی تھیں ان سب تفریحوں کے بعد تو ان سے چلا بھی نہیں جاتا تھا، انکی رنگت پیلی پڑ گئی تھی ا، ان کے

پیروں پر ورم تھا اور تھوڑی سی بات کرنے سے انکا سانس پھول جاتا تھا پھر پیدائش قریب ہونے کی وجہ سے وہ جس کیفیت میں تھیں اس نے بھی ان پر گہرا اثر ڈالا ہوا تھا۔ اگر چہ میرا تو لندن سے ابھی دل نہیں بھرا تھا اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا مگر میری والدہ نے ضد پکڑ لی تھی کہ وہ اب واپس ''باتھ'' جانا چاہتی ہیں۔ ہمارے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ انکی ضد پوری کریں، میں تو انکی ضد سے بجھ کر رہ گئی تھی اس لئے کہ دوسرے دن لندن کے مشہور اور تاریخی تھیٹر میں شیکسپئر کا ڈرامہ ''ہیملٹ'' کھیلا جا رہا تھا، اس تھیٹر میں اس ڈرامے کو دیکھنا تو ایک تاریخی یادگار کے مترادف خاص طور پر جبکہ اس کا مرکزی کردار ''سر جان کیمبل'' ادا کر رہے تھے۔ کچھ ہی لوگوں کو یہ خوش نصیبی میسر آتی تھی۔ میرے والد جو کبھی میری ماں کی بات کو نہیں ٹالتے تھے انہوں نے بھی اماں کو نرم لہجے میں سمجھایا کہ دو ہی دن کی بات ہے، مگر میری اماں کسی بات پر راضی نہ تھیں اور وہ گھر لوٹ جانا چاہتی تھیں۔ ایوریسٹ نے پھر مفاہمت کے طور پر کہا'' قابل احترام مادام۔۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ صرف دو دن کے لئے آپ مس ڈوروتھی اور جناب ولیم کو پیچھے چھوڑ جائیں''۔۔ ''پیچھے چھوڑ جائیں؟؟'' انہوں نے کئی دفعہ زیر لب یہ دہرایا پھر مجھ سے پوچھنے لگیں ڈوروتھی۔ تم کہو تمہارا کیا خیال ہے؟'' میرا کیا خیال ہوتا، میں تو کبھی اپنی ماں سے ایک گھنٹے کے لئے بھی الگ نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ بہت ہی خود غرضی لگی کہ میں انہیں اکیلا جانے دوں اور خود سیر سپاٹا کروں۔۔۔ میرے لب کپکپائے اور یہ کہنے والی تھی کہ ہرگز نہیں اماں۔۔ مگر میری نظر ایوریسٹ کی طرف اٹھی اسکا چہرہ دھواں دھواں تھا، وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا جن میں خاموش التجا تھی۔ میرے لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے اور میں کچھ نہ بول سکی۔ ادھر میری ماں نے مجھے دیکھ کر کہا، بولو ڈوروتھی، کچھ کہو۔۔۔ میرا دل مسوس رہا تھا مگر میں نے خود پر قابو پا کر کہا نہیں اماں نہیں میں آپ کو چھوڑ کر یہاں نہیں رہ سکتی۔ ایوریسٹ کو تو جیسے کسی نے پہاڑ کی چوٹی سے دھکیل دیا ہو، ادھر میں بھی جیسے ٹوٹ گئی تھی چکنا چور ہو گئی تھی، شاید میرے چہرے سے میرے دل کی کیفیت واضح تھی۔ ہر ماں اپنی اولاد کی ان کہی بات، چہرے پر چھا جانے والے جذبات کو سمجھ لیتی ہے۔ شاید وہ میری کیفیت، میرے دکھ کو سمجھ گئی تھیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ ولیم کو بھی دو دن کے لئے چھوڑ دیتی ہوں ویک اینڈ ختم ہونے پر تم دونوں بھی باتھ واپس آ جانا۔ ہم دریا کے کنارے کنارے چلتے واپس اپنے فلیٹ کی طرف آ رہے تھے۔ دریائے ٹیمز میں پانی بہت ہی ہولے ہولے بہہ رہا تھا اور اسکی لہروں پر چاند کا عکس ہلکورے لے رہا تھا، ہوا میں نرمی تھی اور اس میں قریبی درختوں پر لگے پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میری اماں اچانک بول اٹھیں یہ شاید اس مقام پر میری آخری چہل قدمی ہے، ویسے بھی یہاں سے باتھ اسقدر دور ہے اور راستہ نہایت پر خطر ہے تو بار بار آنا مشکل ہے۔ میری والدہ دوسری صبح جانے والے ''کوچ'' سے اکیلی باتھ روانہ ہو گئیں۔ میرے والد نے انکا ہاتھ تھام کر تنبیہ کی کہ اگر کچھ ہو جائے تو انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔۔۔ فوراً چاہے کچھ بھی ہو بیگم، کسی بھی طرح مجھے ضرور اطلاع دی جائے'' گاڑی بان نے اپنا چابک سنبھالا اور گھوڑے کی پیٹھ پر برسایا جس کے ساتھ ہی گھنگھروؤں کی آواز کے ساتھ سیاہ رنگ کا کوچ گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ اپنی منزل کو روانہ ہو گیا۔ میرے دل میں جیسے کوئی شہ ٹوٹ سی گئی، مجھے لگا میں کس قدر خود غرض ہوں، جس طرح میری ماں نے میری بات رکھ لی میں نے انکی بات کیوں نہ رکھی۔۔۔ مگر پھر میں اسے جلد ہی بھول گئی۔

میری اماں تو چلی گئیں مگر میرے والد کی حالت قابل دید تھی ان پر ایک عجب پریشانی طاری تھی، ایک بے چینی، کبھی خود سے بڑبڑاتے تھے کہ کب پہنچے گی، کبھی کہتے کوئی فکر کی بات نہیں واپسی کے کوچ سے اسکا خط آئے گا۔۔ کبھی مجھے کبھی ایوریسٹ کو خطا وار قرار دیتے تھے، کبھی ٹہلتے تھے کبھی بغیر وجہ کھڑکی سے جھانکتے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ میری والدہ کے لئے بے قرار تھے۔ اپنی بیس سالہ ازدواجی زندگی میں وہ ایک دن بھی ان سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ یہی انکی بے چینی کا سبب تھا۔ وہ ہم سے چڑھے ہوئے تھے اس لئے ہم میں بھی ان سے کچھ کہنے کی جرائت نہیں تھی۔

ہم نے تھیٹر میں ڈراما دیکھا۔ اسٹیج کی سجاوٹ، پس منظر موسیقی اور سر جان کیمبل کی اداکاری نے سماں باندھ دیا مگر لگتا تھا کہ میرے والد کہیں اور ہی کھوئے ہوئے تھے۔ تھیٹر کے بعد ہم نے قریبی ریستوران میں ڈنر کیا۔ میں اور ایوریسٹ بہت اچھے موڈ میں تھے اور بات بے بات ہنس رہے تھے مگر میرے والد کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے سائے تھے۔

گھر آ کر میں نے لباس تبدیل کیا، کمرے کی کھڑکی کھول دی، ٹیمز کی لہروں پر آج بھی چاند ہلکورے لے رہا تھا۔ میری خادماں ''پیٹی'' لباس تبدیل کرنے اور میک اپ اتارنے میں میری مدد کر رہی تھی۔ وہ میری ہم عمر تھی اور ہم بار بار لڑکیوں کی طرح چھیڑ چھاڑ اور دبے دبے قہقہے لگا رہے تھے کہ اچانک ہم دونوں کے منہ سے نکلا یہ کیا تھا!!۔۔ ایک آواز تھی جیسے کوئی پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہو۔ ہم نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو دور جاتی ہوئی ایک چمگادڑ نظر آئی شاید وہ ہماری کھڑکی سے ٹکرائی تھی۔ مگر یہاں لندن کے اتنے اچھے علاقے میں چمگادڑ کہاں؟؟ اس پر پیٹی کہنے لگی مس ڈوروتھی ٹکرائی کہاں تھی مجھے تو ایسا لگا تھا کہ وہ دستک دے رہی ہے، یسوع کی قسم وہ دستک تھی بالکل ایسے جیسے انسان کی انگلیاں دستک دیتی ہیں۔

میں نے پیٹی کو ڈانٹ کر کہا کیا واہیات باتیں کرتی ہو۔ دوسری منزل کی اس کھڑکی پر کون دستک دے سکتا ہے مگر پیٹی بولی مسّی مجھے تو ایسا ہی لگا تھا۔ در اصل لگا تو مجھے بھی ایسا ہی تھا جیسے کسی نے بیقراری سے دستک دی ہو بہت آہستہ اور نرمی سے، بالکل ایسے ہی جیسے میری ماں ترکاریوں کی کیاریوں سے واپس گھر کے اندر آتے ہوئے اپنی انگلیوں سے ہلکی سی دستک دیتی تھی۔ مگر میں خود کو سمجھا رہی تھی۔ میں نے پیٹی سے کہا، ارے بھول جاؤ اسے۔ ہم نے کھڑکی بند کر دی، پیٹی میرے بالوں میں برش کرنے لگی مگر میں نے نوٹ کیا کہ اسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر میں نے کہا'' کیا ابو نے بھی یہ آواز سنی ہوگی یعنی کسی چڑیا کے کھڑکی سے ٹکرانے کی آواز؟؟ ابھی میں نے جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ اس دفعہ واضح طور پر کھڑ کی کے شیشے پر کسی نے دستک دی، بلکل کوئی اپنی انگلیوں سے دستک دے رہا ہو، ہم نے کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا، شفاف آسماں، دریا کا نظارہ اور کہیں دھند کا ذرہ بھی نہیں تھا اور کوئی پرندہ یا چمگادڑ نہیں تھی۔ میں حیرانگی کے ساتھ

کچھ خوفزدہ بھی تھی اور ابھی اپنے احساسات کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پائی تھی کہ میرے ابو کے کمرے سے ایک دلخراش چیخ سنائی دی وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے'' ڈولی۔۔ڈولی''۔۔۔یہ میری امی کا نام تھا۔وہ انہیں پکار رہے تھے۔میں دوڑتی ہوئی انکے کمرے کی طرف پہنچی مگر وہ مقفل تھا۔۔وہ نیند میں بڑبڑا رہے تھے اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے مگر یہ واضح تھا کہ وہ بہت دکھی ہیں اور بار بار اپنی بیگم کو یاد کررہے ہیں۔میرے پاس کمرے کی چابی تھی میں اندر داخل ہوئی مگر انہوں نے میرا نوٹس نہیں لیا وہ یہ کہتے رہے ڈولی میری ڈارلنگ، کیسی ہو مجھے جواب دو۔۔میرے والد کو نیند میں بڑبڑانے کی عادت تھی اس لئے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔انہیں میری موجودگی کا احساس کرنے میں دیر لگی پھر کہنے لگے بٹیا اس وقت تم یہاں کیا لینے آئی ہو۔میں کہا ابو آپ ہی نے تو مجھے پکارا تھا، کیا آپ کی طبیعت خراب ہے۔وہ پھر سسک کر کہنے لگے تمہیں نہیں ڈولی کو اپنی ڈولی، پھر سسک کر رونے لگے۔۔ہائے میری پیاری ڈولی، اف میں نے کیوں اسے اکیلے جانے دیا، ایسے وقت میں اسے کیوں اکیلا چھوڑ دیا۔پھر انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور سسکتے ہوئے مجھ سے کہا کوئی بات نہیں تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔

میں پوری رات نہ سوسکی۔مجھے تشویش تھی کہ اس بڑے اور اجنبی شہر میں اگر وہ بیمار ہوگئی تو میں کس سے مدد مانگوں گی۔میں تو اس چڑیا یا چمگادڑ کو بھول بھی گئی تھی مگر پیٹی پر اب بھی خوف طاری تھا وہ کہنے لگی کہ کھڑکی پر دستک اور تمہارے باپ کی یہ حالت، مجھے تو خوف آرہا ہے، یہ کوئی اچھا شگون نہیں۔

جیسے تیسے صبح ہوئی، میں ناشتے کے لئے پہنچی تو میرے والد ٹیبل پر بیٹھے تھے، مکمل طور پر تیار سفر کے لئے تیار۔انکا سامان بھی تیار تھا۔میں نے کہا ابو آپ کہیں باتھ تو نہیں جارہے؟؟

انہوں نے حتمی لہجے میں کہا بالکل میں باتھ جارہا ہوں، میں نے کہا مگر شام سے پہلے تو کوئی کوچ نہیں جاتا، وہ کہنے لگے میں ڈاک لیجانے والے کوچ سے جاؤنگا وہ میری حالت دیکھ کر مجھے اس کی اجازت دے دینگے، میرا دل جیسے ٹوٹنے لگا، میرا اور ایوریسٹ کا رادہ تصویری نمائش دیکھنے کا تھا، ایوریسٹ نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر انہوں کچھ سخت لہجے میں کہا، تم نوجوان لوگ، آج کی نسل کے لوگ نہیں جان سکتے کہ شادی شدہ زندگی کے بیس سال ہر روز ساتھ گزارنے، گرم و سرد ایک ساتھ نبھانے اور دکھ سکھ میں کام آنے کے بعد ایک دوسرے کے لئے کیسے جذبات ہوجاتے اور کس طرح دور رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی تکلیف کی خبر ہو جاتی ہے، میں آج ہی بلکہ ابھی ابھی باتھ جاؤنگا کیونکہ مجھے گمان ہے کہ میری پیاری ڈولی کسی مصیبت یا تکلیف میں ہے۔۔اف میں نے اسے خود سے جدا کیوں کیا تھا۔میں نے کہا''ابو آپ کے ایسے کسی وہم کی کوئی وجہ نہیں کوئی بنیاد نہیں، آپ کیوں ایسا سوچ رہے ہیں۔میرے والد نے تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا''ڈوروتھی، کل رات، بالکل ایسے جیسے میں تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوں، میں نے تمہاری ماں کو دیکھا'' اس پر ایوریسٹ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا'' اوہ میرے خدا۔۔اتنی سی بات۔۔اوہ یقیناً مسٹر ولیم تم نے انہیں دیکھا۔کیونکہ تم خواب دیکھ رہے تھے'' ''نہیں نہیں میں اس وقت سو نہیں رہا تھا۔۔بالکل جاگ رہا تھا جب میں نے اسے دیکھا'' ''اچھا کیسے دیکھا؟'' ایوریسٹ نے پوچھا وہ کہنے لگے'' کمرے میں آتے ہوئے ایسے ہی جیسے وہ ہماری خواب گاہ میں آتی تھی ہاتھ میں ایک بڑی اور جلتی ہوئی موم بتی اور کندھے پر نوزائدہ بچے کو لئے'' ''اچھا۔۔۔!!''

ایوریسٹ نے کچھ طنز سے کہا پھر کہنے لگا''مسٹر ولیم، آپ نے کل ہیملٹ دیکھا تھا اس میں بھی روحوں اور بھوتوں کا ذکر ہے۔۔اسی کا خیال آپ کے ذہن پر رہ گیا، کیونکہ میں بھوتوں، روحوں اور پر سرار و مافوق الفطرت واقعات پر یقین نہیں رکھتا یہ انسانی عقل کے خلاف ہیں بلکہ اس کی توہین کرتے ہیں۔ایوریسٹ نے کئی طرح دلیلیں دے کر کہا میرے ابو اس دور میں انگلینڈ میں رہتے ہوئے توہمات کا شکار ہو رہے ہیں۔ایک بے بنیاد وہم کی بنیاد پر اپنے کنبے کے بارے میں ایسی واہیات باتیں سوچ رہے ہیں میرے ابو کو راضی کرلیا کہ وہ شام تک انتظار کرلیں جب باتھ کے لئے باقاعدہ کوچ کی سواری جائیگی۔میں نے کھڑکی پر کسی چڑیا کے ٹکرانے کا ذکر کیا تو ایوریسٹ نے ہنس کر کہا، لندن کی عمارتیں اونچی ہیں اور عام طور سے چڑیاں ان سے ٹکراتی رہتی ہیں۔اس نے کہا کہ اس کے ایک دوست کے ہوسٹل کی کھڑکی سے بھی ایک چڑیا ٹکرا کر زخمی ہوگئی تھی۔ہم نے دوپہر کو شاہی تصویری گیلری کی سیر کی اور اول شام کو کھانا کھایا۔ہم اس وقت بڑی حد تک نارمل ہو چکے تھے۔

کھانے کے بعد جب میرے ابو سگار سے لطف اندوز ہو رہے تھے

ایک پیغامبر نے دروازہ کھٹ کھٹایا، ایوریسٹ باہر گیا اور واپس آکر میرے والد سے کہا کوچ تیار ہے آپ جلد اس میں بیٹھ کر روانہ ہوجائیں۔۔اس نے یہ بھی کہا کہ آپ کے نام رقعہ آیا ہے خدا نے آپ کو ایک اور بیٹی سے نوازہ ہے۔مگر میری ڈولی۔وہ چپ رہا۔جب ہم گھر پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔میری ماں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکی تھی۔ہمیں بتایا گیا کہ اس نے عین اسی وقت انتقال کیا تھا جب ہماری کھڑکی پر ایک چڑیا ٹکرائی تھی اور کسی نے دستک دی تھی اور میرے ابو نے اسے ایک نوزائدہ بچی کو گود میں لئے اپنے کمرے میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔دادی اماں کے آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔

''غم کے مارے''

معروف مصنفہ Sue Grafton اپنے گھر واقع کیلی فورنیا میں ۷۷ برس کی عمر میں انتقال کر گئیں ۔ وہ ایک عرصے سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں ۔ مرحومہ کی شہرت پُر اسرار اور تجسس سے بھرپور کہانیوں کے سبب چہار دانگ پھیلی ہوئی تھی ۔

○

''ایک ہلا ہوا آدمی''

سشانت سپریہ (غازی آباد، بھارت)
- ترجمہ -
عبدالباری ایم۔کے (ممبئی، بھارت)

سُدھا کر میرا دوست ہے۔جو انتہائی رحم دل ہے۔آج کے ناسازگار ماحول میں بھی وہ انتہائی شریف اور سادہ دل انسان ہے۔جبکہ اس کے حلقۂ احباب میں سب اُسے 'ہلا ہوا' آدمی سمجھتے ہیں۔ایک روز میں ملاقات کی غرض سے اس کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ کچھ لکھنے میں مستغرق تھا۔اُسے اس کیفیت میں دیکھ کر میرا تجسّس بیدار ہوگیا۔پھر میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ اُسے ڈائری لکھنے کا شوق ہے۔دورانِ گفتگو اُس نے ڈائری پڑھنے کے لیے میرے حوالے کردی۔میں نے کہا بھی کہ اُس کی نجی ڈائری پڑھنا میرے لیے غیر مناسب ہے۔مگر وہ نہیں مانا۔کہنے لگا۔

''میں تجھے نہیں تیرے اندر جو میرا مصنف دوست چھپا بیٹھا ہے اُسے پڑھنے کے لیے دے رہا ہوں''۔

حالانکہ ڈائری دینے کے بعد اُس نے یہ بھی کہا۔۔''میری ڈائری پڑھنے کے بعد تُو بھی مجھے ہلا ہوا آدمی سمجھے گا''۔اس پر میں نے مسکرا کر کہا۔''یہ تُو مجھ پر چھوڑ دے''

گھر جا کر میں نے اُس کی ڈائری پڑھی۔اس میں عجیب سی باتیں لکھی تھیں۔ایک بات اور تھی کہ اس میں تاریخوں کا اندراج کہیں نہیں تھا، محض مختلف رنگوں کے قلم کے استعمال سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ڈائری الگ الگ دنوں میں لکھی گئی ہوگی۔

گزشتہ رات میرے یہاں چور آئے۔اُنہیں لگا میں کافی امیر کبیر ہوں۔انہوں نے میرے من کی تلاشی لی اور اُسے خالی پایا۔

''یہ تو انتہائی غریب ہے، اس بیچارے کے پاس تو خواب تک نہیں ہے''۔انہوں نے ایکدوسرے سے کہا اور مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے خالی ہاتھ لوٹ گئے۔سچ ہے مفلس آدمی کے یہاں آئے چور بھی کس قدر بدقسمت ہوتے ہیں۔

سورج اب بھی نکلتا ہے، باوجود اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔دِن کی آنت میں ایک کالا پھوڑا نکل آیا ہے۔سمتوں میں کالی آندھیاں بھری ہیں۔دشتِ انساں کی سڑکوں پر آدم خور گھوم رہے ہیں۔جو مسکرا کر آپ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔آپ اِن کے تبسم میں پوشیدہ خنجروں اور چاقوؤں کو نہیں دیکھ پاتے۔وہ آپ کی پُشت تھپتھپا کر پہلے آپ کو ریڑھ سے محروم کردیتے ہیں۔پھر خود کو اس ادا سے آپ کا ہمدرد اور خاص الخاص ظاہر کرتے ہیں کہ آپ اُن پر مکمل اعتماد کر کے اُن کے قریب آجاتے ہیں۔تب کسی خوشگوار شام میں مئے نوشی کے بعد انسانی خولوں سے باہر نکل کر وہ اپنی اصل ہئیت میں آجاتے ہیں۔یعنی آدم خور بن جاتے ہیں۔پھر آپ کفِ افسوس ملتے ہیں۔

آج صبح سے ہی میری آنکھوں سے خون رِس رہا ہے اور مجھے دُنیا سرخ رنگ میں ملبوس نظر آرہی ہے۔اوپر سُرخ سوجی ہوئی آنکھوں والا آسمان ہے اور نیچے لہو رنگ زمین ہے۔پیڑ پودے، جانور، بچّے، جوان، بوڑھے سب لہولہان دکھائی دے رہے ہیں۔انسانیت کی چِتا دھواں دھار جل رہی ہے۔بطون تک کڑوا کسیلا دھواں بھر گیا ہے۔سڑک پر انسانی شکل میں خونخوار بھیڑیئے گھوم رہے ہیں۔ جن کی شعلہ اُگلتی سرخ آنکھیں دیکھ کر ہی کانپ جاتا ہوں۔تمام سمتوں میں چینخیں اور سائرن کی آوازیں ہیں۔ہنستے کھلکھلاتے سبھی رنگ سرخ رنگ میں تبدیل ہوگئے ہیں۔لگتا ہے گجرات سے فلسطین تک، افغانستان سے عراق اور سیریا تک جو بے قصور انسان روز بہ روز مارے جارہے ہیں اُن سب کا خون میری آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔میری زندگی سے باقی تمام رنگ مُنہ موڑ گئے ہیں۔

آج میں نے دو درختوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔وہ انسانوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ایک درخت دوسرے درخت سے کہہ رہا تھا کہ'' لوگ کس قدر احسان فراموش ہوتے ہیں۔وہ ہمارے سائے تلے آرام فرماتے ہیں، ہمارے ہی پھلوں سے شکم سیر ہوتے ہیں۔تاہم ہمیں ہی کاٹ کر جلاتے ہیں۔''

آج کل میرے ساتھ عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔رات میں کھٹمل اور مچھر کاٹنے سے پہلے میرا مذہب پوچھنے لگے ہیں۔وہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان؟ ہوا میرے آنگن میں بہنے سے پہلے مجھ سے میری ذات پوچھنے لگی ہے۔دھوپ میرے دالان میں اترنے سے پہلے میری نسل پوچھنے لگی ہے، آسمان میں گھری کالی گھٹا میرے آنگن میں برسنے سے پہلے یہ جاننا چاہتی ہے کہ میں کس صوبے کا ہوں اور کون سی زبان بولتا ہوں۔آج کل میں بہت پریشان ہوں۔میں آئینہ دیکھتا ہوں تو میرا عکس مجھے دیکھ کر اپنا منہ موڑ لینا چاہتا ہے۔تاریکی اپنے ظالم ہاتھوں سے میری آنکھیں ڈھانک لیتی ہے۔مردہ ہوا میں تنہا، بنجر آسمان کے نیچے اُس اُڑن طشتری کا انتظار کرتا ہوں جو کبھی نہیں آتی۔

حیرانی کی بات ہے کہ لوگوں کے پاس نگاہیں ہیں پر اصلیت دیکھنے سے معذور ہیں۔ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سمعی قوّت سے عاری ہیں، ان کے پاس دماغ ہیں پر وہ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہیں۔اپنے ہاتھ پیروں کا استعمال وہ صرف مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ کے لیے کر رہے ہیں۔آگے بڑھنے والوں کو لوگ لنگھی مار کر گرا رہے ہیں۔اپنے سے اوپر والوں کو لوگ گھسیٹ گھسیٹ کر نیچے اُتار رہے ہیں۔زندگی کے اس خونخوار کھیل میں کوئی اصول نہیں ہے۔جیتنے کے لیے سبھی ایک دوسرے کو 'فاؤل' کر رہے ہیں۔سبھی ریا کاری کر رہے ہیں، لیکن کہیں کوئی امپائر نہیں ہے، کوئی ریفری نہیں ہے۔جو بے ایمانی اور ریا کاری کو روکنے کے لیے سیٹی بجائے۔جو زیرِ حاشیہ ہیں وہ عنوان بننا چاہ رہے ہیں، خواہ وہ اس قابل ہوں یا نہ ہوں، جو درمیانی صفحات کے عنوانات ہیں۔وہ سرِ فہرست آنا چاہ رہے ہیں۔ یہاں کوئی اپنی داخلی کیفیت سے مطمئن نہیں ہے۔چینخیں سرگوشیوں میں تبدیل ہونا

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

''چہارسُو''

''تیری آمد کے طفیل''

صدائے وقت

(نعرۂ سالِ نو)

یوگیندر بہل تشنہ (نیویارک)

اے سالِ نو
سوسو مبارک،
تیری آمد کے طفیل
جسمِ خاکی کا میری
ایک اور سال گھٹا جاتا ہے
میرے فولا دارادوں کا زنگ آلود ستون
اب بڑھاپے کی زنجیروں میں ڈھلا جاتا ہے
مگر
آشتی ومحبت۔
تج دینے کا نہیں کوئی ارادہ میرا
جذبۂ حبّ وملنساری میرا
زندہ وتابندہ رہے گا دمِ آخر تلک
رسمِ امن ومحبت کی ہو عمر دراز!
مجھکو کرنا ہے ابھی
تبلیغ امن ومحبت
قریہ قریہ، شہر شہر
دور ودراز، ملکوں ملکوں
اور
امن ومحبت کی اُڑانا ہیں فاختائیں
کہ لامتناہی گھٹن میں جی رہا ہے انسان ابھی
افسردہ و مضمحل ہے انسان ابھی!!
بغض ونفرت میں گرفتار ہے انسان ابھی!!
جامِ مئے حیات کی شدّت سے
طلب ہے اسکو
اے ساقی، امن ومحبت
جامِ مئے حیات پلا دے ساقی
کہ
فرسودہ خیالوں سے پا جائے نجات
میرے مولا
امن اور پریم کی سونامی، لہر
بکھر جائے ہر سُو
کراں تا کراں!!!
کوئی کاہن، منشائے حق کی خبر لائے
اور کہے
''اے انسان، تیری سرشت میں لاانتہا محبت ہے''
تاخیر نہ کر
جامِ مئے حیات پلا دے ساقی
میرے مولا آشتی ومحبت کا مینہ برسا
اب کے برس تو ایسا کردے
دوئی کا پردہ ہٹا

○●○

لہوڑ

وشال کھلّر

(لدھیانہ، بھارت)

میں
اس مرحلے سے لوٹا ہوں
جہاں موت
زندگی سے
بے حد
آسان نظر آتی ہے
اب
شکایتوں کے دَور
گو باقی ہیں مگر
شدت
زندگی کی
موت سے
کہیں کم ہے

مظلوموں کی ترجمانی

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

چین سے گھر میں سکونت بھی نہیں کر سکتے
ہم وہ بدبخت کہ ہجرت بھی نہیں کر سکتے

آگ کھا جاتی ہے یا باڑھ نگل جاتی ہے
اپنے بچوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے

چارسو شور شرابے کا عجب عالم ہے
ہم گنہگار عبادت بھی نہیں کر سکتے

ہم بھی اس کے ہیں زمینیں بھی اُسی کی پھر بھی
دعویٔ حقِ وراثت بھی نہیں کر سکتے

سرحدیں ہم کو گوارا ہی کہاں کرتی ہیں
ہم وہ باغی کہ بغاوت بھی نہیں کر سکتے

ہم مہاجر تو ہیں انصار بھی نہیں ہے کوئی
لوٹ جانے کی تو ہمت بھی نہیں کر سکتے

مار دیتے ہیں اہنسا کے پجاری ہم کو
اور ہم ان کی مذمت بھی نہیں کر سکتے

عالمی امن کا انعام چڑیلوں کو ملے!
سوچی سمجھی یہ شرارت بھی نہیں کر سکتے

بادشاہوں کی وزیروں کی دہائی کیا دیں
جو غریبوں کی حمایت بھی نہیں کر سکتے

کیا قیامت ہے کہ شکوہ ہے سبھی کو ہم سے
ہم زمانے کی شکایت بھی نہیں کر سکتے

برما و شام و فلسطین میں جاری جو ہے وہ
آپ برداشت اذیت بھی نہیں کر سکتے

خیؔر مجبور ہو۔ کیا اتنے بھی مجبور ہو تم
شر پسندوں کی مذمت بھی نہیں کر سکتے!

○

مقامِ بندگی

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

وہی لامکاں اول وہی لامکاں آخر
یہ زماں مکاں تو بس ہے فقط امتحان خانہ

میرے لاشعور میں ہے وہ اَلَست کا زمانہ
میں عدم کا ہوں مسافر یہ نہیں میرا ٹھکانہ

اُسی عہد پر رواں ہوں جو کیا تھا سب سے پہلے
جو ہیں ظاہری مناظر ہیں اسی کا شاخسانہ

یہ زماں مکاں کا نقشہ جو نظر میں آ رہا ہے
تشکیل ہے ازل سے، ہے یہ طے شدہ فسانہ

درپیش ہیں جو سب کو یہ مسائل سماوی
اس ارضی امتحان کا گزرے ہے یوں زمانہ

میری روح تو ہے امانت اُسی مالکِ جہاں کی
جب آئے گا بلاوا وہیں ہو گی پھر روانہ

یہی میری آرزو ہے میری روح وہیں پہ پہنچے
جو بہشتِ جاوداں ہے وہ ہو آخری ٹھکانہ

نہ ہمیں کوئی شکایت نہ گلہ کسی سے جگ میں
جو ہو لا مکاں کا راہی تو یاں کیسا دل لگانا

وہ جو پائے یاں شہادت کیا ہے شاں ریاضؔ اُسکی
ہے مقامِ بندگی کا تب و تابِ جاودانہ

○

کاغذ کا ٹکڑا

بشریٰ رحمٰن

(لاہور)

اس سے پہلے کہ ذہن سو جائے،
اس سے پہلے کہ یاد کھو جائے،
اس سے پہلے کہ بھول عادت ہو،
اس سے پہلے کہ نطق لکنت ہو،
اس سے پہلے کہ گم سماعت ہو،
اس سے پہلے کہ ختم راحت ہو!

اس سے پہلے کہ پاؤں تھک جائیں،
اس سے پہلے کہ ہاتھ مڑ جائیں،
اس سے پہلے کہ آنکھ دھندلی ہو،
اس سے پہلے کہ سوچ گدلی ہو،
اس سے پہلے کہ چہرہ گہنائے،
اس سے پہلے کہ شوق بجھ جائے،

اس سے پہلے کہ دل کا ہر رشتہ
رفتہ رفتہ ہی دور ہو جائے
مجھ کو خفّت سے تُو بچا لینا
ٹکڑا کاغذ کا ہوں اٹھا لینا!!

○

''بچپن''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

تتلیاں، پھول اور سجی گڑیاں۔۔۔
تھیں کبھی کائنات بچپن کی۔۔۔
تتلیاں اُڑ گئیں کتابوں سے۔۔۔
اور وہ معصوم سی مہک بھی گئی۔۔۔
ہاں! مگر وہ جو پیاری سی گڑیا۔۔۔
ہو بہو میرے بچپنے جیسی۔۔۔
مشغلے شوق سارے مجھ جیسے۔۔۔
کھیلتے دیکھ کر اُسے لاگے۔۔۔
جیسے بچپن کے خواب ہوں جاگے۔۔۔!

○

نئے سال کی دعا

انجم جاوید

(کراچی)

نئے سال کی پہلی بارش میں رقصاں
ہماری محبت کے نازک سے جذبات
خوشبو کے مانند دوشِ ہوا پر
اُڑے جا رہے ہیں
لبوں پر دُعائیں دیوں کی طرح جگمگاتی ہیں
تو پھول کِھل کر ترے لب کی سرخی
ترے جسم کی دل کشی بنتے جاتے ہیں
اور حرف دل بن کے کہتے ہیں تم سے
سدا خُوش رہو تم، سلامت رہو تم
محبت کی زندہ علامت رہو تم

○

رباعیات

شاہین
(کینیڈا)

بھوکا بھی نہیں اور مرے سر پر چھت ہے
کپڑا تن پر ہے آنکھ میں غیرت ہے
بھولے سے کبھی بے ہنری میں مجھ سے
کچھ کام اگر ہوا تری رحمت ہے

اپنے کو تو کیا جانتے کچھ ہوش نہ تھا
آسان سی اک چیز تھی لیکن دنیا
اب خود کو سمجھنے کی جو توفیق ہوئی
دنیا نظر آنے لگی گورکھ دھندا

شے اپنے ہی قالب سے نکل جاتی ہے
اک آن میں تصویر میں ڈھل جاتی ہے
کرتا ہوں نگاہ جب حقیقت کی طرف
اِس بیچ میں تصویر بدل جاتی ہے

○

''بے خیالی میں تخلیق''

سبیلہ انعام صدیقی (کراچی)

خیالات واحساس!
جو بے ساختہ لکھ دیے ہیں
نہ جانے وہ کب سے دِل وجاں کے اندر چھپے تھے,
کسی راز جیسے
قلمبند ہونے کو بے چین تھے
کئی درد, الجھے سوالات
جو صفحے پہ سجنے کو بیتاب تھے

وہ سب
قلم سے مرے موتیوں کی طرح
اب برسنے لگے ہیں
سبھی رقص کرنے لگے ہیں
مری چشمِ پُرنم
جو سیلاب روکے ہوئے ہے
ستارے چمکتے ہیں میری پلک پر
انھیں میں رقم کر رہی ہوں
جو طوفان ہے موجزن میرے اندر
وہ ارمان, وہ خواب
کئی لاشعوری مضامین بن کر
وَرق در وَرق جگمگانے لگے ہیں
سبھی رقص کرنے لگے ہیں
اور اب
اسی جذب واحساس کے زیرِ سایہ
غزل پھول بن کر مہکتی ہے
کبھی نظم گاتی ہے وہ گیت
کہ جو بے خیالی میں تخلیق ہو کر
بناتی ہے رنگین پیکرَ
یہ بزمِ سخن کو سجانے پہ مائل
خیالات سب رقص کرنے لگے ہیں
قلم سے مرے موتیوں کی طرح
اب برسنے لگے ہیں ــ
سبھی رقص کرنے لگے ہیں

سمندر آج اچھے موڈ میں ہے

حسن منظر
(کراچی)

برسے ہوئے بادل جیسے
ہلکے پھلکے، شانت اور بے غم
ماتھے پر غصے کی
ایک شکن بھی نہیں
نہ سر کو ساحل پر
پٹک رہے ہو۔

مدہم لہروں پر سی گلز[1]
پر پھیلائے، کیا تم سے
چہلیں کر رہی ہیں؟

کٹیلی گھاس جیسی
لمبی چمکیلی مچھلی[2]
تمہاری سلک کی چادر
میں سے ابھری، اور
دور تک، تم سے کچھ کہتی، اُڑتی
پھر تم میں ڈبکی مار گئی۔

کتھئی ڈولفنیں[3] اُدھر
دنیا اور اس کے چنتاؤں
کو بھولی، تم میں
کلیلیں کر رہی ہیں۔

دور اُفق سے کچھ اُرے
پھوارے چھوڑتی
وہیلیں[4]، الٹی کشتی کی طرح
ہوا میں قوسیں بناتی
ابھرنے چھپنے کا کھیل
گھنٹوں سے کھیل رہی ہیں
انہیں کوئی کام نہیں ہے!

کیا یہ سب کچھ اس لیے ہے
کہ دن اچھا ہے
دھوپ اچھی ہے
ہوا زہریلی دھول دھو کر آئی ہے
اور تم میں، ایٹمی شراب کا
پیمانہ آج نہیں الٹایا گیا ہے؟
انسان نے تم میں آج
کوئی نیا تجربہ نہیں کیا ہے؟
نہ ہوا میں جھولنے والے
ناریل کے درختوں کا کوئی ٹاپو
انسان کے ہاتھوں
نابود ہوا ہے؟
نہ چیتھڑے مچھلیوں کے
نہ دھجیاں کچھوؤں کی
تمہاری نیلی، سبز، سفید
کتاں کی چادر پر میلوں تک
لہروں پر ہچکولے لے رہے ہیں۔

شاید آج مہیب کارخانوں کے
میکدوں سے سنکھیا اور
پارے کی کشید
تمہیں پینے کو نہیں دی گئی ہے
اور مارے مروّت کے تم نے
(کہ انسان تمہاری اولاد ہے)
اسے زہر مار کر لیا ہے۔

خوشی تمہاری لہر لہر سے
پھوٹی پڑ رہی ہے
(جیسے کبھی جنت میں ہو گے)
ہر دکھ سے دور، تم تو
سوتے میں مسکرا رہے ہو۔

اور تم پر
بہتی ناؤ میں بیٹھا
روشن انگیٹھی پر کوئی مچھیرا
پکا رہا ہے اپنی شام کی روٹی۔
لہروں کو، ہوا کو اور
اُن میں بسنے والوں کو
اس کی روٹی سے
قطعاً بیر نہیں۔
جانے سکھ کا ایسا دن
پھر کب آئے گا؟
یا کبھی نہیں!

○

۱۔ Seagalls
۲۔ Flying Fish
۳۔ Dolphins
۴۔ Whales

کاروانِ مصطفیٰ ؐ

سفرنامۂ حجاز

آپا جمیلہ شبنم
(اسلام آباد)

نظر شرمندہ شرمندہ قدم لرزیدہ لرزیدہ

٦۔مئی ٢٠٠٦ء کو میری پیاری دوست اور قابلِ احترام استاد محترمہ رشیدہ قمر کے گھر جشنِ عید میلاد النبیﷺ کی تقریبِ سعید تھی۔ پاکیزہ ماحول، رنگ و نور میں ڈوبی محفل میں ہر طرف برکت و رحمت چھائی ہوئی تھی۔ طاہرہ جمیل (بیگم صاحبزادہ جمیل الرحمٰن) کے ایمان افروز خطاب کے بعد رشیدہ قمر نے اپنی پُرسوز آواز میں نعت پیش کی تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی اور میں دھیمے دھیمے لہجے میں اپنے پیارے اللہ سے راز و نیاز کرنے لگی:

''یااللہ میری اس بے مصرف زندگی کی ڈور کب ٹوٹے گی؟ کب ٹوٹے گی؟ کب ٹوٹے گی؟''

دعا کے لیے اُٹھے ہاتھوں میں ایک کم سن سی پیاری لڑکی نے کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیا۔ میں نے پُرنم آنکھوں سے پڑھا، لکھا ''کاروانِ مصطفیٰ ؐ میں شامل ہو کر عمرے کی سعادت حاصل کریں۔'' بوجھل بوجھل قدموں سے گھر واپس آئی۔ تھکان کے باوجود رات بھر نیند نہ آئی۔ نمازِ فجر ادا کر کے گہری نیند سوگئی۔ جب بیدار ہوئی تو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آواز آئی ''موت کا بلاوا نہیں آرہا تو عمرے کی تیاری کرو'' بستر پر خاموش لیٹی رہی اور دل و دماغ میں کشمکش ہوتی رہی۔

بڑھاپے کے علاوہ طرح طرح کے جسمانی عارضے، ڈیڑھ ماہ گردن کے مہروں کا علاج ہوتا رہا۔ کمزور صحت اور سرمایہ کی کمی پیشِ نظر تھی۔ تاہم طاہرہ جمیل سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے کہا ''٦۔ جون ٢٠٠٦ء تک اپنا پاسپورٹ اور مبلغ ٥٠،٠٠٠ روپیہ جمع کرا دیں۔''

حبِ اللہ اور حبِ رسولؐ سے مالا مال دل جھوم اُٹھا۔ ایمانی قوت اور نبیؐ کی محبت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور میں خاموشی سے منزلِ مراد پانے کے لیے رواں دواں ہوگئی۔ عمران اور فرح (بیٹا، بیٹی) سے بھی یہ انوکھا فیصلہ صیغۂ راز میں رکھا۔

سب سے پہلا مرحلہ پاسپورٹ بنوانے کا تھا۔ ٹیکسی لے کر پاسپورٹ آفس گئی تاکہ ضروری معلومات حاصل کرسکوں۔ دفتر والوں نے بتایا کہ دو ہزار فیس اور فارم وغیرہ جمع کرا دیں۔ میرے پاس نقد ایک ہزار روپیہ تھا۔ گھر واپس آئی، مسز اشرف کو وجہ بتائے بغیر ایک ہزار روپیہ لیا۔ دفتر جا کر فارم پُر کر کے تمام کاغذات بمعہ تصاویر وغیرہ جمع کروا دیئے۔ یہ غالباً ٢٧۔ مئی کی تاریخ تھی۔

٥۔ جون کو پاسپورٹ مل گیا۔ آنکھیں خوشی کے آنسو برسانے لگیں اور میرے دل کو ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ملتی رہی۔ ''میرے سوہنیا ربّا تیرے کُن فیکون کا کمال ہے۔'' ثمینہ بٹ کے گھر قرآن خوانی تھی۔ وہاں زبیدہ اصغر سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ شگفتہ شگفتہ سرخ و سفید چہرہ مجھے اچھا لگا۔ سلجھی ہوئی گفتگو میں اپنائیت کی جھلک، بس تعلقات کا آغاز ہوگیا۔ پھر اچانک خبر ملی کہ زبیدہ اصغر بیوہ ہوگئی۔ تعزیت کے لیے گھر گئی، بہت دکھ ہوا۔ اللہ کی رضا پہ راضی رہنا ہمارا ایمان ہے۔

پاسپورٹ لے کے سیدھی زبیدہ کے گھر گئی اور بتایا کہ انتہائی راز داری سے ''عمرہ'' کی تیاری کر رہی ہوں۔ عمران میرے اس پروگرام سے بالکل بے خبر ہے۔ لہٰذا تم مجھے پچاس ہزار روپے ایک ماہ کے لیے دے دو ''پروردگار زبیدہ کو دین و دنیا کی نعمتوں سے نوازتے رہنا اور آسودگی دل نصیب کرنا (آمین)'' ٦۔ جون کو عیدگاہ روڈ طاہرہ جمیل کے گھر گئی وہ بہت محبت اور تپاک سے ملیں۔ ان کے بیٹے سعد الرحمٰن کو پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور مبلغ ٥٠ ہزار روپے ادا کردیئے۔ کہاوت ہے ''جہاں چاہ وہاں راہ''

١١۔ جون کو پیارے بھائی ایمی (امتیاز) اور خاور کے پُرزور اصرار پر سکندر آباد گئی۔ بھائی، بھابی کی قربت میں بہت اچھے دن گزرے۔ چاہت و محبت کے علاوہ توانائی سے بھرپور خوراک ملتی رہی۔ اللہ کرے یہ محبت یہ خلوص تا زندگی قائم رہے۔ پٹہ دار نیک محمد نے ٢١ چک والے مربع کی رقم دے کر دل کو سکون اور خوشی سے مالا مال کردیا۔ خُلد آشیاں والدین پر اللہ کی رحمت سایہ فگن رہے۔

٩۔ جولائی کو اسلام آباد واپس آئی۔ میری عدم موجودگی میں ایک فون آیا تو عمران کو صورتِ حال کا علم ہوا۔ کمزوری صحت اور تنہا سفر پر عمران بے حد فکر مند ہوا لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بس اللہ سے چپکے چپکے دعا کرتی رہتی کہ مجھے اس سعادت سے محروم نہ کرنا۔

ابھی گھر آئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ لاہور سے ثریا کا بلاوہ آگیا۔ ناہید نے بتایا کہ ''ہم دونوں بہنیں امریکہ جارہی ہیں اس لیے آپ ہم سے تعاون کریں'' دل نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگئی۔ طاہرہ جمیل سے فون پر بات ہوئی تو اس نے کہا ٢٠۔ اگست تک آپ کو گھر موجود ہونا چاہیے۔ لاہور دو ہفتے بڑے آرام سے گزرے۔ ثریا کو اس کی پسند کی چیزیں بنا کر کھلاتی رہی۔ میرے دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ کیا پتہ جیت ہوگی یا ہار! عمرہ ہوگا یا نہیں! گناہ گار ہوں، خطا کار ہوں، پر نبیؐ آپ کی فدا کار ہوں۔ آپؐ کی پاکیزہ محبت میری زندگی کا سرمایہ ہے۔

یکم اگست مجھے بخار ہوگیا۔ ثریا بہت خوش اور مطمئن تھی، اس لیے تین چار دن بخار کی کوئی پرواہ نہ کی۔ مگر جب سات دن گزرے تو کمزوری بڑھتی گئی اور بخار قائم رہا تو پھر گھبرا کر ثریا سے اجازت طلب کی اور عمرے کی نوید بھی سنائی۔ کہ میرا جانا اب بہت ضروری ہے۔ دل بہت سہما ہوا تھا کہ خدا جانے یہ بخار کتنا طول پکڑے۔

٧۔ اگست ٢٠٠٦ء لاہور سے فرح کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ تقریباً ٣ بجے فرح کے گھر پہنچی۔ عصر کے بعد بخار تیز ہوجاتا ہے۔ گھر آ کر نڈھال

نڈھال بستر پر لیٹ گئی۔ بنابنایا کھیل بگڑتا نظر آ رہا تھا۔ دل بے حد بے چین اُداس۔ عمران اور نورین ایبٹ آباد سے واپس آئے تو دوسرے دن عمران نے پانچ چھ ٹیسٹ کروائے جس میں ٹائیفائیڈ بخار کے علاوہ ایس ایس آر بھی ٹھیک نہ نکلا۔ دل کو شدید دھچکا لگا۔ مگر اللہ کی رحمت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ دوا اور دُعا جاری رہی۔

۷۔اگست کو بخار ٹوٹ گیا اور میرا انجر پنجر ہلا کر رکھ دیا پھر بھی سجدۂ شکر بجالائی۔ فرح کے گھر اچھی خوراک کے علاوہ سکون و آرام بھی بہت ملا۔ ایک دن چند گھنٹے کے لیے گھر گئی تو دل و دماغ پر عجب سا بوجھ طاری ہو گیا۔ شکر ہے بیماری کے ایام فرح کے پاس گزرے۔ اپنے گھر ہوتی تو بستر پر ہی نزار پڑی رہتی۔ میرے گھر مہمانوں کی ریل پیل رہی مسلسل بیماری مریض کو چڑچڑا کر دیتی ہے۔ خدا نے اس آزمائش سے بچا کے رکھا۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اے اللہ پاک پیارے بیٹے علی کے گھر پر تا قیامت اپنی رحمتوں اور برکتوں کا نزول جاری رکھنا (آمین)۔

صحت یاب ہونے کے بعد دل کو ہر وقت یہ خیال پریشان رکھتا۔ اللہ جانے مجھے یہ سعادت نصیب ہو گی یا نہیں!

خدا خدا کر کے معراج شریف والے دن یہ خبر ملی کہ میرا ویزا لگ گیا ہے۔ میرے اللہ تو کتنا رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اپنی مہمانی کا شرف بخشا ہے۔ یا اللہ یہ وقت پَر لگا کر گزر جائے۔ انتظار کی صبر آزما گھڑیاں جلد ختم ہوں۔

میرے پیارے اللہ میں اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے میں تیسری بار تیرے مقدس گھر کا دیدار کرنے جا رہی ہوں۔ اپنے پیارے آقائے نامدارؐ کے روضۂ اقدس پر حاضری دوں گی۔ اچانک ہی میرے مقدر کا ستارا چمک اُٹھا۔ یہ کتنی دلکش اور نورانی کیفیت ہے۔ گنبدِ خضرأ کے مکین کو درود و سلام کے گلدستے پیش کروں گی۔

صدقِ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ہار آنسوؤں کی لڑیوں میں پرو کر پیش کروں گی۔ میرے بوسیدہ ناتواں جسم و جان میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے سرشار دل بہت بے قرار ہو جاتا ہے۔ اس کی تیز تیز دھڑکن میری سماعتوں سے ٹکراتی رہتی ہے۔ چودہ سال قبل میں حج بیت اللہ اور پھر جلد ہی عمرہ کی سعادت حاصل کر چکی تھی۔

۲۹۔اگست نظر شرمندہ شرمندہ قدم لرزیدہ لرزیدہ

انتظار کی کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں۔ آج پیاری بیٹی فرح علی کے گھر سے نورانی سفر کا آغاز کر رہی ہوں۔ اعزاز وارڈ سے چھٹی لے کر مجھے رخصت کرنے آیا۔ علی، فرخ، عبداللہ اور میں (یعنی جمیلہ شبنم) اعزاز کی ہمراہی میں ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایئرپورٹ تک موسلا دھار بارش برستی رہی۔ میں دعائیں کرتی رہی کہ آغاز سفر میں ہی قبولیتِ دعا کا موقع ملا گیا۔ بارش برستے وقت جو دعا بھی کی جائے اسے درجۂ اجابت ملتا ہے۔ یا اللہ میرے آنسوؤں سے میرے دل کی تمام کثافتیں، کدورتیں اور نفریں دور کر دے۔ میں تیرے پاس پاک صاف اور اُجلا اُجلا دل لے کے حاضر ہوں۔ مجھے تحمل، بردباری، درگزر اور صبرِ جمیل کی دولت عطا کر۔ زندگی میں آسانیاں اور سکون پیدا کر۔

عمران، نورین اور حماد بھی الوداع کرنے آ گئے۔ روانگی میں کافی دیر تھی اس لیے عمران نے ہم سب کو راول ریسٹورنٹ میں بٹھایا۔ سب چائے، چپس اور کولڈ ڈرنک وغیرہ کھاتے پیتے رہے۔ وضو کر کے نمازِ عصر ادا کی۔ عمران نے اپنے ایک واقف کار کے ساتھ اندر بھیج دیا۔ مجھے بورڈنگ اور گروپ لیڈر نہیں ملا تھا۔ دل بے حد پریشان اور سہا ہوا تھا۔ سامان چیک کروا رہی تھی کہ عمران کے دوست طارق راجہ آ گئے۔ جہاز کی روانگی تک وہ میرے ساتھ رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ کوئی فرشتۂ رحمت ہے جو مجھے سہارا دینے آ گیا ہے۔

گروپ نمبر۹ کا گروپ لیڈر غلام دستگیر تھا۔ لیکن تلاش کے باوجود نہ ملا۔ طارق نے میرا پاسپورٹ لیا اور بڑی تگ و دو کے بعد بورڈنگ کارڈ حاصل کر کے مجھے اوپر لاؤنج میں بٹھا دیا اور سپرد خدا کر کے رخصت ہو گیا۔ میں صدقِ دل سے نکلی دعائیں اس پر نچھاور کرتی رہی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

بس میں بیٹھ کر عمران سے بات کی۔ پھر جہاز میں آرام دہ جگہ مل گئی یعنی کھڑکی کے پاس، عمران کا نمبر زبانی یاد تھا اس لیے تسلی آمیز لہجے میں بات کی خواب حقیقت کا روپ دھار گیا اور ساڑھے بارہ بجے جہاز نے اسلام آباد رَن وے (Run Way) کو خیرباد کہا۔ (جاری ہے)

ڈبویا مجھ کو ہونے نے

نمبر شمار	بیرونی کرنسی	پاکستانی کرنسی
۱۔	یورو	۱۳۲ روپے
۲۔	پاؤنڈ	۱۴۸ روپے
۳۔	ڈالر	۱۱۲ روپے
۴۔	انڈین	۱ء۷۵ روپے
۵۔	افغان	۱ء۶۰ روپے
۶۔	ٹکا (بنگلہ دیش)	۱ء۳۵ روپے
۷۔	بھوتانی (بھوٹان)	۱ء۳۳ روپے
۸۔	براتھوپین	۵ء۴ روپے
۹۔	شیکل (اسرائیلی)	۳۲ روپے

واہ جائے خوب است

منیرہ شمیم
(اسلام آباد)

کہتے ہیں شہنشاہ جہانگیر کا گزر جب یہاں سے ہوا تو وہ اس مقام کی خوبصورتی کو دیکھ کے بے اختیار کہہ اٹھا۔

"واہ! جائے خوب است!"

چنانچہ مغل بادشاہ کا یہ کلمۂ تحسین اس مقام کا نام بن گیا اور یہ جگہ "واہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہ چند سطریں لکھنے کے بعد میں سوچتی ہوں کہ واہ پر مضمون لکھتے وقت جہانگیر کا خیال میرے ذہن میں کیوں آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جو گرفت شہنشاہ جہاں گیر کی شخصیت پر نور جہاں کی تھی وہی گرفت، وہی چھاپ، ایک اور انداز میں واہ پر اب تک باقی ہے۔ بلکہ روز بروز پختہ اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔

یعنی کہ یہ بستی اب عورتوں کی بستی بن کے رہ گئی ہے۔ ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ یہ بستی پہلے عورتوں کی بستی ہی تھی۔ پرانے وقت کے وڈیروں کی بیبیاں جب گھروں سے باہر نکلتی تھیں تو راہ گیر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چلتے تھے یا جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جایا کرتے تھے کہ کہیں ان بیبیوں پر ان کی نظر نہ پڑ جائے۔ اب جمہور کا دور ہے۔ لیکن واہ میں عورتوں کی بالادستی بدستور قائم ہے۔

اگر آپ کسی ایسے شہر کی تلاش میں ہوں جس کے مکینوں کی ساخت اور اجتماعی نفسیات میں نسوانیت کا غلبہ ہو تو آپ فوراً "واہ" جا پہنچیں گے۔ اگر آپ مرد ہیں تو تھوڑی دیر بعد ہی آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ غلطی سے کسی اجنبی مقام پر آ گئے ہیں۔ اور اگر آپ خاتون ہیں تو آپ محسوس کریں گی کہ آپ خیر سے میکے آ گئی ہیں۔

واہ میں۔۔۔ صبح۔۔۔ رات کے نشے سے بوجھل آنکھیں جب کھولتی ہے اور جب جامع مسجد کے میناروں پر سورج اپنی کرنوں کا جال پھیلا دیتا ہے۔۔۔ تو نماز کے بعد مرد لوگ اپنی نئی پرانی سائیکلوں پر سوار ہو کے اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔ پھر سکوت کا ایک عالم طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سکوت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔

نو دس بجے کے قریب عورتیں چہل قدمی کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور ان کی یہ مختصر سی سیر سارا دن جاری رہتی ہے۔۔۔ ہر سڑک پر، ہر مارکیٹ میں عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔ ہر عمر، ہر قد، ہر رنگ اور ہر زبان بولنے والی عورتیں!

اگر ایسے میں کوئی مرد نظر آ بھی جائے تو وہ یوں نظر آئے گا جیسے غیر کی بستی میں۔۔۔ آنے کے احساسِ جرم سے جھکا جا رہا ہو۔۔۔ اور عورتیں اُسے یوں نظر انداز کرتی ہوئی نظر آئیں گی جیسے کہ وہ کوئی بجلی کا کھمبا ہو۔۔۔ یا سڑک کے کنارے اُگا ہوا درخت ہو۔۔۔ مرد صفت شخصیت سے عاری۔۔۔

کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ "واہ" میں عورتوں نے مردوں سے جنم جنم کا انتقام لینے کی ٹھان رکھی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجلسی زندگی سے یہاں مرد کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔

اس انتقام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ "واہ" میں عورتوں نے اپنی ایک خفیہ برادری بنا لی ہے اور اس برادری میں۔۔۔ مرد ذات کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اگر اس میں مرد کا نام آتا بھی ہے تو عورت کے حوالے سے۔

مثلاً یہ مکان مسز انوار کا ہے، آج مسز یوسف کے ہاں پارٹی تھی۔ مسز اسلم نے کیا خوبصورت فریج خریدا ہے یا مسز یعقوب کے ہاں مہمان آئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یعنی آپ اپنے گھر سے بھی محض اپنی مسز کے توسط ہی سے وابستہ ہیں۔ یہ المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی۔۔۔ کہ اجتماعی طور پر مردوں نے اپنی ثانوی حیثیت قبول کر لی ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت میں ایک طرح کی جھجک۔۔۔ ایک طرح کا بے نام خوف۔۔۔ ایک طرح کا احساسِ شکست نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں عورتیں پورے جلال کے ساتھ گفتگو کرتی ہیں اور مرد سرگوشیوں میں بولتے ہیں جیسے انہیں یہ ڈر ہو کہ اگر کسی نے سن لیا تو پھر کیا ہوگا۔ عورتوں کی بھرپور گوئی کی پُرشور آوازوں کے سمندر میں مردوں کی یہ نیم جاں سرگوشیاں، ناتواں موجوں کی طرح دم توڑ کے رہ جاتی ہیں۔

"واہ" کی سماجی زندگی میں اسلم مارکیٹ، ایک ہسپتال اور خاص طور پر لوسر باؤلی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ سنا ہے کہ مغل اعظم کے بیٹے یہاں آرام فرمایا کرتے تھے اور اپنے گھوڑوں کو پانی پلاتے تھے۔ ایک اور جائے استراحت ہسپتال ہے جہاں عورتیں ایک دوسرے سے گپ لڑانے کے لیے چلی جاتی ہیں۔ جہاں طرح طرح کے چہروں اور لباسوں کا ایک میلہ لگ جاتا ہے۔ سنجیدہ، مسکراتے چہرے۔۔۔ مزاج پرسی کرنے والے۔۔۔ اور کچھ گپ شپ اور اِدھر اُدھر کی خبریں اور ہر موضوع پر کبھی نہ ختم ہونے والی باتوں میں مشغول۔۔۔!

اور مرد ہسپتال کے اردگرد منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی خواہش کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی۔۔۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ کاش! ہم بھی عورتیں ہوتے اور بچوں کو جنم دینے کے بہانے اس خوبصورت ہسپتال میں کچھ دن آرام تو کرتے۔

ایک زمانے میں "واہ" میں ایک چھوٹا سینما ہوا کرتا تھا شامیانہ نما۔۔۔ جس کی چھت نہیں ہوتی تھی۔ یہ سینما اسلم مارکیٹ کے پہلو میں تھا۔ جو بعد میں ایک بڑے سینما ہال میں تبدیل ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بس اڈا ہوا کرتا تھا۔ جہاں فیکٹری کی بس مین گیٹ پر کھڑی ہوتی تھی۔ اور چند ایک تانگے پیڑ کی مختصر سی چھاؤں کے نیچے کھڑے سواریوں کے منتظر ہوتے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب تپتی دوپہر کی خاموشی کو توڑتی ہوئی تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کسی مہمان کے آنے کا پیغام دیتی تو گھر والوں کے دل خوشی سے جھوم اٹھتے۔ اس وقت تک مغربی طرزِ زندگی کے جراثیم ابھی بستیوں میں سرایت نہ کر پائے تھے۔ اس لیے یوں اچانک مہمان کے آجانے پر کوئی تشویش لاحق نہ ہوتی۔ اصل میں اس وقت ضرورتیں اور خواہشیں بہت کم تھیں۔ اور وقت وافر تھا۔ اس لیے کام کرنے سے کسی کو انکار نہ تھا۔ بزرگ بیمار کسی پر بوجھ نہیں تھے۔ سب مل جل کر خوشی اور غم اکٹھے مناتے تھے۔

''واہ'' کا ماحول بہت خوبصورت اور سادہ تھا۔ ہمسائیوں کی شفقت بے پایاں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہوں۔ محبتوں میں بسے ہوئے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے والے لوگ!

''واہ'' میں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ شاید اسی لیے یہاں کی محبوب غذا پان اور شاعری ہے۔ پان یہاں پر STATUS SYMBOL کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ پنجابی بولنے والے بھی پان کا شوق فرماتے ہیں۔ اہل زبان عورتیں اپنی دوستوں کی پان سے تواضع کرتی ہیں اور اپنے شاعر خاوندوں کا کلام بڑے شوق سے سناتی ہیں۔ جس میں وہی گل و بلبل کے پرانے مضامین باندھے گئے ہیں۔

شہر میں درختوں کے درمیان بل کھاتی پرسکون سڑکیں ہیں۔ اسی میں میرے بچپن نے آنکھ کھولی اور اوائل جوانی کے دن گزارے۔ ہر شہر کے انداز سے ہٹ کر اس شہر کا کچھ اپنا ہی رنگ ہے گرمیوں میں شدید ترین موسم کے باوجود اس شہر کی سڑکیں گھنے درختوں کے سائے میں خوابیدہ اور پرسکون نظر آتی ہیں اور جاڑوں کے موسم میں انہی سڑکوں پر خزاں زدہ پتوں کا رقص عجیب نظارہ پیش کرتا ہے۔

نہ بسوں کا دھواں نہ رکشے کی چلاتی آوازیں۔۔۔ اس پُرسکون شہر میں سب گھر ایک ترتیب میں بنے ہوئے ہیں۔۔۔ سر سبز درختوں میں گھرے، سڑک کے کنارے کھلی آغوش کے مانند بڑے بڑے لان والے صاف ستھرے گھر۔۔۔ جن میں موسم کے مطابق رنگ برنگے پھولوں سے سجی کیاریاں ہیں۔ یہاں کے مکین ہر موسم کے مزاج سے آشنا ہیں۔

ایسے پُرسکون، ہنگاموں اور شور وغل سے مبرا اور کھلے کھلے ماحول والے شہر میں فطرت بھی اپنی تمام تر سادگی اور تمام شدت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ انسان غیر شعوری طور پر محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بھی اس سادگی اس سکون اور معصومیت کا ایک حصہ ہے۔ یہ بات دوسرے شہروں میں ممکن نہیں۔

اس شہر کے ساتھ میری، بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ گزرا زمانہ بھی کیا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں گزرا بچپن مستعار زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھ لینے کے بعد بھی آج بے طرح یاد آنے لگا ہے۔ اتنے برس بعد بچپنے کو یاد کرنا خوشگوار بھی ہے اور کربناک بھی۔۔۔ یہ مسکراہٹیں، قہقہے اور آنسو ایک ساتھ لاتا ہے۔ وہ خلوص میں بسے ہوئے لوگ۔۔۔ جن کے چہروں پر محبت کے انوار پھوٹتے تھے وہ اب خواب ہو گئے ہیں۔

مجھے یاد ہے اس وقت واہ گارڈن اور ٹیکسلا دیکھنے کے لیے، ہم دن گنا کرتے تھے کہ کب ابو ہمیں ان مقامات کی سیر کو لے جائیں گے اور جب وہ ساعت آتی تو گاڑی میں بیٹھتے ہی دل کی دھڑکنیں کچھ یوں بے ترتیب ہو جاتیں کہ سمجھ میں نہ آتا کہ اتنی خوشی کیسے برداشت کر پائیں گے۔

ٹیکسلا جہاں گوتم بدھ امن و محبت و آشتی کا پجاری تھا۔ وہ فطرت کے روبرو رہنا چاہتا تھا۔ اُسے قریب سے دیکھنے کی خواہش دل میں لئے ہم سارا دن میوزیم میں گھومتے اور اپنے اردگرد بکھرے ہوئے ان کھنڈروں کو دیکھتے۔۔۔ جو کبھی آباد تھے۔ جہاں کبھی زندگی کی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔

کچھ دن پہلے ''واہ'' جانے کا اتفاق ہوا۔ ٹیکسلا کے قریب سے گزر رہی تھی کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے موسم کو ایک دم بدل ڈالا۔ بادلوں نے سورج کو اپنے اندر چھپالیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ آج ٹیکسلا کی سیر کی جائے۔ موسم بھی اچھا ہے۔ جاتے جاتے گاڑی ٹیکسلا کی طرف موڑلی۔

وہاں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارا شہر اس قرینے سے مسکراتا ہوا، گنگناتا ہوا گہری گھپ خاموشی میں سو رہا ہو۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو۔

میں نے وقت کو شکست دی ہے۔ میں پتھروں، دیواروں اور ٹیلوں پر اپنے ساتھ آج بھی موجود ہوں۔ گزرے لوگوں کے پاؤں کی چاپ میری گلیوں میں بسی ہوئی ہے۔ تاکہ آنے والے میرے لہو کی تازگی کو محسوس کریں۔

جس کی ہر چیز کہہ رہی تھی ''مجھے دیکھو میں یہاں ہوں''

گارڈ کہہ رہا تھا۔

''یہ ٹیلہ کبھی مندر تھا۔ جہاں گوتم کی دیوداسیاں گیت گایا کرتی تھیں۔ وہیں اب اسی جگہ گوتم کا بت ہے۔ جسے دُور دور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ ٹیکسلا جس کی فضاؤں میں تاریخ کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

میں گوتم کے بت کے پاس پتھروں اور ٹیلوں کے اس شہر خاموشاں کے درمیان کھڑی سوچ رہی تھی۔ آج وہی پرانا شہر بکھرے ہوئے کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا ہے جو کبھی آباد تھا۔ وقت کتنا ظالم ہے ہر جاتے لمحے کا نوحہ اس کے ماتھے پر لکھ جاتا ہے۔ دنیا میں دیر تک کچھ نہیں رہتا۔ ہر شے پر وقت اپنے نقش و نگار بنا کر ماضی میں کھو جاتا ہے اور زندگی میں نئی چہل پہل پرانے زخموں کو مٹا دیتی ہے۔

میں نے گوتم کی مورتی پر آخری نظر ڈالی اور وہاں سے چل دی۔

سڑک پر گاڑیوں کی قطاریں۔۔۔ ایک دوسرے کو کاٹنے میں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

''واہ''۔۔۔ میں رکے ہوئے وقت کے منظر بھلائے نہیں بھولتے۔

مثلاً یہ منظر۔۔۔ اس وقت تانگے کی سیر یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ اور مرغوب ترین مشغلہ تھا۔ بیگم صاحبہ پوری ملوکانہ تمکنت سے تانگے کی پچھلی سیٹ پر براجمان ہوتیں۔ آگے بچے اور میاں اپنی سائیکل پر سوار۔۔۔ تانگے کے پیچھے پیچھے۔

باقی صفحہ ۷۲ پر ملاحظہ کیجیے

''کتابیں''

(گلزار کی نظم کا تحلیلی تبصرہ اور تجلیلی تجزیہ)

ڈاکٹر سید تقی عابدی

(کینیڈا)

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔
جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں

وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹّی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گذرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول اور
مہکے ہوئے رقعے
کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے، کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا؟
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

گلزار نظم کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی نظم میں تخّیل جذبات، صداقت سلاست کے ساتھ زبان کا چٹخارہ بھی موجود ہے۔ ان کی نظم اکیسویں صدی کے عصری مزاج سے منسلک ہے اسی لیے مقبول ہے۔ عامی اور عالم دونوں ان کی شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندی، روایت پذیری، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے بعد کی عصری حِس نمایاں ہے جو آج ایک بڑی شاعری کی شناخت اور علامت بھی ہے۔ نکلسن کہتا ہے بڑی شاعری میں اپنے دور کی حسیّت کے ساتھ ساتھ ماضی کی قدروں کا احساس اور مستقبل کے امکانات کا محاسبہ بھی رہتا ہے۔

بیسویں صدی کے دو عظیم اردو شاعر علاّمہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی جنھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں ریاضت کی ہے مگر وہ نظم ہی کے شاعر تھے۔ مضمون کا تسلسل واقعات کا اُتار چڑھاؤ، لہجہ کی رنگارنگی کو غزل کی تنگ دامنی برداشت نہیں کرسکتی۔ اسی لیے اُردو نظم نے ڈیڑھ سو سال کے قلیل عرصے میں کثیر فتوحات کیے ہیں۔

گلزار کی نظم ''کتابیں'' اُردو کی شاہکار نظموں کی صف میں نمایاں ہے۔ یہ نظم اگرچہ برصغیر کی ہندوستانی زبان میں پڑھی اور لکھی جاسکتی ہے لیکن اس نظم کے اکثر موضوعات اور جذبات دنیائے ادب کی کتابوں سے بھی مربوط ہیں۔ چنانچہ گلزار کی نظم ''کتابیں'' دنیائے ادب کو تحفہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ گلزار کی شاعری ارتقائی منازل طے کر کے ندرت خیال و بیان کے میناروں پر جاگزیں ہوتی جارہی ہے۔ مولانا رومؔ نے کہا تھا میری عمر کو تین لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ میں کچاّ تھا پک گیا اور پھر فنا ہوگیا۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بودم پختہ شدم سوختم

یعنی انسان مہد سے لحد تک سفر کرتا ہوا ان کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ جب انسان پختہ ہوجاتا ہے تو اس کا جسم کمزور مگر اس کی ذہنی فکری قوت قوی اور تجربہ وسیع ہوجاتا ہے اس لیے ہر ہنری کام جو اس پختہ اور فنا کے درمیان ہوتا ہے عظیم ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی لیے ہم گلزار سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح شاہکار تخلیق کرتے رہیں۔

اس موقع پر سب سے پہلا یہ سوال اٹھتا ہے کہ شعر تخلیقی اُپج ہے یہاں تبصرہ تشریح اور تجزیہ کی گنجایش کہاں ہے؟ اسی لیے بعض شاعروں نے ظاہری طور پر اس نظریہ کی حمایت کی کہ ''شعر مرا مدرسہ کی برد'' اور باطنی طور پر مسلسل مدرسہ کی تختی پر اپنا شعر احباب اور شاگردوں سے لکھواتے رہے۔ جن شعرا کے کلام پر تبصرہ تشریح اور تجزیہ کیا گیا انہی کا اکثر کلام تشہیر ہو کر شعری تہذیب کی تربیت ثابت ہوا۔ اگرچہ تنقید میں تنقیص اور تعریف دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مرزا

غالبؔ جس کے آگے اُردو کے اغلب شعرا مغلوب ہیں درجنوں خطوں میں اپنے اشعار کی تشریح اور توضیح خود کرتے ہیں اس کے باوجود آج پچاس سے زیادہ شرحیں ان کے کلام پر نظر آتی ہیں۔تنقید مدح سرائی کا نام نہیں۔تنقید جانب داری کا کام نہیں۔تنقید معمّا سازی اور چیستان کا جام نہیں اسی وجہ سے صحیح تنقید عام نہیں۔تنقید نوک خار سے گل کو پَر پَر کردینے کا عمل نہیں بلکہ گلوں کو شعری گلدستہ میں سجا کر پیش کرنے کا نام ہے۔اگر چہ اس گلدستے میں شامل خار و خاشاک کا بھی ذکر ہو۔اسی لیے تو جوشؔ نے نقاد کو للکارا تھا۔

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوک خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو
یعنی اک لَے سے لب ناقد کو کھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرہ شبنم کو تلنا چاہیے
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

پس انسان جب خود اپنی پیٹھ کو دیکھنے کے لیے آئینہ کے چہرے یا کسی چہرے کی دو آنکھوں کا محتاج رہتا ہے تو شعری اُپج جو تحت شعور کا جذباتی سیلاب ہے اس میں تیر کر پار اُترنے کے لیے پیراکی کے ساتھ ساتھ ہواؤں کے مزاج موجوں کے دباؤ اور ساحل کی سمت کے علم کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔

ایک کامیاب اور کارآمد تشریح اور تجزیہ سے صاحب تصنیف، پڑھنے والے اور ادب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ادب برائے ادب اور ادب برائے ہدف پوری طرح سے صحیح اس لیے بھی نہیں کہ تخلیق زندگی سے جدا نہیں ہوسکتی۔چنانچہ ادب سے ہدف مکمل طور پر علاحدہ نہیں ہوسکتا۔آیئے اس گفتگو کے بعد نظم کا تحلیلی سفر تجزیاتی حوصلے کے ساتھ کریں۔

نظم منظر کشی سے شروع ہوتی ہے۔

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں

یہاں گلزار نے ایک شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو تخیل کی نگاہ سے دیکھ کر صنعت حسن تعلیل کو جذبات کے ساتھ پیش کیا۔چنانچہ اب ہر سننے اور پڑھنے والے کو الماری کی کتابیں شیشوں سے جھانکتی اور حسرت سے تکتی نظر آنے لگیں۔یہ فطری شاعر کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ ان کہی بات کو کہاوت اور ناموجود کو وجود کا جسم عطا کردیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے آنکھ وہ شئے نہیں دیکھ سکتی ذہن جس کو نہیں جانتا۔ہم سب نے ہزار بار الماریوں میں کتابیں دیکھیں لیکن کسی نے گلزار کی طرح شعری بصیرت کو چشمی بصارت میں تبدیل نہیں کیا یعنی گلزار کی طرح قطرہ میں دجلہ نہ دیکھا اور نہ دکھایا۔

شاعری الفاظ سے زیادہ معنی سے سروکار رکھتی ہے۔معنی کثیر اور لفظ قلیل ہونے کے باعث، معنی الفاظ کے اطراف بکھرے پڑے رہتے ہیں لیکن چونکہ معنی کا کوئی جسم نہیں ہوتا اس لیے سطروں سے زیادہ بین السطور مطالب تہہ در تہہ نامری طور پر موجود رہتے ہیں جنھیں ہر شخص اپنی فکر اور ہمت کے مطابق حاصل کرسکتا ہے۔یہاں شاعر الماری میں بند کتابوں کی منظر کشی کے دروازے سے ایک بہت بڑے ذہنی میدان میں ہمیں داخل کررہا ہے۔جہاں جدید اور روایتی تہذیب کی قدروں کا منظر نامہ مناظرہ اور محاسبہ ہے۔

عشق کا سوز و گداز عاشق اور معشوق دونوں کو متاثر کرتا ہے۔"دل بہ دل راہ دارد" کے معنی بتاتے ہیں کہ یہ راستہ دو طرفہ ہوتا ہے۔یہاں کتابیں معشوق اور قاری عاشق ہیں۔یہاں معشوق حسرت کی نظر اور بے چینی سے یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کا قدیم عاشق اب کمپیوٹر کے نظاروں میں اپنی شامیں گزارتا ہے۔عاشق معشوق کے جلوے سے دوری اختیار کرچکا ہے۔چنانچہ اب کتابیں بیداری میں نہیں بلکہ خواب میں قاری سے ملاقاتیں کرتی ہیں۔

جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں

شاعر نے نظم کے چہرے میں کتابوں سے دوری، کتابی ریڈرشپ کی کمی اور موجودہ دور میں کمپیوٹر اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی ترقی اور گلوبل ویلج کے ماحول سے وابستگی کے حقیقی اور سچے اثرات کو شعری رس میں گھول کر جذبات کے ساغر پیش کیا۔شاعر نے فوراً روایت سے رشتہ جوڑ کر ذہن کو جھنجھوڑا کہ انہی کتابوں میں جو انسانی، سماجی، علمی، اخلاقی اور مذہبی قدریں اشعار میں، خاکوں، کہانیوں، افسانوں، ڈراموں، ناولوں میں پڑھی اور سُنی جاتی تھیں وہ ذہن کے خانوں میں ہمیشہ زندہ اور تازہ رہتی تھیں آج موجود نہیں۔یہی نہیں بلکہ انسانی اور خاندانی رشتے جن سے سماج اور خاندان بندھا رہتا تھا وہ بندھن جس کا تذکرہ وہ تہذیب و تربیت، طور و طریقہ جو تخلیقی شہ پاروں کی وجہ سے کتابوں کے نقش کے ذریعے دل و دماغ پر ثبت ہوتا تھا آج بگڑ چکا ہے۔

جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں

انسان اشرف المخلوقات صرف شعور ذات کی وجہ سے ہے۔ورنہ بدنی اور حسّی طاقتوں کے لحاظ سے دوسری مخلوقات سے بہت نیچے ہے۔یہ سچ ہے کہ یہ پانچ چھ فٹ کے انسان کے سامنے پوری کہکشاں چھوٹی ہے۔انسان اس قدرِ عظیم صرف انسانی عالی قدروں اور اس کے رشتے عبد اور معبود سے ہے۔مقام انسان، حقوقِ انسان، احترام انسان کا تعین قدروں اور رشتوں سے ہے۔قدروں

کے آفتاب کی ایک شعاع اخلاق ہے۔ یہاں گلزار نے آج کے پُرآشوب مادّی ماحول میں روحانی بالیدگی کی کمی کا خوب صورت اشارہ کیا ہے کہ کتاب ہی وہ صحیفہ ہے جس میں اخلاقیات کا ہر درس نظر آتا ہے۔

اوپر کے مصرعوں اور فقروں میں ''قدریں''، ''سیل'' اور ''رشتے''، ''ادھڑے'' صنعت ایہام میں ہیں یعنی ایک تو ان کے قریبی معنی ہیں اور دوسرے ''دور'' بعید معنی ہیں جو شعر کی عظمت کے نقیب ہیں۔ کتابیں جو قدریں سناتی ہیں وہ ہمیشہ ہمارے ذہن میں زندہ رہتی ہیں، دوسرے معانی یہ ہیں کہ انسانی قدریں زندہ جاوید ہیں۔ ہمیشہ زندہ رہیں گی جن کی سخن گو کتاب ہے۔ رشتہ ایک معنی میں وہ دھاگا ہے جو باندھنے اور بُننے کے کام آتا ہے دوسرے معنی میں وہ تعلق ہے جو انسان سے انسان کو اور انسان کو معبود سے ہے۔

گلزؔار نے نظم میں تخیّل کے ساتھ تنوع بھی برتا ہے جو آسان کام نہیں۔ نظم میں غزل کے مقابل آزادی تو ہے مگر یہ آزادی نظم کی بربادی ہو جاتی ہے اگر شاعر تخیّل کی آماج گاہ کو نظم کے بہاؤ کے ساتھ سازگار نہ رکھے یا ذہنی مضمون کے تسلسل کو مجروح اور مخدوش کردے۔ گلزؔار اس لیے بھی عمدہ نظم کے شاعر ہیں وہ ان نکات کی باریکیوں اور رموز سے واقف ہیں۔ یہ عمل ریاضت سے نہیں بلکہ سعادت سے ظاہر ہوتا ہے۔

''کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے'' یہ نظم کا سب سے اہم حصّہ ہے جس نے اس نظم کو شاہکار نظموں کی صف میں کھڑا کردیا ہے۔ اس حصّے میں شاعر نے کتاب کے صفحے پر یا کمپیوٹر کے پردے پر ظاہر ہونے والے کلام پر کلام کیا ہے۔ یہ درحقیقت آج کل کی بعض شائع ہونے والی کتابوں یا فیس بک پر تکمیل کی جانے والی شاعری اور تخلیق نما کاوشوں پر صحیح ریویو ہے۔ اگر کتاب کا صفحہ پلٹتے وقت سسکی نکلتی ہے تو کتاب جو درست اور عمدہ شاعری کا خزانہ تھی رو رہی ہے کہ یہ کیا میرے اندر بھرا جا رہا ہے۔ اگر یہ کمپیوٹر پر صفحہ بدلتے سسکی ہو رہی تو شاعری رو رہی ہے کہ آج کے دور میں میری کیا حالت ہوگئی ہے۔

یہاں گلزؔار نے لفظ و معنی پر بحث کی ہے اور نادر تشبیہات اور استعارات سے ترسیل و ابلاغ کا کام نکالا ہے۔ یہاں شاعر نے روایتی اور جدید شاعری کا تقابل بھی کیا ہے۔ یہاں گلزار نے لفظوں کو استعاروں میں ڈھالا ہے۔ فیض احمد فیضؔ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا لفظ کو استعارہ بنانا میں نے غالب سے سیکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالبؔ سے بڑا استعارہ کا خالق اردو ادب میں نہیں گزرا کیونکہ وہ لفظ شناس اور معنی پرور تھے۔ قدیم عظیم شعرا ایسے چنندہ اور حسب ضرورت الفاظ استعمال کرتے کہ ایک لفظ اگر چہ دیکھنے میں اک شجر کی طرح ہوتا مگر اس میں کئی معنی کے پھل اُگتے اور غالب اسی کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہتے ہیں۔ گلزار کہہ رہے ہیں کہ اب تو الفاظ کے درختوں پر معنی کے پھل نہیں اُگتے یہی نہیں بلکہ لفظ بغیر پتوں کے سوکھے ٹنڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بالکل نیا مضمون ہے۔ یہی ندرت فکر و بیان ہے یہی بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ آج کل کی تکمیل کردہ کتابی یا ڈیجیٹل شاعری جس میں الفاظ اور معنی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے ایک جدید بحرانی کیفیت کا حامل ہے جس کی اصل وجہ شعری ذوق کا فقدان ہے۔ ایک کامیاب شاعر اپنے تجربات کو سننے والے کے تجربات سے جوڑ کر اس کا اثر دو آتشہ کر دیتا ہے:

ع: میں نے یہ جانا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے

گلزار یہاں لفظ و معنی سے گزر کر محاسنِ شعری سے دوری کو خود دیکھتے ہیں اور ہمیں دکھاتے ہیں۔ روایتی قدیم میخانوں کے اطراف و اکناف میں آج بھی مٹی کے ٹوٹے پھوٹے پیالے جنھیں پھینک کر شیشے کے بلوری ساغروں میں شراب دینے کا طریقہ رواج پا چکا ہے یہ جدیدیت کا اثر ہے اگر چہ میخار جانتے ہیں سفالی سبو میں پینے کا مزا اور ہے ورنہ حضرت غالبؔ نہ کہتے: جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے۔

اصطلاحات تلمیحات شعری خزانوں کی کنجیاں ہیں لیکن آگاہی اور علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ چمنستان چیستان میں تبدیل ہو چکا ہے اور اسے شاعری میں ترک کر دیا گیا ہے جیسے سفالی سبو اب متروک ہو چکے ہیں۔

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا

شاعر ہر قدم پر سننے والے کو اپنے تجربے میں شامل کر رہا ہے۔ وہ اسے اُن معمولی اور چھوٹے چھوٹے جزئیات میں شریک کرتا ہے جسے اُس نے لاشعوری طور پر کیا لیکن اب اس کا ذائقہ محسوس کر رہا ہے جو کمپیوٹر پر انگلی سے کلک کرنے پر نہیں ہوتا اگر چہ یہاں صفحات لاتعداد کھلتے چلے جاتے ہیں۔

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے

انسانی ذہن مشق آموز ہے۔ وہ وہی کرے گا جس کی اُسے تعلیم دی گئی ہے۔ جس شخص نے کتابی مطالعہ کیا ہے وہ کمپیوٹر کے صفحہ پر اُسی کتاب کو ذوق و شوق سے نہیں پڑھ سکتا۔ عادت بدلنے کے لیے عمر کافی نہیں۔ چنانچہ کتاب کا صفحہ پلٹتے ہوئے ذہنی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پرانی کتابوں میں صفحات کے نیچے اُس لفظ کو لکھتے تھے جس سے آگے کا صفحہ شروع ہوتا تھا۔ جس کی ایک وجہ تو آئندہ صفحہ کا تعین تھا مگر اس سے زیادہ ذہنی موضوع اور خیال و فکر کا تسلسل تھا تاکہ اس میں فاصلہ نہ ہو۔ چونکہ ذہن الکٹرونک موجوں کا کرشمہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کتابی صفحہ ذہن میں موضوع کو متلاشی ہونے نہیں دیتا اور اسی کی طرف اس فکری نقطہ کا

اشارہ ہے جسے گلزار نے ذائقہ نام دیا ہے۔

یہاں تک گلزار نے کتاب کی معنوی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اب نظم کا وہ حصّہ ہے جس سے عوامی تعلق اور نظم کی شہرت کا تعلق ہے۔ یہاں شاعر نے کتاب کی صوری کیفیت اس کے جمال خدو خال اندرونی حال سے زعفران بکھیری ہے۔ چنانچہ اس حصّے میں رنگا رنگی کے ہمراہ پھولوں کی نرمی کے ساتھ ساتھ محبت کی خوشبو بھی شامل ہے جس سے ہر فکر عطرِ نظم سے معطّر ہو جاتی ہے۔

ایک عمدہ شاعر جب منظر کشی میں سہ بُعدی Three dimensional حالت پیدا کرتا ہے تو وہ مرقع کشی ہو جاتی ہے۔ منظر سے منظر کو جوڑ کر یہاں مضمون کو رفعت دے کر عقیدتی بلندی پر گلزار نے کتاب کو رحیل پر نیم سجدہ حالت میں پڑھا کر آسمانی صحیفہ کر دیا جو کتاب کی معراج ہے۔

کبھی سینے پر رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے چھوتے تھے جبیں سے

ان مصرعوں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی جھلک بھی ہے۔ یہاں معشوق کے خدو خال اور معبود کے کلام و جلال کی نسبت سے سینے پر رکھ کر گودی میں لے کر اور رحیل کی صورت یا نیم سجدے کی حالت میں گفتگو ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی نظام کی تہذیب ہے جس کو سومناتی خیال کہتے ہیں۔ اس تہذیب اور تربیت کا کسی خصوصی مذہب اور دھرم سے تعلق نہیں بلکہ یہ برصغیر کے کلچر اور ہزاروں سال سے پیوستہ پنڈتوں کے حیات و ممات کے فلسفہ سے مربوط ہے۔ جس کا ذکر امیر خسروؒ، کبیر داس، بیدلؔ، غالبؔ اور بیدیؔ کے پاس بھی ہے۔

اس نظم کا آخری حصّہ دلکشی کا محور ہے۔ یہاں نظم رومانی دائروں میں گھومتی ہے۔ شاعر یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی۔

یہ سچ ہے کہ گذشتہ بیس (۲۰) سالوں میں کمپیوٹر نے اتنا علم ذخیرہ کیا ہے جو دنیا نے کبھی ایک جگہ جمع نہیں کیا تھا چنانچہ علم کے پیاسے کو علم کا سمندر تو ملے گا

مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
مہکے ہوئے رقعے
کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

یعنی کتابی متن تو کمپیوٹر اور موجوں میں آجائے گا لیکن کتابی خدو خال سے وابستہ حسن و عشق کے معاملات، ملاقات، تبرکات، یادداشت، واقعات وغیرہ کبھی بھی سحر بن کر ہماری اُفق پر ظاہر نہ ہوں گے۔ نظم کے متن پر تفصیلی تبصرہ کرنے کے بعد ہم اس نظم کے اہم شعری ادبی نکات پر روشنی ڈالیں گے۔ گلزار کی نظم کے سرسری اور دقیق مطالعے سے جو شعری ادبی فنّی قدریں ہمیں نظر آتی ہیں اُن میں سے چند کا ذکر ضروری ہے۔

ا۔ ''کتابیں'' اُردو نظم ہے لیکن ہندوستانی عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔ حالیؔ کی ''مناجات بیوہ'' سُن کر جب گاندھی جی رو پڑے تو مولوی عبدالحق نے کہا تھا اس سے عامی اور عالم دونوں متاثر ہیں۔ یہ نظم ہندوستانی زبان میں لکھی گئی ہے۔ چنانچہ ''کتابیں'' بھی اردو رسم الخط نستعلیق میں ہو یا ہندی دیوناگری یا انگریزی رومن حروف میں لکھی جائے نظم کے بیان بہاؤ اور اثر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسے صفائی، سادگی اور سلاست کہہ سکتے ہیں جو ماحول اور مکان کے تحت اچھا شاعر اپناتا ہے۔

ب۔ پوری نظم میں ایک بھی اضافت یا ترکیب نظر نہیں آتی۔ اگرچہ عربی اور فارسی کے اردو میں مستعملہ الفاظ جیسے صحبت، الفاظ، معنی، اصطلاحیں، تہہ، علم، رحیل، سجدے، جبین، رقعے، رشتے وغیرہ وغیرہ مصرعوں میں نگینوں کی طرح جڑ دیے گئے ہیں۔ مصرعوں میں ان الفاظ کا کوئی حرف تلفظ میں ادھ بیان یا دب نہیں گیا۔ شاعری میں یہ استطاعت کہنہ مشقی اور شعر کی نوک و پلک سنوارنے کی ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ میر انیسؔ کے نواسے میر مانوسؔ نے مسعود حسن ادیب سے گفتگو میں کہا تھا کہ یہ افواہ غلط ہے کہ انیسؔ چادر تان کر نیم نیند کی حالت میں شعر کہتے تھے بلکہ تمام رات کنول جلا کر محنت و ریاضت سے اشعار کی نوک و پلک سنوارتے یعنی سیروں خون خشک کرتے جب جا کر ایک آبدار شعر ظاہر ہوتا۔ ''کتابیں'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلزار نے نظم کے مزاج لہجہ بناؤ سنگار پر اپنی فطری شاعری کی ثروت کے ساتھ فنی رکھ رکھاؤ پر وقت صرف کیا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے شہکار عرق ریزی، دیدہ وری اور پُرکاری سے وجود میں آتا ہے۔

ج: ''کتابیں'' آزاد نظم کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ اس کو مزید مغربی نیو ورس New Verse سے جوڑ سکتے ہیں جو آج کل برصغیر کی مختلف زبانوں کی شاعری میں رواج پا رہی ہے۔ یہاں عموماً زبان کتابی نہیں بلکہ تکلّمی رہتی ہے۔ یعنی نظم میں طرز بیان مصنوعی اور بناوٹی نہیں بلکہ اصلی اور فطری ہوتا ہے۔ جہاں تک بحر کے بہاؤ کا تعلق ہے مصرعوں کی بندش اُسی طرح ہوگی جیسے بات کرنے کا انداز یعنی جہاں رُکنا ہو، رُکیں۔ جہاں زور دینا ہے وہاں زور دیں، جہاں گفتگو کو ایک لہجے میں بیان کرنا ہو بیان کریں۔ چنانچہ مصرعوں کی لمبائی تکلّمی (Speech Rythm) آہنگ پر منحصر ہوتی ہے اسی لیے ''کتابیں'' میں بعض مصرعے تین لفظی اور بعض دس گیارہ لفظوں سے بنے ہیں۔

اس نیو ورس اور تکلّمی آہنگ کی وجہ سے نظم کی ترسیل اور تفہیم میں بڑی مدد ملی ہے۔ چنانچہ جب گلزار اس نظم کو پڑھتے ہیں تو مصرعوں کے اُتار چڑھاؤ، لہجے کے زیر و بم سے اس کے اثر کو دو آتشہ کر دیتے ہیں۔

یہ نظم ایک اچھی مثال ہے اُردو آزاد نظم میں نیو ورس کی قدروں کو اپنانے کی اسے مابعد جدیدیت کے بعد کی عصری شاعری کا نمونہ سمجھا جائے۔

د: مصرعے فقرے بلکہ نظم روزمرہ میں ہے۔ الفاظ کی نشست اسی طرح کی ہے جیسے ہم بولتے ہیں جو نظم کا حُسن اور کمال بھی ہے۔

ھ: نظم میں ہندی کے رسیلے شبدوں کے علاوہ انگریزی کے مروجّہ

الفاظ برتے گئے ہیں جو اکیسویں صدی اور گلوبل ولیج کی موجودہ شاعری کی پہچان بھی ہے۔ برصغیر کا مختلف زبانوں کا ماحول، انگریزی زبان کی ملکوں اور ٹکنالوجی پر دست اندازی اور تاثیر اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان انگریزی یا خارجی الفاظ کا متبادل لفظ جو فارسی یا عربی لوگ کر لیتے ہیں ہم بھی کر سکیں۔ اس لیے ہم اسے اپنی زبان میں مستعملہ لفظ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے نظم کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی جیسے:

کمپیوٹر کے پردوں پر
انگلی کلک کرنے سے
گلاسوں نے انھیں

یہی نہیں بلکہ اگر کوئی ادق اور غیر مانوس انگریزی لفظ بھی آ جائے تو اسے لفظوں کی نشست سے مانوس بنا لیتے ہیں جیسے

کہ جن کے (Cell) کبھی مرتے نہیں تھے۔

گلزار کے اس تجزیہ سے دنیا کی زبانوں کے سائنٹفک مطالب آسانی سے اردو نظم و نثر ہو سکتے ہیں۔

و: اس نظم کے چند محاسن زبان و بیان اور صنائع لفظی و معنوی کو یہاں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

1. نظم میں سادگی شگفتگی روانی اور صفائی موجود ہے جو عموماً روزمرہ کی وجہ سے ہے۔
2. نظم میں بعض مطالب منظر کشی کے ہیں جو مرقع کشی بن چکی ہیں۔
3. محاورے حسب ضرورت اپنے صحیح مقام اور صحت کے ساتھ ہیں۔

جیسے حسرت سے تکنا
سسکی نکلنا
نیند میں چلنا وغیرہ

4. زود فہم تشبیہات اور استعارات:

— جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں (سکوروں کی طرح)
— کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر (رحیل کی صورت)
— بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ (سوکھے ٹنڈ)
— گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا (گلاسوں)

5. صنعت تعلیل: شاعر ایک عام کیفیت کو دوسرے معانی میں پیش کرتا ہے جیسے پتنگا جو شمع کے شعلے سے جل جاتا ہے وہ ایک حادثہ اور غفلت ہے مگر شاعر اُسے عشق قربانی اور پیار بتاتا ہے اور لوگ شاعر کے خیال کو مان لیتے ہیں۔

— کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
(زندہ شے دیکھ سکتی ہے)
— حسرت سے تکتی ہیں
(زندہ شے جذبہ حسرت رکھتی ہے)

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
(انگلی کو تھوک لگا کر صفحہ ذائقہ کے لیے نہیں صرف ایک صفحہ اٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں)

6. صنعت مراعات النظیر: ایک ہی کیفیت، حالت، موضوع، مطالب کے الفاظ شعر میں لانا۔ جیسے: لفظوں، معنی، اصطلاحیں، متروک وغیرہ پتّوں۔ سوکھے۔ ٹنڈ۔ اُگتے

—انگلی۔ سینے۔ گودی۔ گھٹنوں۔ جبیں
— پھول، سوکھے۔ مہکے وغیرہ

7. صنعت تکرار: الفاظ کی مصرعوں میں تکرار

—ادھڑے ادھڑے
— تہہ بہ تہہ

یہی نہیں بلکہ صنعت تجنیس، ابداع، تضاد وغیرہ کی مثالیں اس نظم میں موجود ہیں۔ بعض ایسی بھی صنعتیں نظر آتی ہیں جن کے نام نہیں۔ کیا ہم نے جنگل میں اگنے والے ہر پھول کو نام دیا ہے۔ شاید آئندہ وقت ان صنعتوں کو بھی نامی گرامی کرے گا۔

ز: ایسی نظموں کو تدریسی نصاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ گلدستہ کی طرح ان میں کلاسک موضوعات کے علاوہ ترقی پسند عناصر، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور عصری حسیّت کی جھلکیاں موجود ہیں جو زبان کے تحفظ اور ارتقا میں ضرور ہیں۔ ہم نے مضمون کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نظم میں شامل علامات اشارات اور پیکر تراشی کے نمونے یہاں بیان نہیں کیے۔

ح: انسانی ذہن کی کیفیات شعور (Consious) تحت شعور (SubConsious) اور لاشعور (Un Consious) کے تحت ہیں۔ شعر کی تخلیق کا مبدا لاشعور ہے جسے ہم درک نہیں کر سکتے جیسے کائنات کے بلاک میٹریل کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اِسے شعری زبان میں الہام کہتے ہیں (Black Matter) لاشعور سے خیال جب تحت شعور کی فضا میں آتا ہے تو الفاظ کا جسم پہن کر آتا ہے کیونکہ تحت شعور اور شعور میں جسم کا ہونا ادراک کے لیے لازمی ہے۔ جب خیال کا پرندہ لفظوں کا جسم پہن کر ذہن کی فضا میں اُڑتا ہے تو فوراً شاعر اُسے صحیح اور موزوں کر کے قرطاس کے قفس میں ہمیشہ کے لیے قید کر لیتا ہے۔ جس کو ہم شعر کہتے ہیں پھر اس کی شعور کی مدد سے نوک و پلک سنوارتا ہے۔ آمد اور آورد میں فرق یہی ہے کہ آمد کے آسمان پر خیالات کے نادر جھنڈ لہراتے رہتے ہیں جو مبدائے قدرت نے انھیں لاشعور میں بھر دیے ہیں۔ چنانچہ فطری شاعری اچھے اشعار اور انتخاب در انتخاب کر کے شعر پیش کرتا ہے۔ راقم نے گلزار کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور یقیناً وہ اس سعادت سے فیض یاب معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں چاہیے قلم ہاتھ میں رہے اور سینوں اور دماغوں کے صندوقوں میں بند خیالات یہیں اُگل دیں۔ ہم جانتے ہیں وہ بہت مصروف شخصیت ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے فلم انڈسٹری کی یاد بود کتنے عرصے تک رہے گی مگر یہ مجھے معلوم ہے وہ اپنی شاعری کی وجہ سے زندۂ جاوید رہیں گے۔

☆ تجزیہ سے حاصل ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ شاعر کو اپنے دور کے ماحول اور قاری، سامع کے معیار کو دیکھ کر شاعری کرنا چاہیے یا اُسے کسی بھی عنوان پر اپنی فکری بلندی، تجربہ اور علمیت سے حاصل ہوئی عظمت کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری نظر میں ایسے ہی شعرا آج بھی صدیاں گزرنے پر زندہ ہیں جنھوں نے تحسین نا آفرین کی خاطر اپنی آفرینی شاعری کو قربان نہیں کیا۔ شاعر کو چاہیے کہ تمام نادر مشکل فہم مضامین بھی جو اُس کی گرفت میں آسکے سادے یا مشکل ادق الفاظ میں باندھے اور جو موقع پر سنانا ہے سنائے۔ اس طرح ''چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد'' ہم نے بعض ویڈیوز میں دیکھا ہے گلزار ان مصرعوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جو ماحول کی مناسبت اور سامعین کی موجودگی کے باعث ٹھیک عمل ہے۔ اصطلاحیں اور متروک الفاظ آج کے سب سامعین سمجھ نہیں سکتے۔

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر دیا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید اور تشریح سے صاحب تصنیف اور ادب کو بھی فائدہ پہنچا ہے جس طرح صاحب تجزیہ اور قاری و سامع اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو حافظ نے ان لوگوں کو سراہا تھا جنھوں نے اُس پر تنقید کی تھی کہ ان کی وجہ سے میں سیدھے راستے پر گامزن ہوں۔ ہزار سال پرانے عربی شاعر ابونواس کا ذکر تجزیہ کے ذیل میں بے سود نہیں۔ ابونواس بغداد کی گلیوں سے گزر رہا تھا اُس نے ایک مکتب کے معلّم کی آواز سنی جو شاگردوں سے پوچھ رہا تھا اچھا یہ بتاؤ ابونواس نے کیوں کہا۔ (ترجمہ) اے ساقی شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ شراب ہے۔ یہاں شاعر کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ کر پلا کہ شراب ہے۔ ابونواس چھپ کر سنتا رہا۔ شاگردوں نے باری باری سے جواب دیا پھر معلّم نے کہا کہ بات یہ ہے جب ساغر شراب اس کے ہاتھ سے لمس ہوگا تو قوت حسیّہ سے اُسے سرور ہوگا۔ جب ساغر شراب اس کی نظروں سے ٹکرائے گا تو قوت باصرہ سے اس کو نشہ چڑھے گا۔ جب ساغر شراب اس کی ناک کے قریب آئے گا تو قوت شامّہ سے ترنگ حاصل ہوگا جب شراب کا قطرہ زبان پر پڑے گا تو قوت ذائقہ سے وہ مست ہو جائے گا۔ اب صرف ایک حواس سننے کا شامل نہ تھا۔ چنانچہ جب شراب کا نام سنے گا تو اس کا نشہ دو آتشہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر ابونواس دوڑا ہوا معلّم کے پاس آیا اور اسے گلے لگا کر کہا کہ ''بخدا شعر کہتے ہوئے میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا میں نے تو فقط یوں ہی کہہ دیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے شعر فہمی بعض اوقات شعر گوئی سے مشکل ہوتی ہے۔

جب ناقد تفصیل سے کسی کی تشریح، تجزیہ اور تحلیل کرتا ہے تو صاحب تصنیف یعنی شاعر کے لیے نئے فکری زاویے قائم ہوتے ہیں اسی لیے تنقید بھی تخلیقی ادب میں شمار کی جاتی ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ راقم نے گلزار صاحب کا تقریباً تمام مطبوعہ کلام پڑھا ہے۔ بعض اشعار پر تنقیدی تشریحی اور تحلیلی حاشیے کتابوں میں لکھے ہیں۔ مغرب کی مشینی زندگی پھر ایک انار سو بیمار کی حکایت نے ابھی وہ موقع فراہم نہیں کیا جو ہم ایسے عمدہ شاعر کا مکمل تنقیدی اور تشریحی جائزہ لے سکیں۔ اگرچہ گلزار پر کئی تشریحی اور تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں لیکن پھر بھی یہ ایک بڑا قرض ہے جو اردو کے ناقدین اور شارحین کو چکانا چاہیے۔ شاید اس کی قسط جلد میں خود ادا کروں۔ ادب کی دھنک میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس لیے اس کا حُسن اختلاف کے رنگ سے بھی بنا ہے۔ چنانچہ ہماری تحریر اگرچہ مستند حوالوں سے بنی اور بُنی گئی ہے مگر اس میں نظری اختلاف کی گنجائش ہے۔ توقع ہے کہ گلزار اسی طرح مسلسل تخلیقی جواہر معدن فکر سے بازار سخن میں پیش کرتے رہیں۔ یہ سچ ہے جس کا اشارہ فیض نے کیا تھا۔

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازار سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گُہر جائیں گے

''کتابیں'' بتاتی ہے افسردگی کی ضرورت نہیں۔ اب صرف بازاروں میں نہیں بلکہ میلوں، کالجوں اور پردیس کے شہروں میں بھی جوہریوں نے دکان کھول رکھی ہے۔

''ہمارے شہر کے بچے''

بنا رہے ہیں عبث کھیل کود کے میدان
ہمارے شہر کے بچے تو کام کرتے ہیں

○

وہ کون ہے جو انہیں کھیلنے نہیں دیتا
یہ کمسنی میں جو روزی کمانے لگتے ہیں

○

کچے گھروں میں رہتے ہیں شاید اسی لیے
سہمے ہوئے سے رہتے ہیں کالی گھٹا سے ہم

○

کس ضرورت کو دباؤں، کسے پورا کروں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

○

محرومیوں نے دل کی تمنائیں چھین لیں
بچوں نے کرنے چھوڑ دیے ہیں مطالبات

○

وہ ہنستے کھیلتے بچے رلا کے چھوڑ جاتا ہے
غبارے بیچنے والا گلی میں روز آتا ہے

(نصرت صدیقی کے کلام سے منتخبہ)

''پس اشک''

ڈاکٹر سیفی سرونجی
(بھارت)

انل ٹھکر اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ان کے کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ان کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالکل سادہ عام فہم زبان میں ہوتے ہیں اس لئے قاری ان کا ہر ناول دلچسپی سے پڑھتا ہے۔''پس اشک'' بھی ایک ایسا ہی سادہ زبان میں لکھا گیا ایک معاشرتی ناول ہے۔ ہمارے سامنے کے عام کردار ہیں،جنھیں ہم اکثر گھروں میں دیکھتے ہیں۔دراصل یہ ناول مسلم معاشرے کے ایک ایسے پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔جس معاشرے میں عورتوں کی تعلیم سے غفلت برتی گئی اور اسے صرف گھر گرہستی سنبھالنے اور مردوں کی غلامی تک محدود رکھا گیا ہے۔ویسے تو مسلم سماج میں عورتوں تو کیا مردوں میں بھی تعلیم کا رجحان کم پایا جاتا ہے۔اب جا کے قوم میں کچھ بیداری پیدا ہوئی ہے جبکہ اسلام میں عورتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔پھر بھی تعلیم کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا۔ایسا ہی ایک کردار نغمہ کا ہے،یوں تو دو چار کردار اور بھی خاص ہیں جیسے دیوان صاحب جو کہ ایک بڑے حکیم ہیں ، مرزا صاحب جو دیوان صاحب کے داماد ہیں۔انہیں مرزا صاحب کی بیٹی نغمہ ہے جسے اس کے ابو پڑھانا چاہتے ہیں۔گویا اس ناول میں مرکزی کردار نغمہ کا ہے۔عام طور پر مسلم معاشرے میں عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا اور انھیں صرف گھروں تک محدود کیا۔ یہی اس ناول کا مرکزی موضوع ہے۔ درمیان میں مرزا صاحب کا ایک اچھا ٹیچر ہونا، دین کے فروغ میں حصہ لینا، خدمت خلق میں پیش پیش رہنا اور پھر حاسدوں کا ان کے خلاف محاذ کھولنا جیسے کئی چھوٹے چھوٹے واقعات ناول کو دلچسپ بناتے ہیں۔نغمہ کی پڑھائی کے خلاف گھر کی بزرگ دادی کا احتجاجی کردار اور مرزا کا اپنی بیٹی کو پڑھانے کا خواب پورا کرنا اور اپنے عزم پر قائم رہنا دادا یعنی دیوان صاحب کا حوصلہ بڑھانا جیسے کئی اور واقعات پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انل ٹھکر نے مسلم معاشرے کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور مشاہدات وتجربات کی روشنی میں اپنے ناول کے کرداروں میں جان پیدا کی ہے۔اور وہ نغمہ جسے پڑھانے کے لئے مرزا صاحب نے اپنا گھر اور اپنی ساری جدو جہد جو خدمت خلق کے جذبے سے کرتے رہے تھے۔انہیں چھوڑ کر ہبلی آنا نغمہ کی پڑھائی کے لئے اپنے خاندان کی مخالفت برداشت کرنا خاص طور پر دادی اور اپنی بیگم یعنی نغمہ کی ماں کو بہت سلیقے سے تعلیم کی اہمیت کو سمجھانا اور پھر مرزا جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کا خواب پورا ہو جاتا ہے۔نغمہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جاتی ہے،تو وہی خاندان والے جو کل تک اس کی پڑھائی کی مخالفت کرتے تھے۔اس پر فخر کرنے لگتے ہیں۔ابو الکلام آزاد نے کہا ہے جو شخص تعلیم کی مشکلات نہیں اٹھاتا،اسے جہالت کی ذلت اٹھانا پڑتی ہے۔مرزا صاحب نے نغمہ کو جہالت کے گڑھے سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کی بلندیوں تک پہنچا کر ایک ایسا کام کیا کہ نغمہ پر نہ صرف آنے والی نسلیں فخر کریں بلکہ نغمہ کی قربانیوں اور مرزا صاحب کی جدو جہد ایسا رنگ لائی کہ جب تک اسکولوں میں مخلوط تعلیم حاصل کرنے کا رواج نہیں تھا لیکن جب نغمہ نے اسکول میں داخلہ لیا تو لوگوں میں تحریک پیدا ہوئی اور دیگر لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔اس طرح نغمہ نے وہ کر دکھایا جو پورے سماج میں اسے نہ صرف عزت وقار حاصل ہوا بلکہ اس کے پیچھے چلنے کے لئے لڑکیوں کا ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ظاہر ہے کسی ایک کو تو قربانی دینا تھی۔آخر مرزا صاحب کی قربانی اور نغمہ کا اپنے والد کا خواب پورا کرنا،مسلم معاشرے کو آئینہ دکھانا تھا جو اس نے کر دکھایا۔جب کوئی شخص تعلیم کی اہمیت کو سمجھ لیتا ہے تو اس میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر انسانیت کی تعمیر وتشکیل میں وہ حصہ لینے لگتا ہے،لڑائی جھگڑے فساد سے دور رہتا ہے۔اس طرح دنیا میں امن وشانتی قائم کرنے میں سب سے زیادہ تعلیم کا ہی رول ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آج بھی تعلیم کا معیار اتنا بلند نہیں ہے جیسا کہ دوسرے ممالک میں خاص طور سے مسلم معاشرے میں تو آج بھی تعلیم کافی صد اتنا کم ہے کہ یہ قوم ترقی کے ہر میدان میں پیچھے رہ گئی۔ایک تعلیم ہی تو ہے جو آدمی کو قوم کو ترقی کی راہ پر لے جاتی ہے۔انل ٹھکر نے ایک مسلم معاشرے کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے نغمہ کے کردار کو ایک ایسی بلندی عطا کی ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہے،اس طرح انل ٹھکر جن کے دیگر ناول بھی انسانی قدروں کو زندہ جاوید بنانے میں ایک بڑا رول ادا کرتے ہیں۔یہ ناول بھی ان کے اچھے ناولوں میں شمار کیا جائے گا۔ہاں ناول میں کہیں کہیں جہیز سے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے لیکن یہ بات بھی سب جانتے ہیں،یہ لین دین کا معاملہ زیادہ تر ہندو قوم میں ہوتا ہے۔مسلمانوں میں نہیں اور کہیں یہ ہوتا بھی ہے تو صرف ہندو قوم کے اثرات کی وجہ سے بہت سی رسمیں آ گئی ہیں جیسے توہم پرستی وغیرہ۔ورنہ اسلام کا ان باتوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

انل ٹھکر نے اپنے اس ناول میں جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یقیناً بہت اہم ہے وہ یہ کہ بے شک اسلام نے عورت کو عزت دی،مقام دیا لیکن مسلمانوں نے نہیں۔

''ابنِ آدم''

خواب و خیال کی دنیا
حسن و جمال کی دنیا
افسوس! ابنِ آدم نے
کر دی وبال کی دنیا

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

''سوہنا روپ سنگھار''

نوید سروش
(میر پور خاص)

ہر بڑا شاعر اپنے عہد کا شعور ہوتا ہے اس کا کلام اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی ناہمواریوں کے ردِ عمل کے طور پر بھی سامنے آتا ہے۔ تشبیہات اور استعاروں، رمز و کنایوں کی زبان میں بھی اپنی بات مختلف انداز سے شعرا کہتے ہیں۔ بڑے شاعر کو سمجھنے کے لیے اُس کے حالاتِ زندگی، اُس کا عہد اور اُس عہد کا سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر کا جاننا بہت ضروری ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک آفاقی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے چند عظیم شعراء کی طرح ہر عہد کی آواز ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں سندھ کی تاریخ شاہ صاحب کے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات، اُن کا پس منظر اور سندھ کی لوک داستانوں کا بغور مطالعہ از حد ضروری ہے کیونکہ شاہ بھٹائی نے عظمتِ انسان کے لیے جو آواز اٹھائی اور جدو جہد کی اُس کا براہِ راست تعلق سندھ کی لوک داستانوں کے کرداروں سے ملتا ہے یا ان کرداروں میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ شاہ بھٹائی نے عشق کرنے والے کرداروں کو علامتی طور پر استعمال کر کے ان کی معنویت کو گہرا اور وسیع کر کے اپنی شاعری کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اپنی زمین اور زمین پر بسنے والوں کے لیے شاہ بھٹائی کے کلام میں خلوص اور اُنسیت کے ایسے پھول کھلے ہوئے ہیں جن کی خوشبو آج بھی سندھی زبان اور ادب کے ایوانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ''سُر دیسی'' کی ساتویں داستان کے یہ مصرع ملاحظہ ہوں:

ایسا کوئی سبب بنا کہ، بے بس ہو گئی برھن
کیسے دشت کے پار میں پہنچوں، بن تیرے اے ساجن
تھام کے تیرا دامن، میں گزروں ہیبت ناک جبل سے
(ترجمہ: آغا سلیم)

شاہ بھٹائی کے کلام میں انسان دوستی اور عظمتِ آدم کا درس جس پیمانے پر نظر آتا ہے وہ سندھ کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ ''انسان دوستی'' یا ''عظمتِ آدم''، ہم یہ دو لفظ یا ترکیب بہت آسانی سے کہہ کر آگے نکل جاتے ہیں ان لفظوں پر غور نہیں کرتے انہی لفظوں کے عملی اظہار سے زمین پر بسنے والوں کے درمیان محبت و اپنائیت، امن و آشتی، بھائی چارہ اور مساوات کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام میں سُر کلیان کے ''موکھی اور متارے، سُر ابری کے ''سسی پنھوں''، سُر کاموڈ کے ''نور جام تماچی''، سُر مارئی کے ''عمر ماروی'' اور دیگر لوک داستانیں اور اُن کے کردار سندھ کے سنہری محبت، دل کش ثقافت، ایثار و قربانی اور انسان دوستی کا استعارہ ہیں۔ یہ سب کردار اور ان جیسے ہزاروں کردار، محبت، جدو جہد، امن اور عظمتِ آدم کی علامت ہیں۔ یہ کردار شاہ صاحب کے کلام میں، اس زمین پر حرکت و عمل کے ساتھ زندہ رہنے کا جواز ہیں۔

عاشق سولی پہ چڑھتے ہیں، دن میں سو سو بار
پریت کی ریت کو بھول نہ جانا، دیکھ کر نیزے دار
جا تو اب اُس پار، پنپ رہی ہے پریت جہاں پہ
(ترجمہ: آغا سلیم)

سُر ''کاموڈ'' کی داستان کا ایک ایک بول ظاہر کرتا ہے کہ محبت زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے اور اس مقصد پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ جام تماچی نے کیا بقول تاج قائم خانی مرحوم:

''موجودہ ترقی پذیر عالمی تناظر میں دیکھیں تو سُر ''کاموڈ'' جہاں ایک طرف دنیا کے اہلِ اقتدار کو خوش حالی کا علم بردار بننے کا پیغام سناتا ہے وہاں دوسری طرف خواتین کو نوری کی طرح سادگی اور انکسار کے ساتھ اپنی کمزوریوں کا احساس رکھنے والی عورت کا کردار اپنانے کا درس بھی دیتا ہے۔''

اس سُر کا ہر بیت ہر مصرع محبت کا پیام ہے جو شاہ صاحب نے نوری اور جام تماچی کے کرداروں میں بڑے خلوص سے تلاش کیا ہے۔

جنم لیا نہ جام نے اور، نہ ہی جنم دیا
اونچی نیچی ذات نہ دیکھی، سب کو اپنایا
لَم یَلِد وَلَم یُولَد، وصف ہے ایسا
کبر اور کبریا، تخت تماچی جام کا
(ترجمہ: آغا سلیم)

سُر ''ماری'' میں بے لوث محبت، اپنی زمین، اپنے لوگوں سے اپنائیت کا احساس اور نیک مقاصد کے لیے جدوجہد سے بھرپور اس داستان کا رنگ اجرک کے رنگوں کی طرح کھِلتا ہوا ہے۔

کروں گی اب کیا جی کر، قید میں ہوں محتاج
آنکھیں دیکھیں دیس کی جانب، خود سے آئے لاج
دوش کسے دوں آج، قسمت قید میں لائی

ماری اور مارو کے حوالے سے ایک منفرد اور روشن وائی ملاحظہ کیجیے:

مارو ساجن میرا، میں مارو کی سجنی
میلے محل میں منہ نہ دھوؤں، اُجلا میرا صحرا
منہ دھویا تو طعنہ دے گا، میرا مارو اُجلا
اشکوں سے ہی منہ دھولوں گی، تن من اُجلا سارا

سُر ''سسی ابری'' کی پوری داستان نغمۂ محبت، رکھ رکھاؤ اور انسان دوستی سے لبریز ہے اس داستان میں انسان کے باطن کی صفائی اور روح کی

پاکیزگی کی طرف خصوصیت کے ساتھ اشارے موجود ہیں:

پریت سدا ہو قائم ، توڑ نہ پریت کا بندھن
روزِ اول سے سنگ ہے تیرے سسّی! تیرا ساجن
پریت سدا ہو قائم، توڑ پریت کا بندھن
پریت ہے جیسے کستوری، تو مہکا اپنا تن من

شاہ صاحب کے کلام میں ایک ''سُر گھاتو'' ہے یہ مختصر داستان عزم و حوصلے اور جدوجہد کی ایسی سبق آموز کہانی ہے جو مظلوم انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے بقول علامہ اقبال:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

یہ داستان انسان کے دکھ سکھ اور ہر قیمت پر ثابت قدم رہنے کی کہانی سناتی ہے:

لوٹ کے گھر نہ آئے، دور گئے منجدھار میں گھاتو
نہنگ کو ایسے مارو یارو! اور کو پھر نہ ستائے
جال کہاں کس جا ہے کشتی، کوئی تو کھوج لگائے
کہے لطیف، سنورے مانجھی، ہر اک پار ہی جائے

ایک معروف سُر ''مومل'' رانو ہے یہ لوک داستان پندرھویں صدی سے تعلق رکھتی ہے یہ دو دلوں کی با حوصلہ اور پاکیزہ محبت کی داستان ہے ان دو دلوں کا یقین تھا کہ ایک ساتھ جینا مرنا ہے جی تو نہیں سکے دونوں نے آگ میں کود کر اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ یہ ایک مخصوص راگ کا حامل سُر ہے۔

سُر ''سارنگ'' موسمِ برسات کا راگ ہے جس میں سندھی دھرتی خصوصاً تھر کی عورتیں برسات میں اپنے محبوب کی جدائی کا اظہار کرتی ہیں انہیں یاد کرتی ہیں۔ یہ سُر کیفیت گیت کے ذرا قریب محسوس ہوتی ہے۔ اس سُر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جدائی کا دُکھ اور ملن کی خوشی دونوں عنصر نمایاں ہیں۔ سندھ کے دیہاتوں میں ہندو مسلم اپنے بچوں کے نام سارنگ بڑی محبت سے رکھتے ہیں اس سے ایک بھائی چارے کی فضا قائم ہوتی ہے۔

سُر پورب جدائی اور محبت کے غم و الم کو ظاہر کرتا ہے یہ خالص مشرقی کلاسیکی راگ ہے اس سُر میں دو داستانیں ہیں۔ جب شوہروں کی اپنے وطن سے مشرقی حصّے کی جانب روانگی، سندھ دھرتی میں مقیم اُن کی بیویاں اپنے شوہروں اور لڑکیاں اپنے عاشقوں کی جدائی میں تڑپتی ہیں اور بصورت گیت اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتی ہیں اس سُر میں ملن کا پیغام ہے۔ اس راگ کی وہی کیفیت ہے جو خالص ہندوستانی صنفِ گیت کی ہے۔ یہ راگ پورے ماحول میں ایک پُر کشش غم و افسوس نمایاں کر دیتا ہے۔ شاہ صاحب کے کلام میں دیگر اہم سُر بھی انفرادیت کے ساتھ ساتھ ایک مختلف کیفیت اور مزاج رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب نے معاشرے کے بنیادی مسائل، انسان کے بنیادی حقوق اور انسان کی عظمت کے لیے عملی جدوجہد کے لیے بھی قدم اُٹھایا۔ ایک اہم واقعہ اس بیان کی دلیل کے لیے کافی ہوگا۔ کلہوڑوں کے عہد میں شاہ صاحب کا کلام ہر سو پھیل چکا تھا۔ اُس وقت سندھ کا معاشرہ سماجی طور پر جاگیرداروں کی گرفت میں تھا کچھ حلقے مذہبی لوگوں کے زیر اثر تھے۔ صاحبِ اقتدار و اختیار، غریب و مظلوم عوام کے پیسوں پر پُر آسائش زندگی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ عیش و عشرت کے مقابلے میں غریب، افلاس کا شکار تھے ایسے میں جھوک کے صوفی شاہ عنایت نے مظلوموں کے مسائل کو سمجھ کر اُن کے جذبات کو زبان دینے کی کوشش کی تو سندھ کے زمینداروں کو شاہ عنایت کی یہ ادا پسند نہیں آئی اور اُن کے خلاف دربارِ دہلی میں درخواستیں ارسال کیں، جواب میں ٹھٹھہ کے حاکم اعظم خان اور کلہوڑا حکومت کو شاہ عنایت کو ختم کرنے کا حکم مل گیا لہٰذا جوک شریف پر حملہ کر کے صوفی شاہ عنایت کو شہید کر دیا گیا۔ شاہ بھٹائی نے اس زمانے کے مظالم کے خلاف احتجاج کا یہ طریقہ اپنایا کہ انہوں نے دنیا کو ٹھکرا کر ریت کے ٹیلے (بھٹ) کو اپنا مسکن بنالیا اور پھر اس عہد کے سیاسی، اخلاقی اور سماجی منظر نامے پر اپنا ردِ عمل شاعری میں ظاہر کیا اور یہ کلام اثر انداز بھی ہوا۔

سارا جہاں منصور ہے تو کس کس کو سولی پر لٹکائے گا

ایسا کلام ردِ عمل کی بھرپور آواز ہے ذرا غور فرمایئے تو شاہ صاحب کے کلام میں انسان کی عظمت اور وقار کے لیے باغی کردار بھی نظر آتے ہیں بقول پروفیسر حیدر علی لغاری:

''بغاوت حیات کی ایک زندہ و تابندہ قدر ہے اس میں جدت، جرأت اور شجاعت کے جوہر پنہاں ہیں اس طرح بغاوت ارتقا اور ترقی کی ضمانت ہے۔'' (ترجمہ: شہناز شورو)

شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک عظیم شاعر تھے جن کے کلام میں سندھ کی ثقافتی تاریخ منظوم ہے۔ ''شاہ جو رسالو'' میں جہاں ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے وہاں مستقبل کے امکانات بھی روشن ہیں۔ ''شاہ جو رسالو'' محبت، ایثار، انسان دوستی اور تہذیبی اقدار کا مینارۂ نور ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سندھ کی دھرتی کو امن و آشتی کا گہوارہ اور انسان دوستی کا مسکن بنایا جائے۔ اس کے لیے کلامِ شاہ بھٹائی کے سچے اور دل نشین سُروں کو اپنے اندر اُتارنا ہوگا اس کے لیے سندھی زبان و ثقافت کو ہر قسم اور ہر سطح کے تعصبات سے بالاتر ہو کر اپنانا ہوگا تا کہ ہم ''شاہ جو رسالو'' کی روح کو سمجھ سکیں مگر افسوس ہم ذہنی غلامی کا اس قدر شکار ہیں کہ وزیٹنگ کارڈ سے لے کر خوشی و غمی کی چھوٹی بڑی تقریبات کے دعوت نامے اردو یا سندھی کے بجائے انگریزی میں چھپوا کر نہ جانے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ رویہ بدلنا ہوگا۔

''شاہ جو رسالو'' پڑھ کر دیکھو غور سے اک بار
کافی ہو یا بیت ہر اک میں امن، وفا اور پیار
شاہ صاحب کے سچّے سُر اور میٹھے بول سروش
سندھ کی سوہنی دھرتی کا ہیں سوہنا روپ سنگھار

☆

''کسک میرے دل میں رہے گی''

(امرتا پریتم کی بارہویں برسی)

فخر زمان (لاہور)

''جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور پنجابی ادب پڑھنا شروع کیا تو امرتا پریتم کی شاعری کی کتاب ''نویں رُت'' بہت اچھی لگی۔ دراصل مجھے اس سے انسپریشن ہوئی کہ اپنی ماں بولی میں لکھنا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے پنجابی کے چند صوفی شعراء کو پڑھا ہوا تھا۔ امرتا پریتم کی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا بعد میں میں نے ان کی بہت سی تحریریں پڑھیں۔ یونیورسٹی کے بعد میں تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا گیا اور واپس لوٹا تو پنجابی طرف رجوع کیا۔ اردو اور انگریزی میں تو پہلے ہی لکھنا شروع کیا تھا لیکن اب پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ میری پہلی کتاب ''کنسو ویلے دی'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ میں نے یہ کتاب امرتا پریتم کو بھیجی۔

دور درشن سے نشر ہونے والا پنجابی ادبی پروگرام ''درپن'' جو امرتا پریتم پیش کرتی تھیں میں بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ ایک شام امرتا پریتم نے میری کتاب ''کنسو ویلے دی'' کی شاعری پر بات شروع کی اور کہا ''یہ بہت اچھی شاعری ہے۔ یہ نظمیں بالکل نئے شعور اور نئے احساس Sensibility کی ہیں اور اب تک ہونے والی شاعری کو ایک نیا ٹرینڈ اور ایک نئی شکل دی ہے۔ اس میں جدیدیت ہے۔ بہت گہری ایمائیت اور سمبولزم ہے۔ انہوں نے مجھے ٹیلی ویژن کے ذریعے مبارکباد دی۔ میں نے انہیں خط لکھا اور شکریہ ادا کیا۔ میرے خط کے جواب میں امرتا پریتم جی نے کہا ''مجھے تمہاری کتاب ملی، میں نے پڑھی اور مجھے پسند آئی۔ جو چیز مجھے پسند آئے تو میں اس پر کھل کر اظہار کرتی ہوں۔''

اس کے بعد میری دوسری پنجابی شاعری کی کتاب ''ونگار'' شائع ہوئی پھر میرا ناول ''ست گواچے لوگ''۔ امرتا پریتم کو اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے ٹی وی پر اس کا بہت ذکر کیا۔ اس کے بارے میں آرٹیکلز لکھے۔ پھر میرا دوسرا ناول ''اک میرے بندے دی کہانی'' ''ہر''بندی دان'' اور پھر ''بے وطنا'' انہیں بھیجا۔ اس دور میں ہندوستان سے آمدورفت بند ہوگئی تھی۔ صرف خط وکتابت جاری تھی۔ ڈاک پر گہرا سینسر تھا۔ اس لیے جب میں ملک سے باہر ہوتا تو امرتا پریتم کو خط لکھتا اور ٹیلی فون پر بات ہوتی تو وہ بڑی خوشی کا اظہار کرتیں۔

مجھے امرتا پریتم کی تمام تحریریں پڑھنے کے بعد ان کے متعلق پوری جانکاری حاصل ہوگئی۔ خاص طور پر ۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والی ان کی سوانح عمری ''رسیدی ٹکٹ'' اور پھر ۱۹۷۷ء میں سوانح عمری کا دوسرا حصہ ''میں جمع توں''۔

''رسیدی ٹکٹ'' نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ بہت سارے لوگوں نے اعتراض کیا کہ انہیں بعض باتیں نہیں لکھنا چاہیے تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل ان کے ہاں منافقت نہیں۔ وہ ہر بات سیدھے پیرائے میں کردیتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم پر فرقہ وارانہ فسادات میں قتل وغارت ہوئی اس پر امرتا پریتم کو اس کی نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول'' نے پنجابی شاعری میں امر کردیا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ''سنیہڑے'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا اور پھر ۱۹۶۹ء میں انہیں پدم شری کا ٹائٹل دیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں انہیں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ امرتا پریتم ورلڈ پیس کانگریس ۱۹۷۳ء کے موقع پر ماسکو گئیں۔ اس سے پہلے ۱۹۶۱ء میں امرتا پریتم ماسکو کے رائٹر یونین کی دعوت پر تاشقند، تاجکستان، ازبکستان اور ۱۹۶۶ء میں بلغاریہ اور ۱۹۶۷ء میں حکومت نے انہیں ماسکو میں ثقافتی تبادلے کے سلسلے میں یوگوسلاویہ، ہنگری اور رومانیہ بھیجا تھا۔

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو باقاعدہ ایک تقریب میں امرتا پریتم کو نکولا واپسا روف ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ کمپنی کے صدر پنچو دان چیف نے اپنی تقریر میں کہا ہم بلغارین ادیب اور سب لوگ خوش ہیں کہ ہندوستان کی ممتاز اور مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہماری دوست ہے، امرتا پریتم کی شادی ساجی شعور اور انسانی بہتری کے لیے جدوجہد کو تسلیم کرتی ہے۔

۱۹۸۳ء میں امرتا پریتم کو وشو بھارتی یونیورسٹی اور جبل پور یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ ۱۹۸۶ء کو امرتا پریتم راجیہ سبھا کے لیے نامزد ہوئیں۔ یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے۔ میں ملک سے باہر ہالینڈ میں تھا مجھے پنجابی کی نامور فکشن رائٹر جیت کور نے دہلی میں ہونے والی دو روزہ ''پنجابی کہانی کانفرنس'' کے لیے دعوت دی۔ میں دہلی پہنچا۔ کانفرنس کے بعد امرتا جی کو فون پر بتایا کہ میں دہلی میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ فوراً میرے گھر چلے آؤ۔ میں K-25 حوض خاص ان کے گھر گیا اور تین دن اور تین راتیں وہاں گزاریں۔ وہ لمحے میری زندگی کے سنہری لمحات میں شامل ہیں۔ امرتا پریتم سے مختلف حوالوں سے ادب، سیاست اور تصوف پر گفتگو ہوئی۔ پنجابی زبان ادب اور ادیبوں کے بارے میں۔ ہندو پاک تعلقات کے حوالے سے تبادلۂ خیال ہوا۔ انہیں جنرل ضیاء کے دور میں میری پنجابی کتابوں پر پابندی کا علم تھا۔ جب میں نے اپنے ناول ''بندی دان'' کی ڈرامائی تشکیل دیکھنے کے لیے کہا تو انہوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کتابوں پر پابندی کے باوجود آپ نے اسے ڈرامے کے روپ میں کیسے پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب ضیاء الحق نے چار دیواری کے اندر ادبی ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی تو ہم نے پہلی عالمی پنجاب کانفرنس لاہور ۱۹۸۶ء کے موقع پر ڈرامہ گھر کی چار دیواری میں دکھایا۔ ایک دوست نے اس ڈرامے کی وڈیو ریکارڈنگ کرلی۔ یہ ریکارڈنگ گھریلو وڈیو سے کی گئی تھی اس لیے تکنیکی اعتبار سے کمزور ہے۔ بہرحال ایک دستاویز تو ہے۔ امرتا پریتم نے کہا میں نے ناول ''بندی

دان'' پڑھا ہے لہٰذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کتنے دل گردے والے شخص نے کی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے ناول کا ایک ایک کردار درد کی چبھن بن کر آنکھوں سے بہتا گیا۔ ڈرامائی تشکیل ممتاز ادیب احمد سلیم نے کی تھی۔ اردو ادیبوں نے دوسرے دن ''قلم زار'' تنظیم کی طرف سے مجھے استقبالیہ دیا جہاں اردو کے ادیب قمر رئیس کی صدارت تھی اور مہمان خصوصی کے لیے امرتا پریتم سے کہا گیا تھا۔ امرتا پریتم عام طور سے گھر سے نہیں نکلتی تھی اور ادبی تقریب میں تو وہ بالکل نہیں جاتی تھی انہوں نے مہربانی کی کہ مہمان خصوصی بننے پر رضامند ہوئیں بلکہ اس تقریب میں میری شاعری اور ناولوں خاص طور پر'' بندی دان'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا'' فخر زمان اپنے ناول'' بندی دان'' میں زیڈ کا کردار پیش کرتے ہیں تو زیڈ کہتا ہے کل جو انسان قتل ہوا تھا وہ بھی میں تھا۔ آج جو قتل ہو رہا ہے وہ بھی میں ہوں، آنے والے کل میں جو قتل ہوگا وہ بھی میں ہوں گا۔'' میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت میرا یہ عالم ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ وہ زیڈ'' فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔''

میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میں تو ویسے ہی امرتا پریتم جیسی شخصیت کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا فخر محسوس کر رہا تھا۔ امرتا پریتم پچھلے پہر آرام کرتی تھیں۔ ہم شام کو بیٹھ جاتے تھے پھر باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر ہوتا۔ میرے اصرار پر وہ کوئی نئی نظم سناتیں۔ وہ رشیوں، منیوں، صوفیوں اور درویشوں کے حوالے سے اپنے تجربات، مشاہدات کا ذکر کرتیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے ایک دوڈاکومنٹریز دکھائیں۔ جو بہت ہی خوبصورت بنی ہوئی تھیں۔ میرا مطلب ہے تین دن پورا میرے لیے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ بالکل جیسے آپ اپنے Parents کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح امرتا جی دوپہر کا کھانا پکار رہی ہیں، روٹیاں بنا رہی ہیں، امروز وہیں باورچی خانے میں میز پر روٹیاں رکھ رہا ہے، سالن رکھ رہا ہے۔ مطلب یہ کہ بالکل اپنے گھر کے فرد کی طرح میں وہاں رہا۔

میں نے کہا آج کل آپ شاعری بہت کم کر رہی ہیں اور آپ نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کی ہندی میں شاعری'' کاغذ اور کینوس'' شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا: شاعری میں نے ویسے ہی بہت زیادہ محسوس کی۔ جب محسوس کرتی ہوں شاعری کرنی چاہیے تب میں شاعری کرتی ہوں۔ میں کبھی زبردستی Conscious Effort نہیں کرتی کہ کوئی نظم لکھوں۔ ہندی کی بہت ریڈرشپ ہے اس لیے ہندی میں لکھنا بہت ضروری ہے۔

۱۹۸۷ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور اسی سال فرانس نے بھی انہیں اعزازی ڈگری سے نوازا جبکہ ۱۹۸۹ء میں بمبئی کی ایس این ڈی یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی اور ۱۹۹۰ء میں پنجابی اکیڈمی دہلی نے انہیں وارث شاہ ایوارڈ دیا۔ امرتا پریتم ایک بہت عمدہ شخصیت تھیں۔ ایک بہت بڑی انسان، فراخ دل اور امن کی پرچارک، محبت کے پیغامبر اور بہت ہی روشن خیال اور ترقی پسند نظریات کی حامل خاتون تھیں جس نے روایت کی اس طرح پاسداری نہیں کی جس طرح ہمارے ہاں روایتی کھوبہ (دلدل) میں لوگ دھنسے ہوئے ہیں اور ساری زندگی ایک غلط اور جھوٹے قسم کے ڈسپلن کے تحت گزارتے ہیں۔

امرتا پریتم نے ساری زندگی ڈسپلن توڑے اور روایات سے بغاوت حاصل کی، اسی لیے زندگی میں انہیں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ زن دگی میں انہیں امروز کی صورت میں اچھا رفیق دوست اور ہمسفر ملا۔ امروز سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں ہوئی اور دوستی ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ ایک ہو گئے۔ دونوں نے مل کر'' ناگ منی'' ماہنامہ پنجابی رسالہ اور اشاعت گھر بنایا۔ '' ناگ منی'' رسالہ ۱۹۶۶ء میں شروع ہوا اور اپریل ۲۰۰۴ء میں بند ہوا۔'' ناگ منی'' کے حوالے سے میں نے امرتا پریتم اور امروز کو اکٹھے کام کرتے دیکھا۔ میٹر کا انتخاب امرتا کرتیں۔ پروف اور سکیچز امروز کی ذمہ داری تھی۔ یہ چھوٹا سا رسالہ بڑا معیاری اور پاپولر رہا۔ اس رسالے نے اپنا ایک پورا گروپ پیدا کیا جو اعلیٰ ادب تخلیق کر رہا تھا۔

ایک بات اور جوان میں سب سے زیادہ اچھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ وہ بڑی فراخ دل تھیں۔ کوئی بھی لکھنے والا چاہے وہ پاکستان میں تھا یا ہندوستان میں تھا یا کہیں دوسرے دیس اور ملک کا اور زبان چاہے کوئی بھی لکھتا تھا اچھا لکھنا ہی ان کی شرط تھی اور ان کی تعریف اور اس کے متعلق لکھنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔

میں نے جب بھی انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی انہوں نے کہا میری صحت اجازت نہیں دیتی۔ جب کبھی مجھے موقع ملا میں ضرور پاکستان میں آؤں گی۔ میری یہ ہمیشہ حسرت رہی کہ وہ پاکستان آئیں۔

مجھے یاد ہے شائستہ، فرخ اور میں جب ہندوستان گئے اور امرتا پریتم سے ملے وہ شائستہ سے پہلی بار مل رہی تھیں لیکن انہوں نے اس کی شاعری کو اپنے رسالے میں بہت زیادہ شائع کیا تھا کیونکہ انہیں شائستہ کی شاعری بہت پسند تھی۔ انہوں نے شائستہ سے مل کر بہت سی باتیں کیں۔ عورتوں کے حوالے سے Male Dominated Society کے حوالے سے تبادلۂ خیال کیا۔ شائستہ بہت خوش تھی کیونکہ ایک بڑی شاعرہ اس کی شاعری کے بارے میں اچھے کلمات کہہ رہی ہیں۔

جب فروری ۲۰۰۰ء میں غسل خانے میں امرتا پریتم کے پاؤں پھسلنے سے پاؤں میں ایسی چوٹ آئی کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔ ۸۱ سال کی عمر میں ہڈی کا ٹوٹنا بڑی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دو گھنٹے کا آپریشن پانچ گھنٹے میں مکمل ہوا۔ امرتا پریتم گھر آئیں انہیں امید تھی کہ وہ پھر سے چلنے پھرنے لگیں گی لیکن چند دنوں کے بعد دوبارہ ان کے پاؤں میں پھر سے تکلیف شروع ہوئی اور پھر اس کے بعد امرتا پریتم بستر پر ہی رہیں۔

باقی صفحہ ۶۹ پر ملاحظہ کیجیے

پولیو

(فالج الاطفال)

ڈاکٹرفیروزعالم

(کیلیفورنیا)

اس مضمون کوحوالہءقلم کرتے ہوئے میرادل غم سے بوجھل ہےاس لئے کہ موجودہ دور میں کسی بھی مہذب وترقی یافتہ ملک میں اس مضمون کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مرض بڑی حدتک دنیاسے نیست ونابود کردیا گیا ہے مگر گزشتہ سالوں میں عالمی انجمن صحت نے پاکستان کودنیاکے ان معدود چندمما لک میں شامل کیا ہے جہاں یہ مرض وبائی صورت اختیار کرگیا ہےاور پاکستان باقی دنیا کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکا میں میرے ہم وطنوں کے ذہن میں اس مرض کے متعلق کئی سوال ابھرتے ہونگے اس لئے اس مضمون کے ذریعہ میں انہیں اس مرض کے سلسلے میں معلومات بہم پہنچاناچاہتاہوں۔

پولیوکیاہے

ہم میں سے تقریباً ہرشخص نے کراچی یالاہورکی سڑکوں اور چوراہوں پرٹیڑھی میڑھی ٹانگوں والے بچوں کوگھسٹتے ہوئے بھیک مانگتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا، یہ بچے پولیوکاشکار ہیں۔بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک یہ پوری دنیاکے لئے ایک انتہائی دہشت ناک مرض تھا جس سے لاکھوں بچے معذور ہو جاتے تھے۔یورپ اورامریکامیں یہ ایک خاص موسم میں وبائی صورت میں پھیلتا تھااور اسکے تدارک یاعلاج کے سلسلے میں انسان لاچار و بے بس تھا۔امریکا کا صدر فرینکلن روز ویلٹ بھی اسکاشکار ہوکر پہیوں والی کرسی میں مقید ہوگیا تھا۔ذاتی طور پرمیرےایک قریبی دوست کی بہن اس مرض میں مبتلا ہوکراپاہج ہوچکی ہیں۔

پولیوایک متعدی مرض ہے جوجسم میں ایک وائرس کے داخلے کی وجہ سے ہوتا ہے۔وائرس جس پرمیں تفصیل سے کسی دوسرے موقعہ پرروشنی ڈالوں گاایک انتہائی چھوٹازندہ جرثومہ ہے جس میں خودکوتقسیم کے ذریعہ ڈپلیکیٹ کرنے کی صلاحیت موجود ہے یہ جسم میں داخلے کے فوراًبعد تیزی سے تقسیم درتقسیم ہوکر لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد اختیار کرلیتاہے۔اس میں خوداپنی غزائیات یا توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ جسم کے خلیات میں پیوست ہوکرغذا حاصل کرے جسکی وجہ سے یہ خلیات تباہ ہوجاتے ہیں۔اس کوخاص طور سے اعصابی خلیات (neurological cells) سے رغبت ہےاور یہ انکوتباہ کرتا ہے۔ایک دفعہ تباہ ہونے کے بعد یہ خلیات دوبارہ زندہ یاپیدانہیں ہوسکتے اس لئے ایک دفعہ پولیوکاشکار ہونے کے بعد اس سے جو نقصان ہوتاہے وہ ناقابل علاج ہے۔

اس وائرس کے جسم میں داخلے کی خاص وجہ مونہہ کے ذریعہ ایسی غذا کااستعمال ہے جس میں "انسانی فضلہ" ملا ہوا ہو۔پسماندہ مما لک میں اسکے پھیلنے کی یہی وجہ ہے کہ وہاں صاف پانی یاانسانی فضلے سے پاک غذا میسرنہیں۔اس کے علاوہ غذا اور قوت مدافعت کی کمی بھی اس وائرس کے پھیلنے میں مدگار ہوتے ہیں۔اس وائرس اور بیماری کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ یہ صرف انسانوں میں ہوتی ہےاورانسان ہی سے انسان تک پھیلتی ہے۔

پولیوکی بیماری
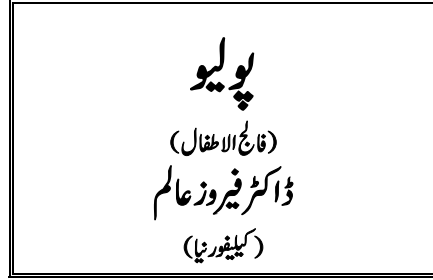
پولیو بڑی حد تک صرف بچوں کی بیماری ہے۔ایک دفعہ مونہہ کے ذریعہ جسم میں داخل ہوکر یہ وائرس آنتوں کے خلیات میں پیوست ہوتا ہے اورانکو تباہ کرکے خون میں شامل ہوجاتا ہے۔خون کے ساتھ یہ گردش کرتا ہواجسم کے مختلف حصوں میں پہنچتا ہے اور آخر کاراپنی پسندیدہ جگہ یعنی حرام مغز کی بتی (spinal cord) میں اپنامقام بناکراسکے خلیات کوتباہ کردیتا ہے۔ابتدائی مرحلے میں جب یہ خون میں گردش کررہا ہوتا ہے اسکی علامات عام سی یعنی بخار،جسم ٹوٹنااور کمزوری ہوتی ہیں۔جب حرام مغز کی بتی پرحملہ ہوتا ہے تو اچانک کسی ایک ہاتھ، ٹانگ یا دونوں ٹانگوں میں اچانک شدید کمزوری ہوتی ہےاورٹانگ کے عضلات بہت نرم اور ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔چند گھنٹوں میں متعلقہ عضومکمل طور پرمفلوج ہوجاتا ہے۔ اس مرحلہء پراسکا کوئی علاج ممکن نہیں۔تباہ کن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو یہ عضو بڑھ نہیں پاتااور ہمیشہ کے لئے چھوٹااورٹیڑھامیڑھارہ جاتا ہے۔

علاج

میں نے اوپر درج کیا ہے کہ پولیو کا کسی بھی اسٹیج میں کوئی علاج نہیں۔دراصل پولیووائرس کی بیماری ہےاور کچھ سال پہلے تک وائرس کی کسی بھی بیماری کا کوئی علاج نہیں تھااس لئے دنیامیں وائرس سے ہونے والی بیماریوں نے دہشت ناک تباہیاں پھیلائی ہیں۔مغربی مما لک میں جنکے سرپرانسانیت کے بہت سے دکھوں کا مداوا کرنے کا سہرا ہے ان بیماریوں پرریسرچ اور انکے علاج یا تدارک کرنے کی ٹھانی اوران بہت سی بیماریوں کا تدارک کرنے میں کامیاب ہو گئے جن میں سب سے بڑی مثال چیچک اور طاعون ہے جوآج دنیاسے نیست و نابود ہوچکے ہیں۔انسانی تاریخ کا یہ نہایت اہم موڑ ہے جب سائنسدان سن پچاس کی دہائی میں پولیوکاعلاج تو نہیں مگر مکمل طور پر تدارک کرنے میں کامیاب ہوئے۔اس کے تدارک کی واحد وجہ پولیوکی ویکسین ہے۔

پولیوویکسین

پولیو کے تدارک کے لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہائیجین یعنی صفائی ستھرائی،انسانی فضلہ کی صحیح طور پرنکاسی،شفاف پانی کا حصول اور بچوں میں اچھی غذائیت کاانتظام کیاجائے۔مگر یہ بات واضح ہے کہ غریب اورپسماندہ مما لک میں یہ ممکن نہیں۔اس لئے اس وقت تمام دنیامیں حتیٰ کہ ترقی یافتہ دنیامیں بھی ویکسین اس موذی مرض سے بچاؤ کا سب سے بڑاذریعہ ہے۔انسانیت پراس احسان کا

سہرا دو امریکی یہودی ڈاکٹروں کے سر ہے۔ ویکسین کا طریق عمل اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ قدرت نے ہمیں بیماریوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ یہ ہماری قدرتی قوت مدافعت ہے۔ ہمارے خون میں ایسی پروٹین گردش کرتی ہیں جو جسم میں داخل ہونے والے مضر اجزا کو نیست و نابود کر دیتی ہیں یہ اینٹی باڈیز کہلاتی ہیں۔ اگر ہم کسی خاص جرثومے کے خلاف جسم میں ایسی اینٹی باڈیز کو پیدا کر سکیں تو یہ جرثومہ داخل ہوتے ہی ان اینٹی باڈیز کا شکار ہو کر تباہ ہو جائیگا اور بیماری پیدا نہیں کر سکے گا۔

پولیو کا وائرس تین قسم کا ہوتا ہے اور ہر ایک قسم شدید مہلک ہے۔ اسی وجہ سے اسکی ویکسین میں مشکلات تھیں۔ مگر ۱۹۵۲ میں امریکا میں پولیو کی زبردست وبا پھیلی جس میں باون ہزار بچے مبتلا ہوئے، تین ہزار موت کا شکار ہوئے اور اکیس ہزار اپاہج ہوئے۔ اس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کے تدارک کے لئے ہر یونیورسٹی سرگرم عمل ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں یونیورسٹی آف پٹس برگ میں ڈاکٹر جوناس ساک (jonas salk) نے پہلی کامیاب ویکسین تیار کی جسکا ٹیکا لگایا جاتا تھا۔ یہ ایک غریب اور کم پڑھے لکھے یہودی ماں باپ کا بیٹا تھا جو نیو یارک میں پیدا ہوا تھا مگر اسکے ماں باپ نے اسے ایک ہی سبق دیا تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ اس ویکسین کا تجربہ کانگو میں جہاں اس بیماری سے ہزاروں بچے معذور ہو رہے تھے، کیا گیا۔ اسکی کامیابی دیکھتے ہوئے ۱۹۵۵ میں امریکا میں اس کے استعمال کی اجازت مل گئی۔ اس میں یہ قباحت تھی کہ یہ انجکشن کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ اسکے لئے تربیت یافتہ عملے کی ضرورت تھی جو دنیا کے غریب ممالک میں کمیاب تھے۔

چند ہی سال بعد البرٹ سبین (albert sabin) نے ایسی ویکسین ایجاد کی جس کے قطرے مونہہ کے ذریعہ پلائے جاتے ہیں۔ البرٹ سبین ہم پاکستانیوں کی طرح تارک وطن تھا۔ وہ پولینڈ سے امریکا آیا تھا وہ بھی غریب اور یہودی محنت کش خاندان کا فرد تھا۔ اس نے نیو یارک یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی ذہانت کی بنا پر بہترین ریسرچ لیباریٹریز میں کام کیا تھا۔ اس نے پولیو کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ایسی ویکسین ایجاد کی جو موہنہ سے پلائی جا سکے اسکی ویکسین کو اجازت سے پہلے ایک سو (100) ملین لوگوں پر آزمایا گیا تھا جس کے بعد یہ موثر اور محفوظ پائی گئی تھی۔ چونکہ یہ ویکسین بہت سہل ہے اس لئے اب عالمی طور پر صرف یہی ویکسین استعمال کی جاتی ہے جس کی وجہ سے تمام دنیا حتی کے کئی پسماندہ ممالک میں بھی پولیو میں حیرت انگیز کمی واقع ہوئی ہے

ویکسین کے مضر اثرات

اگر چہ اس ویکسین نے دنیا کی تاریخ بدلنے کا کارنامہ انجام دیا ہے مگر ہر طریق علاج کی طرح اس کے بھی مضر اثرات ہیں۔ ڈاکٹری میں فوائد اور نقصانات کو تولا جاتا ہے اور کسی بھی علاج کو اس پیمانے پر جانچا جاتا ہے کہ انکا تناسب کیا ہے۔ ویکسین میں انسانی جسم میں مرض کا اصلی جرثومہ داخل کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ جرثومہ مردہ ہوتا ہے مگر کچھ ویکسینز میں ایسا جرثومہ استعمال کرتے ہیں جو اگرچہ زندہ ہوتا ہے مگر مختلف طریقوں سے اسکو نااہل بنا دیا جاتا ہے یعنی یہ بیماری پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پولیو کی ویکسین میں ایسا ہی نااہل جرثومہ شامل ہے۔ کبھی کبھی اس جرثومے میں یہ صلاحیت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ خود پولیو کی بیماری پیدا کر سکتا ہے جو بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ مگر چونکہ لاکھوں بچے اس ویکسین سے پولیو سے بچائے جاتے ہیں اس لئے یہ خطرہ جو لاکھوں میں صرف چند سو بچوں کو لاحق ہوتا ہے اس کی سفارش کی جاتی ہے کہ یہ قطرے ہر بچے کو پلائے جائیں۔ امریکا میں یہ لازمی ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ پاکستان میں طالبان کی جانب سے اسکی مخالفت اس واہمے کی وجہ سے ہے کہ یہ یہودیوں کی سازش ہے کہ بچے اسکی وجہ سے قوت تولید سے محروم ہو جائینگے، قطعئی طور پر بے بنیاد ہے۔

Person of the year

امریکہ میں قائم مصنوعی ذہانت کے جدید سسٹم UNU ٹائم میگزین کے لیے سال ۲۰۱۷ء کی Person of the year کی درست پیشن گوئی کی۔ سوارم نے ولادیمیر پیوٹن کا نام تجویز کیا تھا۔ یو این یو کی جانب سے جاری کردہ نئے نتائج تبدیل کرتے ہوئے پیش گوئی کی کہ ٹائم میگزین میں ٹوئٹر پر ہیش ٹیگ #Me Too استعمال کرنے والے افراد کو سال کی بہترین شخصیت قرار دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہیش ٹیگ اُن افراد نے استعمال کرنا شروع کیا تھا جنہیں اُن کی زندگی میں جنسی طور پر حراساں کیا گیا تھا۔ مصنوعی ذہانت نے دوسرے نمبر پر امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ تیسرے پر شمالی کورین رہنما کم جونگ اُن جبکہ صدر ٹرمپ کے الیکشن میں روسی مداخلت کی تحقیقات کرنے والے ایف بی آئی کے سابق ڈائریکٹر رابرٹ موکر کو تیسری ممکنہ شخصیت قرار دیا تھا جسے سال کی بہترین شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ٦۔ دسمبر کو ٹائم میگزین نے جب اپنا سالانہ شمارہ جاری کیا تو یہ بات سب کے لیے حیران کن ثابت ہوئی کہ یو این یو نے بالکل درست پیشن گوئی کی تھی اور ''خاموشی توڑنے والے افراد'' کو سال کی بہترین شخصیت قرار دیا تھا۔ سائنس میگزین کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بات حیران کن ہے کہ مصنوعی ذہانت کے ذریعے کسی ایونٹ کی درست پیش گوئی کی گئی ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ آرٹیفیشل انٹیلی جنس روزانہ کی بنیاد پر اپنی کارکردگی میں بہتری لا رہی ہے۔ اور درست نتائج فراہم کر رہی ہے۔

''بساطِ بشاشت''

چاپلوسی

چاپلوسی قوم کا ناسور ہے
سچ بتاؤں! ہر کوئی رنجور ہے

چاپلوسی قابلِ مذموم ہے
کرنے والا دائمی مغموم ہے

چاپلوسی کی کمائی ہے حرام
پاک روزی سے ہے برکت میں دوام

نہ کرو جھوٹی خوشامد شیخ کی
منفعت، شہرت کی خاطر شیخ کی

نوجوانو! چھوڑ دو ذلّت کا کام
اپنی محنت سے کرو حاصل مقام

جھوٹ، غیبت آج ہی سے چھوڑ دو!
چاپلوسی کی روش کو توڑ دو

چاپلوسی کو نصیحت ہے مری
کر لو توبہ آج سے سچی ابھی!

جاہ و منصب کے لیے انؔصر کبھی
چاپلوسی تم نہ کرنا چل ابھی

انؔصر نیپالی
(کھٹمنڈو)

نقشِ فریادی

مولوی بھی گالیاں بکتا ہے اعلیٰ قسم کی
جن میں تفصیلات آ جاتی ہیں، پورے جسم کی

مولوی بزم ظرف کو اس طرح گرماتا ہے
گالیاں بکتا نہیں ہے، گالیاں ''فرماتا'' ہے

ایک اک گالی بہ رنگِ مصرعۂ چرکین تھی
اصل میں سنگین، کانوں کے لیے رنگین تھی

گالیوں میں اک شکوہِ ندرتِ الفاظ تھا
اس نئے رنگِ سخن کا ساز بھی کیا ساز تھا

لفظ نازیبا تھے بولے جا رہا تھا، مولوی
''ہیومن باڈی'' ٹٹولے جا رہا تھا، مولوی

کردیا اندر کے رازوں کو نمایاں، بول کے
رکھ دیا، اسرارِ جسمانی کو اس نے کھول کے

چونکہ اس کارِ ہنر کا کوئی بانی ہی نہیں
یوں لگا اس فن میں اس کا کوئی ثانی ہی نہیں

گالیوں پر اک مقالہ تھا روانی کے بغیر
الغرض بہتا ہوا دریا تھا پانی کے بغیر

پیش اس نے کر دیا پھر بدکلامی کا جواز
میری گالی بھی ہے گویا مصرعۂ فیض و فراز

نثر میں لفظوں کی ، پامالی نہیں کہتے انہیں
جسم کے اعضاء ہیں یہ، گالی نہیں کہتے انہیں

جسم کے اندر گزرتی ہیں جو طبّی نالیاں
ڈاکٹر بولے تو جائز، ہم کہیں تو گالیاں

بدکلامی کے سبھی تیرِ ستم سہتے رہے
گالیوں کو سامعیں، گُل پاشیاں کہتے رہے

میرے کانوں کو مزا آنے لگا تقریر کا
''نقش فریادی تھا اُس کی شوخیِ تحریر کا''

خالدعرفان (نیویارک)

ایک صدی کا قصّہ

ششی کپور

دیپک کنول (ممبئی،بھارت)

امیتابھ بچن جب فلم انڈسٹری میں ہیرو بننے آیا تھا تو لوگ اُسکی شکل وصورت اور قدکاٹھی دیکھ کر اُسکا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔امیتابھ بچن نے بھی ٹھان لی تھی کہ وہ فلموں میں اپنی جگہ بنالے گا چاہے اُسے ایکسٹرا کا رول کیوں نہ کرنا پڑے۔ایک دن جب وہ جونیر آرٹسٹوں کی بھیڑ میں کھڑا تھا تو اُسکے سامنے ایک ہیرو کی گاڑی آکے رکی اور اُس نے اُسے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔گاڑی میں بٹھا کر اُس ہیرو نے امیتابھ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''تم ہری ونش رائے بچن کے بیٹے ہو۔تمہیں اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔تم یہاں ایکسٹرا کے رول کرنے نہیں آئے ہو بلکہ تم کچھ بڑا کرنے والے ہو۔میری بات گرہ میں باندھ کے رکھ لینا کہ ایک دن تم اتنی بلندی تک پہنچ جاؤ گے کہ تم خود اپنے آپ پر رشک کرنے لگو گے۔''اس ہیرو کی پیشن گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔وہ اور کوئی نہیں بلکہ ششی راج کپور تھا، پرتھوی راج کپور کا سب سے چھوٹا بیٹا ششی راج جسے ہم ششی کپور کے نام سے جانتے ہیں۔

ششی کپور کا جنم 18 مارچ 1938 کو کلکتہ میں ہوا۔وہ تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔راج کپور اُس سے عمر میں چودہ سال بڑا تھا جب کہ شمی کپور سات سال۔اُسنے بچپن سے اداکاری کا آغاز کیا۔پرتھوی راج کپور جو کہ ''پرتھوی تھیٹرس'' کے نام سے اپنی ڈرامہ کمپنی چلایا کرتے تھے،اُن کے کئی سارے ڈراموں میں ششی کپور نے حصہ لیا۔ششی کپور نے 1940 سے ہی بطور بچہ کلاکار کے طور فلموں میں ششی راج کے نام سے کام کرنا شروع کیا۔بعد میں اُسنے ششی راج کی جگہ خالی ششی نام رکھا کیونکہ اسی نام سے ایک اور اداکار دھارمک فلموں میں کام کرتا تھا۔1948 میں اسنے اپنے بڑے بھائی کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم ''آگ'' میں اُسکے بچپن کا رول ادا کیا۔اُس کے بعد اُسنے اشوک کمار کے بچپن کا رول فلم ''سنگرام'' میں ادا کیا جو کہ 1950 میں ریلیز ہوئی۔اُسے کامیابی فلم ''آوارہ'' سے ملی جس میں اُسنے اپنے بڑے بھائی کے بچپن کا رول بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔اس فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔ششی کپور نے جب ''آوارہ'' میں کام کیا تو اُسنے اپنی ماں کے پاس جا کر شکایت کی کہ راج بھیانے اُسے فلم میں کام کرنے کے پیسے نہیں دئے۔راج کپور نے دوسرے دن اُسے ایک مووی کیمرہ لاکر دیا جسے پا کر وہ ننھا بالک بہت خوش ہوا۔''آوارہ'' کے بعد اُسنے 1953 میں ریلیز ہونے والی فلم ''دانہ پانی'' میں بھارت بھوشن کے ساتھ کام کیا۔کل ملا کر اُسنے چار فلموں میں بطور چائلڈ آرٹسٹ کام کیا۔

چائلڈ آرٹسٹ کے بعد وہ اپنی پڑھائی کے ساتھ مصروف رہا۔پڑھائی ختم کرنے کے بعد اُسنے اپنے والد کے تھیٹر گروپ میں شمولیت اختیار کی۔اس سے پہلے راج کپور اور اُسکے بعد شمی کپور پرتھوی تھیٹر سے منسلک رہے۔وہ سب سے آخر میں پرتھوی تھیٹر سے جڑ گیا۔وہ اپنے والد کے ساتھ شہر شہر گھومتا رہا۔گھومتے گھومتے وہ کلکتہ پہونچ گئے جہاں وہ شو کرنے والے تھے۔

1956 میں اُسکی ملاقات جینیفر کینڈل سے کلکتہ میں ہوئی۔جینیفر کا والد جیفری کیڈل فوج میں کام کرتا تھا۔فوج کی نوکری سے فارغ ہو کر وہ ہندوستان گھومنے آیا۔ہندوستان اُسے ایسا بھا گیا کہ اُسنے ''شیکسپیرین گروپ'' نام کا ایک تھیٹر گروپ تیار کیا اور پھر اُس گروپ کو ہندوستان لے آیا اور یہاں اُنہوں نے کئی شہروں میں کامیاب شو کئے۔اتفاق کی بات یہ ہے دونوں تھیٹر کمپنیاں ایک ساتھ کلکتہ پہنچ گئیں۔پرتھوی تھیٹرس اور شیکسپیرین گروپ۔جینیفر بھی اپنی تھیٹر کمپنی شیکسپیرین گروپ کے ساتھ یہاں آگئی تھی جب کہ ششی کپور اپنے والد کی تھیٹر کمپنی میں اداکار کے ساتھ اسسٹنٹ فلور مینجر کی ذمہ داری بھی نبھا رہا تھا۔دونوں کلکتہ میں اسٹیج ناٹک کرنے والے تھے۔اکثر ڈرامے امپیریل ہاؤس میں کئے جاتے تھے۔امپیریل ہاؤس نے اُنکے لئے مشکل کھڑی کر دی۔دونوں کو ایک ہی وقت دیا گیا۔اب دو دو ڈرامے ایک ہی وقت ایک اسٹیج پر کیسے کئے جاتے؟ دونوں نے مل بیٹھ کر اس مشکل کا توڑ نکالا۔فیصلہ یہ ہوا کہ ایک دن ایک شو کرے گا اور دوسرے دن دوسرا۔ایک دن جب ششی کپور امپیریل ہاؤس میں تھا تو اُسکی نظر اندر ایک گوری لڑکی پر پڑی جو ایک ہی جھلک میں اُسکا دل لوٹ کے لے گئی۔یہ جینیفر تھی۔جیفری کیڈل کی بیٹی۔وہ اُسکے پاس گیا اور پھر اُسے اپنا تعارف دیا۔جینیفر بھی اس خوبصورت نوجوان کو دیکھ کے مسحور ہو کے رہ گئی۔ششی تھا بہت وجیہہ۔اُسکی شکل بہت حد تک اپنے والد سے ملتی تھی۔دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد گھل مل گئے۔اسی بیچ ایک دن جیفری کیڈل نے پرتھوی راج کپور سے ایک دن کے لئے ششی کپور کو مانگ لیا۔اُنہیں اُسکی ضرورت ایک کردار کے لئے پڑ گئی۔ششی کا انگریزی تلفظ درست نہیں تھا۔اُسکا تلفظ درست کرنے کا کام جینیفر کو دیا گیا۔بس یہیں سے ایک پریم کہانی کی شروعات ہوئی۔دونوں ایک دوسرے سے پیار کر بیٹھے۔جب جیفری کو اس بات کی بھنک لگ گئی تو اُسکے ہوش اُڑ گئے۔اُسے ششی کپور کے ہندوستانی ہونے یا جینیفر سے کم عمر ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔وہ جینیفر کو کھونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ شیکسپیرین گروپ جینیفر کی اداکاری سے جانا جاتا تھا۔اُسکے بنا یہ تھیٹر کمپنی اُدھوری تھی کیونکہ جینیفر بہترین اداکارہ تھی اور سبھی مرکزی کردار جینیفر ہی ادا کرتی تھی۔اگر جینیفر اس تھیٹر کو چھوڑ کے جاتی تو یہ تھیٹر گروپ اپنی مقبولیت کھو دیتا۔جینیفر یہ بات بھی بخوبی جانتی تھی کہ ششی پھکڑ آدمی ہے۔وہ اُسے دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا پائے گا جب کہ وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔وہ اُسکے پیار میں اسقدر اندھی ہو چکی تھی کہ وہ اپنے

سارے آرام اور آسائشیں تج کر اس فقیر کا ہاتھ تھامنے کے لئے تیار تھی جو اُسے کسی ہوٹل میں لے جا کر ایک لنچ نہیں کھلا سکتا تھا۔

ششی بہت ہی خود دار نسان تھا۔ تنگی تکلیف میں ہونے کے باوجود اُسنے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ جن دنوں وہ عشق میں مبتلا تھا تو کبھی وہ جنیفر کو ایک آدھ پراٹھا کھلانے کے لئے جب ہوٹل میں لے کے جاتا تھا تو جیفری اسی ہوٹل میں لنچ یا ڈنر کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ اُسکے سامنے ایک بہترین پکوان سجا ہوتا۔ ساتھ میں بیئر کی کئی بوتلیں اُسکے ٹیبل پر جھاگ اُڑاتی نظر آتی۔ وہ چاہتا تو جیفری کے ساتھ بیٹھ کے طعام کا لطف لے سکتا تھا مگر جب کبھی اُسنے جیفری کو کھانا کھاتے دیکھا تو وہ اُسکے سامنے سے نہیں گزرا۔ اُسے جنیفر کو آدھی روٹی کھلانا منظور تھا مگر جیفری کا شاندار لنچ نہیں۔

وہ دونوں پر تول کے بیٹھے تھے۔ بس اُنہیں کام کی تلاش تھی۔ ایک دن اُنہیں ملائیشا کی ایک تھیٹر کمپنی میں کام کرنے کی آفر ملی۔ جنیفر نے اپنے باپ کے پاس جا کر اُسے بتا دیا کہ وہ یہ تھیٹر چھوڑ کے جا رہی ہے۔ جیفری کے سر پر جیسے بجلی گری۔ وہ بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ جنیفر باپ کو الوداع کہہ کے اپنے محبوب کے ساتھ ایک نئی منزل کی طرف نکل پڑی۔ شومئی قسمت وہاں پہونچ کر اُنہیں پتا چلا کہ وہ شو منسوخ ہوگیا۔ ششی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب وہ اس اجنبی شہر میں جائیں تو کہاں جائیں۔ وہ اکیلا ہوتا تو کسی فٹ پاتھ پر بھی سو سکتا تھا۔ اُسکے ساتھ جنیفر تھی۔ بہت دیر تک اُسے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ ذہن جیسے ماوف ہو کے رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُسنے اپنے بڑے بھائی راج کپور کو ملائیشا سے فون ملایا۔ اُسنے اپنی پریشانی بیان کی۔ راج کپور ششی کو اپنے بچے کی طرح چاہتا تھا۔ اُسنے نے ترت پھرت دو ہوائی ٹکٹوں کا بندوبست کر کے ٹکٹیں اُنہیں بھیج دیں۔ وہ جب بمبئی پہونچے تو ششی جنیفر کو اپنے گھر لے جانے کی بجائے اپنے منجھلے بھائی شمی کپور کے گھر کا رخ کیا۔ وہ اپنے باپ سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ کہیں پاپا جی اُسکی پٹائی نہ کر دیں۔ اُسنے اپنے منجھلے بھائی شمی کپور کے گھر میں پناہ لینے میں ہی خیریت سمجھی۔ اُن دنوں گیتا بالی حیات تھیں۔ اُسنے جب جنیفر کو دیکھا تو وہ پہلی ہی ملاقات میں اُس پر فدا ہو گئی۔ اُسنے اور شمی کپور نے مل کر اُن کا بیاہ کروا دیا۔ سہاگ رات منانے کے لئے گیتا بالی نے اُسے اپنی کار اور کچھ رقم دی تا کہ وہ کسی ہوٹل میں جا کر اپنی سہاگ رات منا سکیں۔ 1958 میں یہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ کلکتہ کے جس ہوٹل میں اُنہوں نے اپنی سہاگ رات منائی اُس کمرے کا نام آج بھی ششی کپور روم ہے۔

اب وہ شادی شدہ تھا۔ گھر چلانے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔ اُسکے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ کام کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتا رہا۔ اُسکا بڑا بھائی اپنے عروج پر تھا جب کہ شمی کپور بھی کامیابی کی معراج پر تھا۔ وہ چاہتا تو اُن سے مدد مانگ سکتا تھا مگر اُسکی انا کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ بھائیوں کا دست نگر رہے۔ وہ بہت برے دور سے گزر رہا تھا۔ تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ ایک دن اُسنے گوا میں جا کر اپنی سپورٹس کار بیچ ڈالی۔ جنیفر نے بھی اپنا بہت سارا سامان گوا میں جا کر بیچا۔ اسی بیچ اُسے ایک ہدایتکار کی طرف سے کام کرنے کی آفر ملی۔ اداکار کے طور پر نہیں بلکہ معاون ہدایت کار کے طور۔ سوکھے دانوں پانی پڑا۔ اُسنے یہ پیشکش بخوشی قبول کی۔ وہ ہدایت کار رویندر دوے کے ساتھ بطور معاون ہدایت کار کام کرنے لگا۔ رویندر دوے فلم ''پوسٹ بکس 999'' بنا رہے تھے جو کہ سنیل دت کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم میں سنیل دت کے علاوہ شکیلہ بھی کام کر رہی تھی۔ اس فلم کے ریلیز ہونے کے بعد اُسنے رویندر دوے کے ساتھ دوسری فلم بطور اسسٹنٹ کی جس کا نام ''گیسٹ ہاؤس'' تھا۔ اس فلم کا ہیرو اجیت تھا۔ ہیروئن شکیلہ تھی۔ ساتھ میں پران تھا۔ اسکے بعد اُسنے جو دو فلمیں بطور معاون ہدایت کار کیں وہ اُس کے لئے خاص تھیں کیونکہ ان دونوں فلموں کے ہیرو راج کپور تھے۔ یہ فلمیں تھیں ''دلہا دلہن'' اور ''شریمان ستیہ وادی''۔ ''دلہا دلہن'' میں راج کپور کے ساتھ سادھنا تھی جب کہ ''شریمان ستیہ وادی'' میں شکیلہ تھی۔ اسکے ہدایت کار ایس ایم عباس تھے اور یہ فلم 1960 میں ریلیز ہوئی جب کہ فلم ''دلہا دلہن'' کے ہدایت کار رویندر دوے ہی تھے اور یہ فلم بھی اسی سال ریلیز ہوئی۔

اس بیچ ششی کی دوستی یش چوپڑہ سے ہوئی۔ یش چوپڑہ کو بطور ہدایت کار پہلا بریک ملا تھا۔ فلم تھی ''دھرم پتر''۔ یش چوپڑہ نے ششی کپور کو اس فلم میں ہیرو کے رول کی پیشکش کی۔ یہ ششی کے لئے خوشی کی نوید تھی مگر اُسکی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ کوئی بھی ہیروئن اس لڑکے کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی نہ ہوئی۔ ششی اُمید و بیم کے عالم میں ڈول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ششی کے ہاتھ سے یہ سنہری موقع نکل جاتا تبھی نندہ اُسکے لئے فرشتہ بن کے آ گئی۔ اُسنے یش چوپڑہ سے کہا کہ وہ ششی کے ساتھ کام کرے گی۔ نندہ اُسوقت کی نمبر ایک اداکارہ تھی۔ نندہ کا یہ احسان وہ زندگی بھر نہیں بھولا۔ وہ نندہ کی بدولت فلموں میں آ گیا۔ گو کہ فلم کچھ خاص کمال نہ کر سکی مگر ششی کے لئے اداکاری کے راستے کھول دئے۔ یہ فلم 1961 میں ریلیز ہوئی۔ ششی نے نندہ کے ساتھ آٹھ فلمیں سائن کیں اسی سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''چار دیواری'' تھا۔ یہ فلم بھی کچھ خاص بزنس نہ کر سکی۔ ''چار دیواری'' کے بعد بمل رائے نے ششی کو اپنی فلم ''پریم پتر'' کے لئے سائن کیا۔ ہیروئن تھی سادھنا۔ یہ فلم بھی کوئی خاص کمال نہ کر سکی۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''مہندی لگے میرے ہاتھ'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے بھی ششی کو وہ مقبولیت نہیں بخشی جس کا وہ متمنی تھا۔ تبھی ایک اور فرشتہ اُسکے لئے خوشی کی نوید لے کر آ گیا۔ یہ فرشتہ تھا ''مرچنٹ اوری پروڈکشن'' کے پروڈیوسر اسماعیل مرچنٹ جو کہ ہالی وڈ کا ایک نامور فلمساز تھا۔ اُسنے اُسے ہالی وڈ کی فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ ششی کپور نے پہلی انگریزی فلم۔ "The House Holder" میں بطور ہیرو کام کیا۔ ہالی وڈ فلم میں کام کرنا اُسکے لئے باعث افتخار تھا۔ وہ پہلا ہندوستانی اداکار تھا جو ہالی وڈ کی فلم میں اداکاری کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس فلم میں اُسکی ہیروئن لیلا نائیڈو تھی۔ یہ فلم 1963 میں ریلیز ہوئی۔

اسی سال اُس کی اور تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''جب سے تمہیں دیکھا ہے''، ''ہالی ڈے ان بمبئی'' اور ''یہ دل کس کو دوں۔ 1964 سے اُسکے ستارے بدلنے لگے۔ اُسے دو بڑی فلموں میں فلمی دنیا کے بہت بڑے اور کامیاب ستاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ فلمیں تھیں ''بے نظیر'' اور ''وقت''۔ ''بے نظیر'' میں جہاں دادا منی اشوک کمار اور مینا کماری کام کر رہے تھے وہیں ششی کا رول بھی بہت اہم تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فلم ''سنگرام'' میں جہاں اُسنے اشوک کمار کے بچپن کا رول ادا کیا تھا، ''بے نظیر'' میں وہ دادا منی کا چھوٹا بھائی بنا تھا۔ اُسنے اشوک کمار کے ساتھ سات فلموں میں کام کیا جہاں وہ ہیرو تھا اور اشوک کمار کریکٹر رول نبھا رہا تھا۔ یہ فلمیں تھیں۔ ''چوری میرا کام''، ''آپ بیتی''، ''شنکر دادا''، ''اپنا خون''، ''مان گئے اُستاد'' جو کہ کامیاب فلمیں تھیں، جب کہ ''ہیرا اور پتھر'' اور ''دو مسافر'' ناکام رہئیں۔ دوسری فلم بی آر فلمز کی ''وقت'' اُس زمانے کی ملٹی اسٹارر فلم تھی جسمیں ستاروں کی ایک کہکشاں تھی۔ بلراج ساہنی، راج کمار، سنیل دت سادھنا اور شرمیلا ٹیگور۔ اس فلم کے ہدایت کار ششی کا دوست لیش چوپڑہ تھا۔ یہ فلمیں 1965 میں ریلیز ہوئیں۔ یہ سال ششی کے لئے کامرانیوں اور شادمانیوں کا سال تھا۔ اسی سال اُسکی ایک اور انگریزی فلم "Shakespeare wala" ریلیز ہوئی۔ یہی وہ سال تھا جب اُسنے کامیابی کی بلندیوں کو چھولیا۔ فلم تھی ''جب جب پھول کھلے''۔ اس فلم نے باکس آفس پر دھوم مچادی۔ اس فلم میں اُسنے ایک کشمیری شکارے والے رول کو اس خوبی اور نفاست سے ادا کیا تھا کہ کہیں پر بھی وہ غیر کشمیری نہیں لگ رہا تھا۔ کشمیر کا خوبصورت پس منظر اور کشمیری لوک سنگیت پر مبنی اس فلم کے گانے فلمی شائقین پر جادوئی اثر کر گئے۔ اس فلم نے ششی کپور کو اسٹار بنا دیا۔ اس فلم میں بھی اُسکی ہیروئن نندہ تھی۔ اسکے بعد اُسنے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ اُسنے ہر بڑی ایکٹرس کے ساتھ کام کیا۔ راکھی، شرمیلا ٹیگور، زینت امان، پروین بابی، ہیما مالنی، آشا پاریکھ، ممتاز، اور رتی اگنی ہوتری اُسکی پسندیدہ ہیروئنیں رہیں۔ اُسنے کل ملا کر دو سو سولہ فلموں میں کام کیا جن میں اکسٹھ انگریزی میں تھیں اور ایک سو چھپن ہندی میں تھیں۔

پران کے ساتھ ششی نے فلم ''سنسکار'' میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور کام کیا تھا۔ اُسی پران کے ساتھ اُسنے بطور ہیرو نو فلمیں کیں جن میں ''برادری''، ''چوری میرا کام''، ''پھانسی''، ''شنکر دادا''، ''چکر پہ چکر''، ''راہو کیتو'' اور ''مان گئے اُستاد'' قابل ذکر ہیں۔ جس امیتابھ بچن کے شاندار مستقبل کی پیشن گوئی کی تھی، اُسی امیتابھ بچن کے ساتھ اُسنے بارہ فلمیں کیں۔ شروعات ''روٹی کپڑا اور مکان'' سے ہوئی۔ اُسکے بعد آئی فلم ''دیوار''۔ ''میرے پاس ماں ہے'' اس ایک مکالمے نے ششی کے کردار کو رفعت بخشی۔ اُسکے بعد آئی ''کبھی کبھی''۔ اس فلم میں جیسا اُسکا کردار تھا اصل زندگی میں بھی ششی ایسا ہی تھا۔ صاف دل، صاف گو۔ اسی طرح امیتابھ بچن اور ششی کی جوڑی بیحد مقبول رہی۔ ''ترشول''، ''کالا پتھر''، ''سہاگ''، ''نمک حلال'' اس جوڑی کی کامیاب ترین فلمیں ہیں جب کہ ''ایمان دھرم''، ''دو اور دو پانچ''، ''شان''، ''سلسلہ''، ''اور ''اکیلا'' باکس آفس پر ناکام رہیں۔

ششی کپور کو فلمیں بنانے کا جنون تھا۔ 1978 میں اُسنے اپنی فلمساز کمپنی ''فلم والا'' کی داغ بیل ڈال دی۔ پہلی فلم جو اس بینر تلے بنی اُس فلم کا نام ''جنون'' تھا۔ اس فلم میں ششی کے علاوہ شبانہ اعظمی، جینفر کپور اور نصیر الدین شاہ اہم رول میں تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار شیام بنیگل تھے۔ یہ ہندی اور انگریزی میں بنی تھی۔ اس بینر کے تلے اُسنے چھ فلمیں بنائیں۔ ''جنون''، ''کلیگ''، ''36 چورنگی لین''، ''وجیتا''، ''اُتسو'' اور ''اجوبہ''۔ ''اجوبہ'' پہلی فلم تھی جس کی ہدایت کاری کی کمان ششی نے سنبھالی تھی۔ اس فلم میں ششی کے علاوہ امیتابھ بچن اور رشی کپور اہم کردار میں تھے۔ یہ فلم چلی نہیں۔ اسکی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کے اُسنے فلمسازی سے توبہ کر لی۔

ششی ستر کی دہائی میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے اداکاروں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر تھا۔ ایک دور ششی کپور پر ایسا بھی آیا کہ جس دن وہ نئی فلم سائن نہ کرتا اُس دن کو اپنے لیے منحوس گردانتا۔ اُن دنوں ششی کپور فلم سائن کرنے کا ایک لاکھ روپے ایڈوانس کے طور پر لیتا تھا۔ اُس کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ روزانہ سولہ، سولہ گھنٹے ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ، ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کے درمیان معلق رہتا جس کے سبب بڑے بھائی راج کپور نے اُس کا نام ششی کپور کے بجائے ٹیکسی کپور رکھ چھوڑا تھا۔

ششی کپور کمرشل فلموں سے جتنا کماتا تھا وہ اپنی کلاسک فلموں میں ڈالتا تھا۔ وہ پیسہ کمانے کے لئے فلمیں نہیں بناتا تھا۔ بس اُسے صاف ستھری فلمیں بنانے کا جنون تھا۔ اس جنون میں اُسنے بہت سارا پیسہ گنوایا۔ اُسنے اپنے باپ کے پرتھوی تھیٹر کو زندہ رکھنے کے لئے جوہو میں زمین خرید کر اُس پر ایک خوبصورت تھیٹر بنوالیا جس کا نام پرتھوی تھیٹر ہے جو نئے کلاکاروں کو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس تھیٹر سے بہت سارے کلاکار فلمی افق پر درخشاں ستارے کی مانند کئی دہائیوں تک چمکتے رہے۔ ان میں شنکر جے کشن اور رامانند ساگر قابل ذکر ہیں۔

ششی جینیفر سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا۔ جنیفر ششی کی لائف لائن تھی۔ اُسے کیا پہننا ہے کیا کھانا ہے یہ سب جنیفر طے کرتی تھی۔ وہ اُسکی صحت کے معاملے میں بہت محتاط رہتی تھی۔ راج کپور، شمی کپور، یہاں تک کہ رشی اور راجیو کپور بہت موٹے ہو گئے تھے، ایک ششی تھا جو دبلا پتلا ہی رہا۔ جب تک جنیفر اُسکے ساتھ تھی ششی پر بڑھتی عمر کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ایکدم چست اور فٹ دکھائی دیتا تھا۔ 1982 میں وہ بیمار ہوئی۔ پتا چلا کہ وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ مرض کی تشخیص ہونے کے بعد دو سال تک زندہ رہی۔ 1984 میں جینیفر اس جہاں فانی سے کوچ کر گئی۔ اُسکا جانا ششی کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ اُسے لگا جیسے جینیفر اُس کا آدھا وجود اپنے ساتھ لے گئی۔ اُسکے جانے کے بعد وہ صحت کے معاملے میں لاپروا ہو گیا۔ وہ مے نوشی کی طرف مائل ہو گیا۔ اُسکا وزن بڑھنے لگا۔

وزن بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُسنے گھر سے نکلنا کم کردیا۔جو ششی کے جانکار ہیں اُن کا کہنا ہے کہ وہ صبح سے شام تک پیتا رہتا تھا۔جینیفر کے جانے کے بعد اُسکا ششی کہیں کھو گیا۔ششی کپور خود اُس ششی کو تلاش کرنے لگا جسے جینیفر چھوڑ کے گئی تھی۔ششی کا زندگی کے ساتھ لگاؤ کم ہو گیا تھا۔وہ جی نہیں رہا تھا محض ایک رسم نبھا رہا تھا۔اُسکے گردے ناکارہ ہو چکے تھے۔اُسے ہفتے میں تین بار dialysis کے لئے اسپتال میں بھرتی ہونا پڑتا تھا۔پھر اُس پر فالج کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے اسکی یاداشت چلی گئی۔وہ اکیلا تھا۔بچے جوہو میں رہتے تھے۔اُسکے اکیلے پن کو کم کرنے کے لئے اُسکا بیٹا کنال اُسے جوہو لے آیا۔یہاں وہ اور زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگا۔آخر لمبی بیماری کے بعد اُسنے 4 دسمبر 2017 کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔

ششی ایک سیدھا سادا اور رحمدل انسان تھا۔وہ فلم میں کام کرنے والے ایک ایک ورکر کو جانتا تھا۔وہ عجز و انکسار کا پتلا تھا۔وہ جب بلندیوں پر تھا تب بھی اُسکے پاؤں زمین سے لگے رہے۔اُسنے ہر نئے کلاکار کی حوصلہ افزائی کی اور ہر بڑے ایکٹر کو بھرپور عزت دی۔ششی کپور کی زندگی میں ڈسپلن یعنی نظم وضبط کا بڑا دخل تھا۔وہ کھانے، پینے، سونے اور سیٹ پر بروقت پہنچے کا قائل تھا۔راج کپور کا بڑا بیٹا رندھیر کپور لااُبالی طبیعت کا مالک تھا اور کبھی بھی سیٹ پر بروقت نہیں پہنچتا تھا۔ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران رندھیر کپور کو صبح آٹھ بجے سیٹ پر دیکھ کر پورا یونٹ حیران رہ گیا۔دریافت کرنے پر رندھیر کپور نے سر کھجلاتے ہوئے بتایا کہ ششی چاچا کے ساتھ اس سیٹ پر میں بھی ہوں اس لیے وقت پر نہ آتا تو ایسی ڈانٹ پڑتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔اُسے کئی سارے اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔2011 میں اُسے پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز گیا۔ 2015 میں اُسے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نواز گیا۔اُسنے تین بار نیشنل فلم ایوارڈ حاصل کیا۔فلمیں تھیں ''جنون''''نیو دہلی ٹائمز''اور''محافظ''۔1976 میں اُسے فلم''دیوار''میں بہترین معاون کلاکار کے لئے فلم فئیر ایوارڈ دیا گیا۔

ششی اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک بیٹی کو چھوڑ کے گیا ہے۔سبھی شادی شدہ ہیں اور الگ الگ رہ رہے ہیں۔اُنکی بیٹی سنجنا کپور پرتھوی تھیٹر کی دیکھ ریکھ کرتی ہے اُنکے بڑے بیٹے کنال کپور نے فلموں میں قسمت آزمائی کی تھی مگر اُسے کامیابی نہیں ملی۔سنجنا نے بھی فلموں میں نام کمانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی ناکام رہی۔

ششی کا سرکاری اعزاز کے ساتھ داہ سنسکار کیا گیا۔اُسکے جانے سے فلم انڈسٹری میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔کلاکار آئیں گے جائیں گے مگر ششی جیسا خوش دل، کھرا اور سچا انسان دوبارہ پیدا نہیں ہوگا۔

- بقیہ -

ایک ہلا ہوا آدمی

چاہتی ہیں اور سرگوشیاں چینخیں بننا چاہ رہی ہیں۔لوگ دوسروں کے چہروں میں اپنی شباہت دیکھنے کے لیے آئینہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

اگر یہی حالت رہی تو ایک دن زبان لوگوں کو متنبہ کردے گی کہ میرا بے جا استعمال بند کردیں ورنہ میں تم سب کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔زبان کا استعمال کر کے لوگ ایک دوسرے کو ٹھگ رہے ہیں۔زبان کے جال میں پھنسا کر ایک دوسرے کو فریب دے رہے ہیں۔زبان کا استعمال کر کے لوگ صریحاً دروغ گوئی پر اُتر آئے ہیں۔ایک دوسرے سے مکر کر رہے ہیں۔زبان کے پسِ پردہ سچ کو جھوٹ، جھوٹ کو سچ کا لبادہ پہنا رہے ہیں۔ہماری ان نازیبا حرکتوں سے تنگ آ کر اگر ہماری زبان ہم سے روٹھ گئی تو ہم کیا کریں گے؟۔

آج کا دن پھٹے ہوئے دودھ سا بیکار لگ رہا ہے۔چاروں جانب سے ایک نامانوس سی بدبو آرہی ہے۔دعائیں بے اثر ہو گئیں ہیں۔ہواؤں میں سڑاندھ بھری ہوئی ہے۔بدبو کا ایک موٹا سا غلاف جیسے شہر پر منڈھا ہوا ہے۔آسمان سے بھی جیسے بدبو کی موسلا دھار برسات ہو رہی ہے۔ہواؤں میں اشیاء کے سڑنے گلنے کی تیز بدبو ہے۔کیا یہ دوغلے پن کی بدبو ہے؟ کیا شیطانیت کی بدبو ہے؟۔یہ دم گھونٹنے والی بدبوئیں اتنی تیز ہیں کہ دنیا کی بچی کھچی پاک روحیں تڑپ رہی ہیں اور ان میں ڈوب کر مرتی جارہی ہیں۔یہ بدبوئیں ملاوٹ کرنے والے دکانداروں، لالچی ڈاکٹروں اور انجنیروں کے مکھوٹے لگائے گھوم رہے درمیانی طبقے سے آرہی ہے۔ساری دنیا کی دھوپ بتّیاں، اگر بتّیاں، عطر اور رُوم فریشنر بھی اس بدبو کو زائل نہیں کر پائیں گی۔کیونکہ یہ ہمارے اندرون کی بدبو ہے۔یہ ہماری بدنیتی کی بدبو ہے۔یہ مکّاری اور جعل سازی کی بدبو ہے۔یہ بدبوئیں نہیں پوری طرزِ زندگی ہے۔یہ ایک ایسی بُو ہے جسے دور کرنا چاہو بھی تو یہ اُنگلیوں میں ایسے چپکتی ہے جیسے کسی زہریلی مکڑی کا جالا ہو۔یہ ایک ایسی منحوس، کالی بدبو ہے۔جسے سونگھنا ایک جہنمی عذاب سے گزرنے جیسا ہے۔جسے سونگھنا کئی کئی موتیں مرنا ہے۔میں تازی ہوا میں سانس لینے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔میرے پھیپڑوں میں سڑ رہی انسانیت کی یہ بدبو داخل ہوتی جارہی ہے۔اے! دنیا والو مجھے تھوڑی سی تازی ہوا دو یا پھر مجھے زندہ دفن کر دو۔میں اس بدبودار ہوا میں اب مزید سانس لینا نہیں چاہتا۔

پیارے قارئین کرام۔۔۔کیا سدھا کر واقعی 'ہلا ہوا' آدمی ہے؟ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ اور چہارسو کے قارئین کو نئے سال کی دعا کے ساتھ یہ سال ہم سب کے لیے امن اور محبت کا سال ثابت ہو۔ آمین۔

چہارسو میں "قرطاسِ اعزاز" میرے نام منسوب کر کے آپ نے مجھے بے حد عزت اور پذیرائی بخشی۔ اللہ رب العزت آپ کی عزت و توقیر میں اضافہ کرے اور اسی محنت و لگن کے ساتھ آپ چہارسو کی ادبی خوشبو چہار سو بکھیرتے رہیں۔ آمین۔

آپ نے جس محنت اور لگن کے ساتھ "قرطاسِ اعزاز" ترتیب دیا اور سبھی نثری، شعری اصناف کا احاطہ کر کے ایک نہایت جامع اور پُر اثر اشاعت ترتیب دی جو بلاشبہ آپ کی فہم و فراست کا آئینہ دار ہے۔ بہت سے دوست احباب نے مبارکباد کے پیغامات بھیجے ہیں جن میں جرمنی سے حیدر قریشی، کینیڈا سے شہناز عابدی اور عبداللہ جاوید، نیویارک سے پروین شیر، برمنگھم سے اقبال بھٹی، خواجہ عارف، طلعت سلیم، لیڈز سے رحیمہ علوی، بریڈفورڈ سے یعقوب نظامی جبکہ لندن سے حمیدہ معین رضوی، یشب تمنا، پاکیزہ بیگ نے نیک خواہشات کے ساتھ مبارکباد کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

رضیہ اسماعیل (یوکے)

عزیزی گلزار جاوید، سلام مسنون۔

جب بھی چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوتا ہے تو میں حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتا ہوں۔ کوئی تن تنہا شخص اتنا معیاری رسالہ وقت کی پابندی کے ساتھ کیونکر نکال سکتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ "دلِ مضطرب اور نگاہِ شفیقانہ" کے عوض فیّاضی سے تقسیم بھی کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ اپنے تخلیقی سفر کو بھی بڑی آن بان اور شان سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس شمارے میں آپ کا افسانہ "وہی خدا ہے" قاری کے لیے دلچسپی کے ساتھ بہت سے اشتیاق اور تجسس کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ مبارکباد، شاباش۔ اسی تندہی سے لگے رہیے۔

حسن منظر (کراچی)

عزیزم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

نومبر، دسمبر کا شمارہ "چہارسو" دبستان گلزار جاوید کا بے لوث محبت و خلوص کا علمبردار، مہکتا ہوا شاداب گلاب، میرے دامنِ زندگی کو ادبی لطافتوں سے مالا مال کرتا ہے۔ چشمِ بدور۔

موجودہ شمارہ رضیہ اسماعیل کے نام دیکھ کر دلی خوشی ہوئی جس قدر رضیہ علم و ادب سے مالا مال ہے اُسی قدر خوبصورت آپ کی پیشکش بھی ہے۔ بلاشبہ رسالے کے دیگر مندرجات قاری کی ادبی ضیافت کا خوب خوب سامان کر رہے ہیں جس میں تمہاری کہانی "وہی خدا ہے" بھی نمایاں بلکہ نمایاں تر ہے مگر اس بار ریاست چندی گڑھ اور پنجاب کی اکلوتی اردو افسانہ نگار عزیزہ رینو بہل نے مجھے جس طور سر کا تاج بنایا وہ میری خوش بختی ہے جس پر میں جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ رینو تم نے بن دیکھی آپا کو کتنے دلپذیر، دلکش اور دلسوز انداز میں الفاظ کی لڑیوں میں پرویا ہے۔ تمہاری جادو بھری تحریر صفحۂ قرطاس تو جگمگا رہا ہے مگر میرا دل بھی روشن ہو گیا ہے۔ محبت کے نور سے میری آنکھیں جگمگا اُٹھی ہیں، تمہاری تحریر میرے سینے میں دل بن کر دھڑکتی ہے۔ تمہارا توانا اور شگفتہ قلم جس طرح تابدار نگینے سجاتا ہے اُس سے لفظ لفظ سچائی اور محبت کی خوشبو میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میرا نحیف و نازار وجود حد بندیوں سے مجبور و محصور، قابلِ فخر ایثار پرست رینو سے دُور، بہت دُور ہے۔ بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ نہ ملنے پر بھی اُن سے ملنے کا احساس رہتا ہے۔ اور دُوری بھی فاصلے بڑھاتی نہیں بلکہ دل کے رشتے مضبوط کرتی ہے۔

دنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش
ہم نے تیرے خیال کو یزداں بنا لیا

جب جب میں نے صبر کی زمین میں درد کا پودا سینچا، تب تب میرے رب نے مجھے خوشی کا پھل دیا۔ تمہاری تحریر نمناک آنکھوں سے پڑھی، عزت افزائی کی شکر گزاری کے بجائے اللہ پاک سے دعا کرتی ہوں کہ "اے میرے رب بے ریا انسانوں کے بیچ یہ پُر محبت الحاق صدا قائم دائم رکھنا۔" سچا ادیب وہی ہے جو تحریر میں زندگی کی کڑوی، کسیلی سچائیوں کے اظہار کا سلیقہ رکھتا ہو۔ سادہ اور بے ریا دل رکھنے والی دوست رب را کھا۔

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

آج یہ بندہ ناچیز روائتوں سے منحرف ہو کر خط کی ابتدا ایک لافانی فلمی گیت سے کر رہا ہے کیونکہ میرے خط کا موضوع بھی وہی ہے جس کی نمائندگی اس کی گیت کی اعلیٰ شاعری کر رہی ہے۔

جو دل یہاں نہ مل سکے ملیں گے اس جہان میں
کھلیں گے حسرتوں کے پھول جا کے آسمان میں

زندگی ایک ایسی پراسرار شے ہے جس کا مطلب کوئی نہیں سمجھ سکا، ایک اور شعر یاد آتا ہے

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

یہاں ایسے بڑے واقعات جنم لیتے ہیں جنکی کوئی تاویل یا جنکی کوئی سائنسی توجیح نہیں ہوتی مگر یہ طے ہے کہ اگر جذبہ صادق ہو، طلب پختہ ہو اور محبت

سچی ہوتو اس جسد خاکی کے فنا ہونے کے بعد بھی تعلق رہتا ہے اور کسی نہ کسی طرح محبت کرنے والے باہمی تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔

چہارسو کے گزشتہ شمارے بابت نومبر اور دسمبر میں آپ کی کہانی ''وہی خدا ہے'' پڑھ کر میرے اندر ایک کپکپی طاری ہوگئی اور میں کافی دیر صرف سوچ میں گم رہا۔ مجھے ویسے بھی پراسرار تخلیقات پڑھنے اور ان کے متعلق سوچ بچار کرنے کا شوق ہے۔ اردو قارئین یہ جان کر شاید حیران ہوں ، کہ ترقی یافتہ زبانوں میں اور خاص طور سے انگریزی میں تو اس صنف پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے اور اس صنف کو ان زبانوں کے ادب میں ایک اعلیٰ اور معتبر مقام دیا جاتا ہے۔

آپکی کہانی پہلے دوستوں کی بے تکلف محفل سے شروع ہو کر پراسرار واقعہ اور پھر جس طرح ایک خواب یا ایک غیر مرئی ماحول یا مقام تک لیجاتی ہے وہ قاری کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔'' کیا یہ جنت ہے۔۔عالم بالا ہے؟؟'' کون ہیں یہ لوگ۔ یہ سوال اسکے ذہن میں اٹھتا ہے۔۔۔اور پھر کہانی کا نقطۂ عروج جہاں اسکا نسوانی کردار محبت کی کشش سے مجبور ہو کر اپنے محبوب کو چند لمحوں کی مسرت سے، ہم آغوش کرنے کے لئے اسکا ہاتھ تھامتا ہے اور اس کو یقین دلاتا ہے کے میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں اور یہ کہ جیسے کہہ رہا ہو۔

تم اپنے رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو

یہ ہے سچی محبت کی کشش۔ بس کیا عرض کروں میں اس کہانی کے انداز بیان اسکے پلاٹ، اس کے پیغام اور اس کے سچے جذبے کی اثر اندازی میں کھو گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ:

''جس کو محبت مل گئی اسے دنیا کے تمام خزانے مل گئے''

یوں تو کئی اور بھی تخلیقات قابل ذکر ہیں مگر میں طوالت کے خوف سے صرف یوگندر بہل کی کہانی کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہت ہی دل کو چھونے والی روداد ہے۔ یوگی بھائی جیسے لوگ اب خدا نے تخلیق کرنے بند کر دئے ہیں وہ محبت کا پیکر ہیں اور وہ صرف محبت بانٹنا جانتے ہیں۔ وہ بھی بے لوث۔۔۔وہ صرف اور صرف محبت کے پیغامبر ہیں۔

رضیہ اسمٰعیل کے نام اور کام سے میں پہلے سے واقف ہوں مگر آپ نے حسب عادت انکے کام کا احاطہ بڑی جانفشانی سے کیا ہے جس سے میری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔

آپا جمیلہ شبنم پر رینو بہن کا خاکہ دلفریب ہے میں بھی آپا کی تحریروں سے یہی تاثر لیتا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی پیاری شخصیت ہیں، اللہ انکی عمر دراز کرے۔ شگفتہ نازلی، نسیم سحر، ریاض احمد، محمود الحسن اور نوید روش کی شاعرانہ کاوشیں اچھی لگیں۔ رس رابطے اور ایک صدی کا قصہ بھی دلچسپ ہیں۔

فیروز عالم (کیلیفورنیا)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

چہارسو شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۷ء ملا۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نمبر یا ان کا گوشہ بھرپور ہے۔ اس میں شامل بہت ساری چیزیں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں لیکن ان سب کے یہاں یکجا کرنے سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ادبی حیثیت کے بارے میں ایک واضح تاثر قائم ہوتا ہے۔

باقی شمارے کے معمول کے مندرجات ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' جیسے ہیں۔ ہاں ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنے مضمون میں ڈائلے سز کے حوالے سے اچھی معلومات تحریر کی ہے۔ شمیم حنفی نے ''وکرم صاحب'' میں نند کشور وکرم کے بارے میں اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، تاہم وکرم صاحب کی شخصیت کے کئی اہم گوشے سامنے نہیں آسکے۔ اس کی وجہ شاید شمیم حنفی صاحب کا اپنا مرنجاں مرنج مزاج بھی ہو۔ اس احساس کے باوجود شمیم حنفی صاحب نے اجمالی طور پر نند کشور وکرم صاحب کی شخصیت کے بیشتر اہم پہلوؤں کو کسی نہ کسی طور سمیٹ لیا ہے۔ دیویندر اسر کے ساتھ نند کشور کی دوستی مثالی بھی تھی اور بے مثال بھی۔ دیویندر اسر صاحب کے توسط سے ہی مجھے نند کشور وکرم سے ملاقات کا موقعہ ملا اور پھر ہم (میں اسر صاحب کے ساتھ) ان کی کئی نجی محفلوں اور دعوتوں میں شریک ہوتے رہے۔ ان کی دلچسپ شخصیت کے کئی خوبصورت پہلو دیکھنے کا موقعہ ملتا رہا۔ دعا ہے کہ وہ صحت و سلامتی کے ساتھ لمبی عمر پائیں۔ آمین۔

دیپک کنول کا مضمون ''ایک صدی کا قصہ۔ ناصر حسین'' مجھے بہت اچھا لگا۔ عامر خان کو بارے میں واضح نہیں کیا گیا کہ وہ ناصر حسین کے بھتیجے ہیں۔ نزہت کے بیٹے عمران خان (عمران ہاشمی نہیں) کو عامر خان نے ہی پرموٹ کیا تھا۔ ناصر حسین کی زندگی اور فلمی زندگی کے حوالے سے کچھ باتیں پہلے سے میرے علم میں تھیں لیکن دیپک کنول کے مضمون سے ان کے بارے میں اتنی جانکاری ملی ہے کہ پہلے کی معلومات زیادہ واضح ہوگئی ہے اور بہت سی نئی باتوں کے ذریعے گویا ناصر حسین سے ایک بھرپور ملاقات ہوگئی ہے۔ سماجی مجبوریوں کے باعث آشا پاریکھ ناصر حسین سے شادی نہیں کر سکیں لیکن انہوں نے ساری زندگی ناصر حسین کی محبت کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عامر خان اور خاندان کے دوسرے افراد آشا پاریکھ سے اتنی ہی عزت اور محبت سے پیش آتے ہیں جتنی خاندان کی دوسری بزرگ خواتین سے پیش آتے ہیں۔ عامر خان، شاہ رخ خان اور سلمان خان سبھی سپر سٹار ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی کسی دوسرے سے کم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر عامر خان بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کی بعض خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے فلمی ایوارڈز کو کبھی درخور اعتناء نہیں سمجھا اور کسی بھی ایوارڈ کے حصول کے لیے کبھی کوئی کمپرومائز نہیں کیا۔ اتنی شہرت کمانے کے باوجود اتنی بے نیازی خدا کی طرف سے دیا گیا بہت بڑا ایوارڈ ہے۔ بہر حال دیپک کنول کا مضمون پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

حیدر قریشی (جرمنی)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو ستمبر اکتوبر ۲۰۱۷ء دہلی کے رحمٰن بھائی کی مہربانی سے ملا۔ اس

شمارے میں میری غزل:

پیدا ہوئی کتاب کرائے کی کوکھ سے
بے اہلیت ہے پھر بھی وہ اہلِ کتاب ہے

شائع ہوئی۔ آپ نے یقیناً میرے نام کا پرچہ بھجوایا ہوگا مگر وہ کہیں رہ گیا مجھ تک نہیں پہنچا۔ رحمٰن بھائی نے اپنا شمارہ مجھے دے دیا۔

گلزار دہلوی کو گوشہ خوب ہے جہاں گلزار صاحب سے اردو کو فروغ حاصل ہوا وہیں اردو سے گلزار صاحب کا بھی کافی بھلا ہوا۔ کئی انعامات و اعزازات سے وہ نوازے گئے۔ جیسا کہ اپنے مصاحبے میں خود انہوں نے اعتراف کیا۔ کئی مشاہیر سے ان کے روابط اردو ہی کی برکت سے رہے۔ گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار جناب گلزار کا دم غنیمت ہے۔ انہوں نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ بے شمار متشاعر اور گویّے مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں۔ جینوئن شاعر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ انہوں نے بجا فرمایا کالی بھیڑیں کس شعبے میں نہیں ہوتیں۔

گلزار صاحب کی ایک غزل کا مطلع:

جب سے نہیں رندوں کو رہا فصلِ خدا یاد
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

پڑھ کر غالباً جگر کا مشہور شعر یاد آیا

جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد

گلزار دہلوی کے تخیل کی شوخیاں
جیسے تصورات میں صحبت ہے آپ سے

گلزار صاحب کے چاہنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ خواجہ حسن نظامی، قرۃ العین حیدر، جگر، خواجہ احمد عباس، ضمیر دہلوی، فاروق ارگلی وغیرہ وغیرہ۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

نسیم سحر زبان و بیان کا بڑے سلیقے سے اظہار کرتے ہیں۔ ان کی غزل خوب ہے:

ہم سے دل زدگاں کی عید
کیسی عید کہاں کی عید

محترمہ رینو بہل کا افسانہ ''دو نیناں'' جناب آغا گل کا ''لوح لاعی'' متاثر کرتے ہیں۔ محبت کی زبان تو ہر لاعی سمجھ ہی لیتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد کا مرڈّف یادوں کا خزینہ خوب ہے۔ جناب جاوید اختر چودھری (برمنگھم) چوں کہ خود اچھے قلم کار ہیں انہوں نے ایک اچھے شاعر اقبال بھٹی پر اچھی رائے دی۔

دیپک کنول صاحب فلمی دنیا کے ہر کردار پر خوب روشنی ڈالتے ہیں۔ چاہے وہ اداکار ہو کہ ادارکارہ۔ گیت کار ہو کہ سنگیت کار، ایل وی پرساد سے بھی خوب ملوایا۔ میرے مضمون ''حیدرآباد کے ادبی اڈے'' کو کئی احباب نے پسند فرمایا جیسے نجم الحسن رضوی، شگفتہ نازلی، نوید سروش، ابراہیم عدیل، ڈاکٹر ریاض احمد میں ان تمام صاحبانِ ذوق کا ممنون ہوں۔

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔ ہمیشہ کی طرح زیرِ نظر شمارہ بھی گونا گوں ادبی دلچسپیوں اور شاعری کی مطالعاتی کشش کے ساتھ نظر نواز ہوا، اہلاً وسہلاً مرحبا!

افسانوں میں مجھے ''بالجبر'' کے عنوان نے چونکا دیا تو سب سے پہلے اُسے پڑھا ایک تو نام کے ساتھ نقشبندی، نقوی، بخاری کا سابقہ اور لاحقہ پھر طلسہ، امریکہ کا تعلق! پڑھنے کے بعد اس کے انتخاب پر حیرت ہوئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ''چہارسُو'' کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جا رہا ہے؟؟ آپ کے جریدے میں دلچسپی لینے والوں میں خواتین (قاری/مصنفین) بھی شامل ہوتی ہیں اس افسانے میں کئی فقرے تو ایسے ہیں جن میں جنسی تلذذ نہ صرف موجود ہے بلکہ ایک خلافِ فطرت عمل کے سارے مرحلے بلا کم و کاست بیان کر دیئے گئے ہیں۔ چلئے مان لیتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں یہ لعنت قانونی رعایت کے ساتھ موجود ہے لیکن ہمارے یہاں اور وہ بھی ''چہارسُو'' میں اس کی ترویج و اشاعت؟ ''اردو نوشت میں غیر اردو الفاظ'' حسن منظر کا ایک معلوماتی اور کارآمد مضمون ہے پسند آیا۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''ریٹائرمنٹ پلان'' بھی مغربی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے لیکن دیکھئے کہ اس خاتون نے اُس تہذیب کی کیسی عکاسی کہ چہ جائیکہ ''بالجبر''؟ ''وہی خدا ہے'' گلزار جاوید کا ایسا افسانہ ہے جس میں افسانے کی ساری تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اور اس خوبی سے کی گئی ہے کہ افسانہ خواب ندارین کے دل میں کھب جاتا ہے۔

غالب عرفان (کراچی)

مدیرِ محترم، سلام و رحمت۔

نومبر دسمبر ۲۰۱۷ء کا شمارہ محترمہ رضیہ اسماعیل کے قرطاس اعزاز کے خوشگوار مطالعے کی صورت موصول ہوا۔ ''روشنی کا آئینہ'' میں صاحبۂ اعزاز کی تخلیقی و تہذیبی خصوصیات کو عمدگی سے منظوم کیا گیا جبکہ ''گرینڈ مدر'' کا خاکہ متبسم فقروں و تیکھے لہجے کے ساتھ بشاشت آمیز کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ شگفتہ بیان ادیبہ کو مبارکباد۔

''براہِ راست'' کے سوچے سمجھے، بچے تلے سوالات زیرِ اعزاز شخصیت سے متعلق قارئین کو معلومات افزا شناسائی فراہم کرتے ہیں۔ ''درویشی'' مخلصانہ وابستگی و گہرے مشاہدے کا والہانہ اظہار ہے۔ ''انوکھا کام'' میں عمومی روش سے ہٹ کر کچھ جداگانہ کام کی خواہاں، ''آ گہی کی روحِ رواں'' مختلف محاذوں سے نبرد آزما، عزم صمیم کے ساتھ کامیاب نظر آتی ہیں۔ ''کانٹوں پہ چلنا۔۔۔'' میں بیرونِ ملک تخلیقاتی ادب کی تشہیر اور منفی ادبی رویے بھی بین السطور اُجاگر ہوتے ہیں۔ ''معاصرانہ تقابل بھی۔۔۔'' پیشِ نظر رہا لیکن شاعرہ

کے کانٹوں پہ چلنے کا پُرخلوص اعتراف بہت اہمیت و وقعت کا حامل ہے۔ ''گلابوں کو تم۔۔۔'' میں بھی شعری تخلیقات کا تجزیہ بالخصوص صنفِ نازک کے ساتھ ہونے والے معاشرتی استحصال اور سماجی نا انصافیوں کے حوالے بالکل بجا درست ہے۔۔۔''آدھی چادر'' اور اس کے پورے رنگ کا جزوی و تکمیلی تعارف پڑھ کر محسوس ہوا گویا افسانوی مجموعہ پڑھ لیا ہو، ماہیوں میں بھی تنوع کا رنگ ہے۔

''وہی خدا ہے'' خوابوں کی تحلیلِ نفسی پہ محیط مختلف مکاتبِ فکر کے تاثرات و مشاہدات پہ مبنی ہے کچھ لوگ کہتے ہیں خواب تو بس خواب ہوتے ہیں۔۔خوابوں کا کیا بقول خواجہ میر درد خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا مگر ایسا بھی کہتے ہیں کہ خواب کا کوئی نہ کوئی سرا حقیقت سے ضرور جڑا ہوتا ہے اور ذہنی ونفسیاتی عوامل کا دخل کہیں نہ کہیں ضرور رہتا ہے جبکہ خوابوں کے درجات میں سے سچے خواب سرِ فہرست ہوتے ہیں یہ علامہ اقبال کا آفاقی خواب ہی تھا جس کی تابندہ تعبیر ہمیں قائداعظمؒ نے بصورتِ پاکستان عطا فرمائی۔ اور وہ جو کہیں دکھائی نہ دے مگر کائنات کے ہر ذرے سے عیاں ہے۔ بیشک وہی سب کا خدا ہے! ''احسنِ تقویم'' سورۂ الم نشرح (اور ہم نے انسان کو بہترین انداز سے تخلیق کیا) کے قرآنی سیاق و سباق سے منسلک ہے اور پوری نظم کے مختلف مراحل و مدارج مطالعاتی ترفع کے ساتھ تفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ اپنی باوقار روایت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ مجھ نا چیز کے پاس جتنے ادبی رسائل آتے ہیں میں سب سے پہلے ان میں شامل خطوط کا مطالعہ کرتا ہوں مگر ''چہارسو'' میں سب سے پہلے براہِ راست کو دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ موجودہ پرچے میں قرطاس اعزاز نہایت باصلاحیت اور منفرد تخلیق کار ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے نام کر کے گلزار جاوید بھائی نے خوش اور کچھ حیران کر دیا۔ محترمہ کی ایک کتاب ''آدھی چادر'' کے مطالعے کے بعد ان کے متعلق جاننے اور پڑھنے کی جستجو تھی نہ جانے مدیر صاحب کے پاس کون سی جادو کی چھڑی ہے کہ وہ دل (کم سے کم میرے) کی بات جان لیتے ہیں۔ ''براہِ راست'' میں سیدھے اور کچھ ترچھے سوالات کے جوابات محترمہ رضیہ اسماعیل نے اعتماد، تفصیل اور سچائی سے دیے ہیں کسی سوال سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ ڈاکٹر علی اکبر منصور کا بیان جو فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے متعلق ہے اُس سے جزوی طور پر متفق ہوں مگر رضیہ اسماعیل کے متعلق بیان مکمل طور پر متفق ہوں۔

''رضیہ اسماعیل کے ہاں عورت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو آگہی اور درد کے مماثل ہے'' (ص۔۱۲)

''ڈائی مینشن'' کی اصطلاح بھی خوب ہے۔ لڑکیوں کو راستوں میں تنگ کرنے والے لڑکوں کی پٹائی، اخلاص کے ساتھ مستقل بنیادوں پر دکھی انسانیت اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا، حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کے حوالے سے اُن کے خیالات سے اُن کا نظریۂ زندگی کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ مضمون ''درویشی'' ایک بہن کی تحریر حقیقت اور محبت کی عکاس ہے۔ صفیہ صدیقی نے اُن کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ عدیم ہاشمی کی تحریر ''کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے'' مشکل سے ہضم ہونے والی چیز ہے۔ شبنم شکیل مرحومہ نے رضیہ اسماعیل رومانیت سے جدیدیت کی جانب سفر کرنے والی شاعرہ قرار دیا ہے۔ حیدر قریشی صاحب نے ''آدھی چادر'' کی کہانیوں کا سماجی اور سیاسی پس منظر کے ساتھ فکری جائزہ لیا ہے۔ جبکہ محترمہ سلمیٰ اعوان نے اُن کے افسانوں کا فکری جائزہ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا افسانہ ''ہرنام داس'' انہیں اردو ادب میں زندہ رکھے گا۔ عطیہ سکندر علی کا پیش کردہ غزلوں کا انتخاب ہو یا فاری شا کا نظمیہ انتخاب، توجہ حاصل کرتا ہے۔ ''آنر کلنگ'' خصوصاً ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے ''روشنی کا تعاقب'' اہم کہانی ہے جس میں سماجی ہمواریوں، روحانیت اور صوفیانہ خیالات اور انسان کی ظاہری بدصورتی اور باطن کی خوب صورتی کو مہارت سے پیش کیا ہے۔ ''رس رابطے'' میں عبداللہ جاوید، نسیم سحر، آغا گل، ڈاکٹر فیروز عالم اور آصف ثاقب صاحب کے خط بہت اہم ہیں۔ فیروز عالم صاحب نے درست لکھا ہے کہ ''آپ نے چہارسو کے ذریعے ایک چھوٹا سا کنبہ تخلیق کر دیا ہے'' (ص:۱۱۸) جبکہ پروین شیر کا ارشاد ہے کہ:

''تمام ممالک کے ادیبوں کا ایک دوسرے سے تعارف چہارسو کے ذریعے بخوبی ہوتا رہتا ہے۔'' (ص۔۱۱۶)

گلزار جاوید بھائی کا افسانہ ''وہی خدا ہے'' ہلکے پھلکے طنزیہ سے شروع ہو کر گہری سنجیدگی پر ختم ہوتا ہے۔ ''خواب'' سے انسان کے باطن اور جبلت کے مختلف زاویے دکھائے ہیں جبکہ انسانی نفسیاتی الجھنوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ پچھلے شمارے میں شامل افسانہ ''مولانا گاؤدی'' کی تعریف جو مجھ پر واجب تھی قبول کیجیے۔ یوگیندر بہل تشنہ ہر بار کی طرح اس بار بھی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ''دروازے اور کھڑکیاں'' نیم علامتی افسانہ ہے جس میں کہانی کے لیے ذرا مختلف رخ اختیار کیا ہے۔ ''یوگی'' کا کردار تلخیوں کی علامت ہے۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''ریٹائرمنٹ پلان'' روایتوں اور رشتوں سے بے نیاز معاشرے کی خاموش محبت کی کہانی ہے کہانی کا حسن مسلم کرداروں کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ شمیم حنفی صاحب نے وکرم صاحب پر اچھا خاکہ تحریر کیا ہے۔ دیپک کنول نے ''ناصر حسین'' کی خوش قسمتی اور کامیابیوں کی داستان سنائی ہے۔ ''ڈایالیسس'' (حصہ دوم) میں فیروز عالم نے مشکل اور طبی تکنیکی باتوں کو بہت آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ مگر یہ بات ذرا حیران کر گئی کہ:

''ڈایالیسس بالکل تکلیف دہ عمل نہیں'' (ص۔۱۰۰)

ہم نے تو کچھ اور سنا اور دیکھا ہے۔ منظر ایوبی، عبداللہ جاوید، غالب عرفان اور آصف ثاقب کی غزلوں کے اشعار فنی پختگی اور خیال کی ندرت سے مزین ہیں۔ فرح کامران، ملک زادہ جاوید، خورشید انور رضوی، ابراہیم عدیل اور خالد راہی کی غزل کے اشعار میں ایک لیک اور منفرد لہجہ نمایاں ہے۔ ''مصری کی ڈلی'' کیا ہے

صحت مند رہنے کا نسخہ نادر ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد کی نظم ''احسنِ تقویم'' پیش کش اور موضوع کے اعتبار سے زبردست ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

قابلِ احترام گلزار صاحب، آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ رضیہ اسماعیل نمبر عین اپنے وقت پر موصول ہوا۔ آپ کی معرفت ایسی ادبی شخصیات کو جاننے کا موقع ملتا ہے جن سے ہم اب تک محروم تھے۔ رضیہ اسماعیل صاحبہ کی شخصیت، اُن کی ادبی خدمت، اُن کی افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، شاعری اور اُن کی زندگی سے جڑی، بہت دلچسپ باتیں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ''گرینڈ مدر'' کے کردار کی عکاسی بہت خوب کی جس نے اس خاکے کو بے حد دلچسپ بنا دیا۔ عصمت بانو کا اُن پر لکھا مضمون بھی اُن کی شخصیت کے بہت سے پہلو نمایاں کرتا ہے۔ ''آنر کلنگ'' با مقصد اور اچھا افسانہ ہے۔ ''براہِ راست'' حسبِ معمول انفرادیت کا نمائندہ ہے۔ داد دینی پڑے گی آپ کے اس انداز کی کہ ہر بار سوال نئے ہوتے ہیں اور انداز بھی نیا۔

اس بار سبھی افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ انل ٹھکّر صاحب کا افسانہ بے حد دلچسپ لگا۔ افسانہ پڑھ کر اُن سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر بات نہ ہوسکی۔ اسی طرح ''ریٹائرمنٹ پلان'' شہناز خانم عابدی کا افسانہ بھی مختصر اور دلچسپ ہے۔ بہل صاحب کا ''دروازے اور کھڑکیاں'' دل کو چھو گیا۔ ڈاکٹر عشرت ناہید کا ''منزلِ بے نشان'' کا اندازِ بیان بہت پسند آیا۔ گلزار جاوید کا افسانہ ''وہی خدا ہے'' اپنی طرز کا دلچسپ افسانہ ہے۔ آپ کے افسانے ہر بار مختلف انداز کے ہوتے ہیں اسی کو انفرادیت کہتے ہیں۔

تابش صاحب کے ناول اور دیپک کنول کی فلمی ہستی پر لکھے مضمون کا تو ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔ ناول کی قسط پڑھ کر تو جی چاہتا ہے ایک ہی بار میں سارا پڑھ لیا جائے۔ شمیم حنفی صاحب کے وکرم صاحب پر مضمون وکرم صاحب کی ادبی خدمت کا احترام کرتا ہے۔

شعری حصہ حسبِ معمول دلچسپ اور معیاری ہے۔ ایک اور قلعہ کامیابی سے فتح کرنے کے لیے میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں اور دل سے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت یاب رکھے اور آپ اسی طرح ادبی خزانے سے ہمیں مالا مال کرتے رہیں۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

رضیہ اسماعیل بلاشبہ ایک عظیم خاتون ہیں جو وطن سے ہزاروں میل دور رہ کر ذات کے بجائے دوسروں کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں قابلِ تعریف تخلیقات کے حوالے سے ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری خوبصورت، پُر اثر اور عام طور پر بامعنی اور با مقصد ہوتی ہے۔ ان کے افسانے دلچسپ طرزِ بیان، سوچ اور فکر کی گہرائی اور فلسفیانہ موضوعات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ معاشرہ میں عورت کی بے بسی اور دردناک مسائل پر شدتِ احساس کے ساتھ اپنے مشاہدات کا بیان بڑے پُر اثر انداز میں کرتی ہیں۔ آپ نے چہارسو کا شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۷ء ان کے نام منسوب کر کے اور قارئین تک اُن کا قابلِ قدر ادبی کام پہنچا کر بجا طور پر ان کی خدمات کا حق ادا کیا ہے جس پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کے افسانے ''گرینڈ مدر''، ''آنر کلنگ'' اور ''روشنی کا تعاقب'' طنز و مزاح، معاشرتی مسائل اور فلسفیانہ سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''روشنی کا تعاقب'' میں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے یہ نکتہ نمایاں کیا ہے کہ اگر ہمارے جسم میں ایک اندرونی روشنی اور نور بھی ہمیں پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کیے گئے ہیں اگر ہم اپنے اندر کی روشنی نظر انداز کر کے بیرونی روشنی کا پیچھا کریں گے تو زندگی مشکل اور لاحاصل رہے گی جبکہ اپنی اندرونی روشنی جو اللہ کا نور ہے اور ہر دل میں موجود ہے پالیں جو عمل سے ممکن ہے تو ہمیں سکون اور اطمینان کے علاوہ بہت سے پریشان کن مسائل سے خود بخود نجات مل سکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

اسی شمارہ میں بہت اچھے افسانے، شاعری، خاکے اور دیگر مضامین شامل ہیں جن سے شمارہ بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ ''نادیدہ فصیل'' کے عنوان سے انل ٹھکّر نے ایک بہترین افسانہ تحریر کیا ہے جس میں عبرت اور سبق کے ساتھ دل ہلا دینے والی جذباتی کیفیات بار بار قاری کے دل کی دھڑکنوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد کی شاندار ہنستی بستی زندگی محض غیر سنجیدہ گفتگو اور مذہب سے مذاق یا بےتعلقی کے باعث یکا یک برباد ہو گئی جسے اُس نے حسرت اور پشیمانی کے ساتھ اپنی تصنیف ''مذہب اور فلسفہ'' میں بیان کیا۔

''وہی خدا ہے'' میں ایک ایسی کیفیت کا اچھوتے انداز میں منظر نامہ بیان کیا گیا ہے جو ایک انسان کو زمین کی موجود زندگی اور بلندیوں سے اُٹھا کر ایک ایسے روحانی منظر میں پہنچا دیتی ہے جو آدم و حوا کی اولاد کو پھر سے یک جان کر سکتے ہیں، ایک ایسی دنیا میں جہاں وہ ہمیشہ کے لیے محبت، اپنائیت اور اندازِ سپردگی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ جہاں کوئی دھوکا، فریب یا جھوٹ نہیں بلکہ محبت، خوشبو، بانکپن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور جہاں کی رونق اور نور انسان کی آنکھیں چکا چوند کر دیتی ہے۔ البتہ پل بھر کا یہ سفر جہاں پر کوئی اپنی ترنگ میں سبک روی سے چل رہا ہے۔ چلے جا رہا ہے آنکھ کھلتے ہی ختم ہو جاتا ہے اور پلنگ کے سرہانے دیوار پر آویزاں تصویر کے ہنستے مسکراتے سراپے نے جب قدم روک لیے تو تمام یادیں ایک مدہوش کر دینے والی خوشبو کے ساتھ ذہن پر اُبھر آتی ہیں۔ شاید یہی تصویر سارے منظر نامے کا مرکزی خیال تھی۔

''دل کے دریچوں کی مکیں'' کے عنوان سے رینو بہل کا خاکہ آپا جمیلہ شبنم کے حوالے سے ایک ایسی متاثر کن تحریر ہے جسے پڑھ کر دل اُداس ہوا لیکن ساتھ ہی تلخ حقیقت کا عزم و ہمت سے سامنا کرنے اور خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور حالات بدلنے پر دل میں اُن کے لیے عزت و احترام میں

مزید اضافہ ہوا۔ رینو بہل خود بھی ایک درد دل رکھنے والی مخلص شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں دوسروں کے لیے جینے اور لکھنے کا اصول بنا رکھا ہے اور ان کی شفاف محبت اور بامقصد تحریریں دوسروں کو فکر و عمل کا درس بھی دیتی رہتی ہیں۔

نقشبند قمر نقوی بخاری نے اپنے افسانے ''بالجبر'' میں ہم جنس پرستوں کے درمیان شادی، عمل اور مقدمہ اور علیحدگی کے بارے میں تذکرہ فرمایا ہے۔ وہ ایک اچھے انسان اور ادبی شخصیت ہیں اور جس معاشرہ میں وہ آج کل قیام پذیر ہیں وہاں قوم لوط کے پیروکاروں میں باقاعدہ قانونی طور پر ایسی پراگندہ زندگی گزارنے کا حق دے دیا گیا ہے اس لیے وہاں یہ باتیں عام سی لگتی ہیں۔ البتہ ہمارے مشرقی اور اسلامی معاشرہ میں ان باتوں کا تذکرہ کراہت اور نفرت کے ساتھ سنا اور پڑھا جاتا ہے اور گھروں میں بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ایسا تحریری مواد یا رسالہ وغیرہ سامنے رکھنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ بہتر ہوتا اگر وہ اس کے بجائے کسی اور دلچسپ یا پسندیدہ موضوع پر لکھ کر ہمیں مستفید فرماتے۔

یوگیندر بہل تشنہ نے ''دروازے اور کھڑکیاں'' میں کرب کے ساتھ دل کے دروازے اور احساس کی کھڑکیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک بے پناہ محبت کرنے والے اور بلا کسی تعصب ہر کسی کے لیے درد دل رکھنے والے انسان ہیں اور انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اپنے تجربے اور مشاہدہ کی بنا پر حقیقت پر مشتمل ایک داستان ہے جو دل کو بہت متاثر کرتی ہے۔

شاعری میں اچھا کلام شامل کیا گیا ہے جس میں رضیہ اسماعیل کا غزلیہ کلام اور ماہیے۔ غالب عرفان، آصف ثاقب، خورشید انور رضوی اور حافظ محمد احمد کا قطعہ شامل ہیں۔ آپ کی انتھک کوشش اور محنت کا نتیجہ چہارسو کا شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۷ء سامنے موجود ہے جس کے لیے دلی شکریہ قبول فرمایئے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

برادرم، سلام و رحمت۔

تازہ چہارسو رضیہ اسماعیل نمبر آپ اور محترمہ کے کمالات کا عمدہ نمونہ ہے۔ یوں بھی آپ میرے بہت ہی عزیز اور قابل قدر بھائی ہیں۔ یہ جو ۲۷ برسوں سے آپ نے مستقل انہماک کے ساتھ ''چہارسو'' کی پابندی اشاعت کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر شائقین ادب پر اپنی محبت نچھاور کر رہے ہیں یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اردو زبان میں تو کجا میری معلومات کی حد تک کسی اور زبان میں بھی نہیں ملتی۔ اللہ آپ کے عزائم کو استحکام بخشے۔ آمین! شیفتہ کا شعر یاد آتا ہے:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

مشتاق اعظمی (اسنسول، بھارت)

محترم گلزار جاوید، آداب۔

چہارسو ہر دو ماہ کے بعد برابر مل رہا ہے۔ یہ آپ کی نوازش ہے ہم بزرگوں پر جنہیں آپ پاکستان ہندوستان کے علاوہ کئی ملکوں کے رائٹروں کے تحریر کردہ افسانے، مضامین، غزلیں، نظمیں پروس کر ہماری ادبی پیاس بجھاتے ہیں۔

آپ کا تحریر کردہ افسانہ بعنوان ''ٹورنگ ٹاکیز'' ماہنامہ آجکل دہلی اردو میں نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر از حد مسرت ہوئی۔ آپ کی تحریر کی روانی اور تھوڑا سا مزاح بھی پسند آیا۔ افسانے میں بہت سے کردار مثلاً ماسی، بُوا، چاچی، تائی کے رشتوں نے ایک پرانی یادوں کو تازہ کر دیا۔ آج کل کے بچے بھلا کیا جانیں ان رشتوں کو۔ خاکسار کی جانب سے بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ اُمید ہے آئندہ بھی چہارسو کے علاوہ آپ کی شرکت ہندوستان کے مایا ناز رسالوں میں یونہی جاری رہے گی۔

آجکل کے معیار سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔ ادبی دنیا میں اس کا ایک اہم مقام ہے۔ پچھلے دنوں گھر کا سودا سلف لیتے ہوئے پاکستانی نمک کا پیکٹ تھماتے ہوئے دوکان دار نے یوں فرمایا کہ ''لیجیے یہ صاف ستھرا پاکستانی نمک'' تو ایک پرانی یاد دل کے گوشے میں ابھر آئی جس کا ہلکے پھلکے الفاظ میں بعنوان ''یادیں'' نوک قلم پر آ گیا۔ اب دیکھئے کیا گزرے ہے قطرے پہ گوہر ہونے تک۔

امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ، بھارت)

محترمی گلزار جاوید، سلام مسنون۔

نومبر دسمبر ۲۰۱۷ء کا ''چہارسو'' اپنی روایتی علمی و ادبی آن بان کے ساتھ موصول ہوا اور میں آپ کا مشکور ہونے کے ساتھ ساتھ بے ساختہ آپ کے لیے دعائیں نکلیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرستی و سکت عطا کرے تا کہ تادیر تشنگانِ داب کے لیے آپ ساقی گری کا کام انجام دیتے رہیں۔ محترمہ رضیہ اسماعیل صاحبہ بلاشبہ اعلیٰ پایے کی کثیر الجہات ادیبہ ہیں لیکن ''چہارسو'' نے ان کے تخلیقی و ادبی کام کو فزوں تر کر دیا ہے۔ مختلف اہل قلم کن ان کے بارے تحریر کردہ مضامین اور ذاتی آراء اور ''براہِ راست'' کو پڑھنے سے ان کے لاتعداد شخصی اور تخلیقی پہلو اجاگر ہوئے۔ ان تحریروں نے واضح کیا کہ وہ نہ صرف عمدہ ادیبہ ہیں بلکہ ایک حساس دل رکھنے والی مشرقی خاتون بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے فن کو مزید جلا بخشے۔ جناب انل ٹھکر کا ''نادیدہ فصیل''، اور شہناز خانم عابدی صاحبہ کا ''ریٹائرمنٹ پلان'' بڑے عمدہ افسانے ہیں۔ اندرونی خوف اور وسوسوں میں ڈوبی عورت کی کہانی ''منزل بے نشاں'' (ڈاکٹر عشرت ناہید) نہایت مہارت سے تحریر کی گئی ہے۔ آپ جناب کا ہر افسانہ ایک اہم موزوں دامن میں سمیٹے ہوئے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ہر افسانہ اثر انگیزی، زبان و بیان اور تحریری اسلوب میں ملفوف ہو کر پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ''وہی خدا ہے'' بھی یہ تمام خوبیاں سمیٹے ہوئے ایک خوبصورت تحریر ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے ''ڈایالیسس'' بارے مضمون لکھ کر قارئین کو اس بارے بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔ وکرم صاحب از پروفیسر شمیم حنفی اور ہمیشہ کی طرح دیپک کنول صاحب کا ''ناصر حسین'' کے بارے خوبصورت مضمون بہت اچھے لگے۔ حصہ شاعری میں بعض نظمیں اور غزلیں بے حد پسند آئیں۔

نیئر اقبال علوی (لاہور)

...... سہیل عظیم آبادی بنام عاشق ہرگانوی ......

سہیل صاحب نے ادب کی ابدی قدروں پر توجہ دینے کے بجائے اپنے فن کو اپنے وقت کی سیاسی، سماجی اور اصلاحی تحریکوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات، اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں کو اس طرح پیش کرتے رہے جیسے وہ واقعات عام انسانوں کے ساتھ گزرے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں پریم چندر اسکول سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رفیق کار اور پریم چندر کے جانشین تھے۔ وہ پرانی تہذیب کے امین اور بہت ہی نفیس انسان تھے۔ نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ مجھ سے بے حد قریب تھے۔ سہیل صاحب سے میری پہلی ملاقات ۲۔ مئی ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ اسے اتفاق کہیے یا میری ''گوشہ نشینی'' کہ اُس وقت تک بہار سے کسی بھی بڑے ادیب، شاعر سے میری ملاقات نہیں تھی۔ میں اُن دنوں ہندو پاک کے بیشتر چھوٹے بڑے رسائل میں چھپ رہا تھا اس لیے میرے نام سے سبھی واقف تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا تو میں اپنی باری کا منتظر تھا یک کے بعد دیگرے سبھی شعراء پڑھ چکے تو جناب اختر اورینوی اور معین احسن جذبی باقی رہ گئے تھے کہ میرا نام پکارا گیا۔ جب غزل پڑھ کر میں اسٹیج سے اترنے لگا تو سہیل صاحب بولے: آپ اتنے نوجوان ہیں میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا اپنے چھپے ہوئے مضامین سے بھی آپ کم عمر نہیں لگتے۔ اس لیے آپ کو پڑھوانے میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کیونکہ میں آپ کو باریش بزرگ سمجھ رہا تھا۔ میں آپ کی خدمت میں سہیل صاحب کا پہلا خط جو مورخہ ۱۱۔ مئی ۱۹۶۷ء کو ملا تھا کو پیش کر کے خوشی محسوس کررہا ہوں۔ ......ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

پٹنہ، ۹۔ مئی ۱۹۶۷ء

برادرم، سلام ودُعا

آپ کا خط ملا، خوشی ہوئی۔ واقعی میں نے آپ کو اتنا عمر نہیں سمجھا تھا۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ بڑے بڑے کام کرسکیں۔

مجھے نواجوانوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ہر اچھا کام انفرادی ہونے کے باوجود سب کا ہوتا ہے۔ ادب کا بھی یہی حال ہے، میں نے آپ کے کچھ مضامین پڑھے ہیں اور یہ دیکھ کر بطور خاص خوشی ہوئی کہ آپ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہ بڑی بات ہے۔ اسے نبھائیے۔ سنجیدگی مضامین کی قیمت میں اضافہ کرتی ہے اور سنجیدگی سے علاحدگی اس کی قیمت کو کم کردیتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سستی شہرت کے پیچھے نہ دوڑیئے۔ اس کی زندگی کم، بلکہ نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ پوری ایمانداری کے ساتھ کام کرتے جایئے۔ کم لکھئے، لیکن اچھا، کہ لوگ آپ کو بھلا نہ سکیں۔ سستی شہرت کے تمام ذرائع کو اپنے اُوپر حرام کرلیجیے۔ صرف اسی حال میں آپ اچھا کام کرسکیں گے۔ میری اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیے۔ کم سے کم میں نے سدا اسی پر عمل کیا ہے اور ہر نوجوان کو یہی مشورہ دیتا ہوں۔

انٹرویو کا مسئلہ بھی اسی قسم کا نظر آتا ہے۔ میرے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔ میں نے ایک بار ''تیج'' کے نمائندے کو مختصر سا انٹرویو دیا تھا اور جب شائع ہوا تو پچھتایا تھا۔ اس لیے کہ واقعی پڑھنے والوں کو کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ اس لیے اگر اسے چھوڑیئے تو اچھا ہے۔ مجھے ان لوگوں پر رحم آتا ہے جو ادیب بننا چاہتے ہیں اور دوسروں کو انٹرویو دے کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جس طرح مزدور اپنی محبت کے مطابق مزدوری کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح ادیب بھی اپنی تخلیقات کی حیثیت کے مطابق عزت اور زندگی کا مستحق ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ اسی معیار پر جانچیے اور اس کی قیمت مقرر کیجیے۔ (سہیل عظیم آبادی)

قیمت: ۱۵۰ روپے، دستیابی: داراشاعت مصطفائی، لال کنواں، دہلی۔

...... خواب پلکوں میں ......

''وشال کھلّر کا جنم ۱۹۸۰ء میں چنڈی گڑھ میں ہوا۔ آپ نے زراعتی اقتصادیات میں ایم۔ ایس۔ سی، مواصلات عامہ میں ایم۔ اے کی ڈگری اور اردو زبان میں ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ آپ ہندی، پنجابی، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے ہیں۔ آپ نے مرزا غالبؔ اور میر تقی میرؔ جیسے کلاسیکی شعراء سے لے کر باقیؔ اور پروفیسر عزیزؔ پریہار تک کا اثر قبول کیا ہے۔ ''دھند میں اماں'' جس پر ساہتیہ اکادمی کا یُوا پرسکار ۲۰۱۱ء دیا گیا، وشال کھلّر کی اردو تخلیقات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں شاعر نے نئے استعاروں اور نئی ۸۱ میجری کا استعمال کیا ہے جو قارئین کو گہرے طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ''خواب پلکوں میں'' اسی کامیابی کا تسلسل ہے جس میں تشبیہات اور استعارات کا انتخاب کرنے میں وہ نازک روی سے کام لیتے ہیں اور اپنے احساسات کو بخوبی بیان کر کے قاری پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ نوجوان شاعر اردو شاعری کی امید بھی ہے اور تابناک مستقبل بھی۔ ......انوار شریف

قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: انشا پبلی کیشنز، کولکتہ، بھارت۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
عالمی اردو ادب
Alami Urdu Adab
December 2017
عالمی اردو ادب
قطرہ قطرہ زندگی